اردو ڈائجسٹ
لاہور

دسمبر ۱۹۸۶ء
قیمت ۱۲ روپے

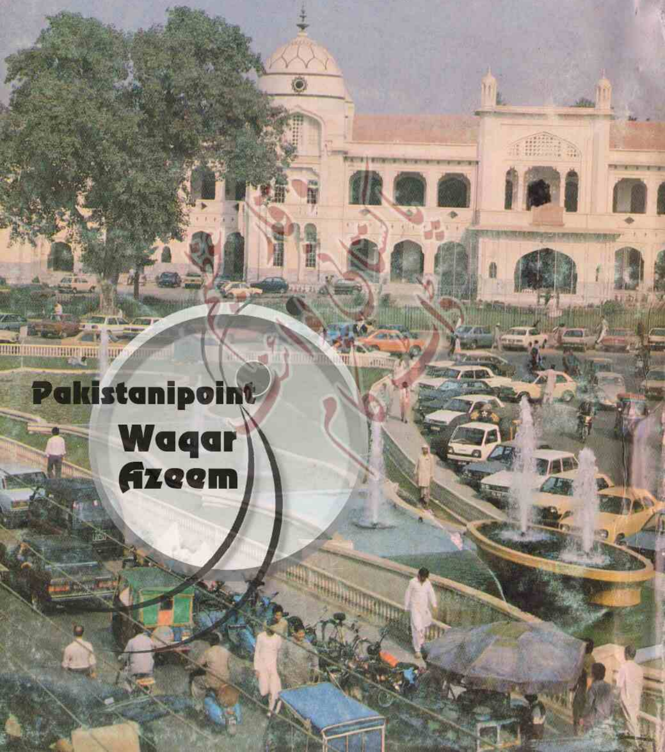

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

اُردو کا سب سے پہلا، ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ

اُردو ڈائجسٹ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ——— مُدیرِ انتظامی

الطاف حسن قریشی ——— مُدیرِ مسئول

ظفراللہ خاں ——— مُدیر

صدر دفتر

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ

۲۱-ایکڑ اسکیم، سمن آباد، لاہور ۲۵ اسلامی جمہوریہ پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۰ فون ۴۱۳۸۰۹

تار کا پتہ: URDIGEST

کراچی آفس

۲/۱۳۳/۵ ماڈل کالونی کراچی۔ فون ۴۰۲۱۳۵

ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ ——— دسمبر ۱۹۸۶ء

جلد ۲۶ ——— شمارہ ۱۲

کچھ اپنی زباں میں

○ خطرات کا حکمت اور ہمت سے مقابلہ کیجیے • طلبہ قوم کی امانت ہیں • ایک حوصلہ مند فیصلہ • ستائیسویں رات • شریعت کی بالادستی • اسمبلیوں میں کورم کا مسئلہ • قومی پریس سے دردمندانہ اپیل ۱۳

ہم کہاں کھڑے ہیں

○ اصل خطرہ کس طرف سے ہے؟ — بڑی طاقتوں کے خفیہ پیغامات آنے والے حالات کی کیا تصویر پیش کرتے ہیں اور ہمارے داخلی عوامل کیا شگنل دے رہے ہیں؟ — الطاف حسن قریشی ۲۱

اِسلامی زندگی

○ قرآنِ عظیم ———— ۱۱

○ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ———— ۱۲

خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بے اختیار ایمان لانے اور آپؐ پر والہانہ جان چھڑکنے والی خاتون جنہیں مسلمانوں کی عظیم ترین ماں ہونے کی سعادت حاصل ہے — حافظ افروغ حسن ۳۷

جم کاربٹ کی شہرۂ آفاق کتاب

○ سلطانہ ڈاکو — جرائم کی دُنیا کا عجیب و غریب کردار جس کی داستانیں افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہیں ———— ترجمہ و تلخیص: جلال الدین احمد صدیقی ۱۳۶

سچی کہانی

○ شوہر گزیدہ — ہمارے ہی معاشرے کی ایک المناک رُوداد ———— بازغہ رؤف ۲۰۹

آپ بیتی

○ چلنا ہی زندگی ہے — قابلِ رشک ناکامیوں اور کامرانیوں کے چند سوانحی اُتالیے — ڈاکٹر محمد فیصل ۱۱۱

تابندہ روایات

○ تکمیلِ وفا — وطنِ عزیز پر جاں نثار کر دینے والے نوجوانوں کی رُوح پرور باتیں — بیگم ممتاز شفیع ۱۲۹

طب و صحت

○ آنکھ — بچّوں کو کون کون سے امراضِ چشم لاحق ہو سکتے ہیں اور اُن کا علاج کیونکر ممکن ہے؟ ان اہم سوالوں کے جواب ڈاکٹر محمد رمضان نے فراہم کیے ہیں ———— ۹۰

○ پاکیزگی ماحول کی — ایک سنگین معاشرتی مسئلہ جسے ہم نظر انداز کیے ہوئے ہیں ———— احمد نواز جیمیہ ۲۱۴

ہٹلر کا فرار

کیا ہٹلر نے خودکشی کی؟ کیا اُس کی لاش واقعی جلا دی گئی؟ نہیں... وہ ایک ڈرامہ تھا — تاریخ کے اس پُراسرار ڈرامے کا پہلی بار سنسنی خیز انکشاف ہوتا ہے ———— ہنری مالٹوڈ کے سکرین پلے سے ماخوذ ۷۹

تازہ ڈسپیچ

○ لندن نامہ — انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کے نئے مسائل اور جواں نسل کے نئے رُجحانات ———— محسنہ جیلانی ۳۳

جرمنی نامہ

○ سکن ہیڈز — فرنگی نوجوانوں کا خطرناک ترین گروہ جو افریشیائی باشندوں کو یورپ بدر کرنے کے درپے ہے — خاص اُردو ڈائجسٹ کے لیے — امجد علی ۱۱۶

بدلا بدلا بلتستان

پاکستان کے حسّاس شمالی علاقوں کا جیتا جاگتا سفر نامہ جو ایک انوکھی اور طلسمی دُنیا سے آشنا کرتا ہے ———— پروفیسر محمد سلیم ۱۷۸

تازہ کہانیاں

○ قرض — سندھ کی موجودہ صُورتِ حال کے پس منظر میں انتہائی خوبصورت کہانی ———— سیّد جاوید اختر ۱۱۳

○ سچّا رشتہ — معاشرتی سراب سے اُبھرنے والی وفا شعاریوں کی انوکھی داستان ———— نگہت فردوس آفندی ۶۹

○ نجومی — اُس شاطر انسان کا تحیّر خیز فسانہ جسے خُود اپنی قسمت کا حال بتانا پڑا ———— آر کے نرائن ۶۴

[illegible]

○ اودے پور کے راجے مہاراجے ———— تحریر: جی ای سی ویکفیلڈ / ترجمہ: فضل قدیر ۱۶۸

[illegible]

○ قلعہ کلیت — وادیٔ کشمیر میں سر بکف مجاہدوں کی بہادری اور عزیمت کے خُوں رنگ واقعات ———— اسماعیل صدیقی کے قلم سے ۱۹۹

[illegible]

○ قرآن کی فریاد — ایک خاتون کے حسّاس دل کے سچّے تاثرات ———— توقیر عائشہ ۱۲۷

روشن چہرے

○ صبرِ جمیل کی کہکشاں — آنکھوں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے مناظر دیکھے جنہوں نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی ———— حافظ افروغ حسن ۱۵۴

[illegible]

○ سلاطین پاشا — یورپ کی پُراسرار انقلابی شخصیت جس کا نام بہت معروف اور کارنامے بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں ———— احمد الدین مارہروی ۱۵۹

ہم اور مَیں

دنیا کا اپنی طرز کا ایک فکر انگیز ناول 'دی انیتھم' جو نظامِ جبر کے خلاف مؤثر احتجاج اور صبر آزما جدّ و جہد سے عبارت ہے ———— آئن ریڈ / تلخیص: نثار طاہر ۲۱۷

شعر و ادب

○ زمستاں — پسندیدہ اشعار ———— ۶۸

قارئین کے خطوط

○ چمنِ خیال — فکر و اظہار کا گلدستہ ———— ۸

تعارف و تبصرۂ کتب

○ ۳۰ پروانے شمعِ رسالت کے • رنگ، خوشبو کا نٹے • پیامی (۳ شمارے) • تحریکِ پاکستان بلوچستان میں • حجابِ نسل ۲۴۱

سرورق

○ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے سامنے چوک نیلا گنبد — عکّاسی: فریدالدین احمد

Pakistanipoint Waqar Azeem

ایڈیٹر کا مُراسلہ نگار کی رائے سے مُتفق ہونا ضروری نہیں۔

جہانِ حال

بھارت کے خطرناک ارادے

بھارت کے خطرناک ارادے، سندھ کارڈ اور تیل وگیس ترقیاتی کارپوریشن پر ادارتی شذرات فکرانگیز بھی تھے اور معلوماتی بھی۔

جناب الطاف حسن قریشی کے قلم سے 'ہم کہاں کھڑے ہیں؟' پڑھ کر پاکستان کی تازہ سیاسی صُورتِ حال کا تجزیاتی مشاہدہ ہُوا۔ 'عالم عالم دُنیا دُنیا' بھی پسند آیا۔ اُمید ہے یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔ (ڈاکٹر طاہر عطا۔ بیمارستان شہید باہنر۔ گچساران، ایران)

✻ نومبر کے شمارے میں آپ کا اداریہ بے حد فکرانگیز ہے۔ محسنہ جیلانی صاحبہ کا 'لندن نامہ' بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ لال قلعے کی ایک جھلک بہترین کاوش ہے۔

(نسرین اختر نینا۔ لاہور)

شامی خواتین کی فریاد

اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والی شامی خواتین پر شام کی جیلوں میں جو مظالم توڑے جارہے ہیں اور اسلام کو پسند کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے جُرم کی جو سزا اُنہیں دی جارہی ہے، اُسے سُن کر رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ شامی اخوان المسلمون کے ترجمان 'النذیر' جنوری ۸۶ء کے مطابق ان خواتین پر کال کوٹھڑیوں میں شب و روز عذاب توڑا جاتا ہے۔ نشے میں دُھت اُن کے 'محافظ' اُنہیں خونخوار کُتّوں کی طرح بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔ کبھی اُن پر کوڑے برسائے جاتے ہیں، کبھی بجلی کے جھٹکے دیے جاتے ہیں حتّٰی کہ وہ دُعا کرتی ہیں کہ اُن پر جیل کی دیواریں گر پڑیں اور وہ اُن کے نیچے دب کر ختم ہو جائیں۔ حکومتِ پاکستان اور ملّتِ اسلامیہ کے ذمّے داروں نے اگر اس ظلم کو نہ روکا تو حشر کے دن وہ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ (اُمِ طلحہ۔ لاہور)

ایک اور اتفاق

نومبر ۸۶ء کے شمارے میں عبدالقادر شاہوانی صاحب کا گوادر پر مضمون خاصا اچھا ہے۔ اہلِ گوادر کا یہ خدشہ کہ وزیر کو ریسٹ ہاؤس میں نہ لے جانا، بالکل دُرست ثابت ہُوا۔ محترم پرنس محی الدین بلوچ واقعی وزارت سے فارغ کر دیے گئے۔

(ظفر احمد۔ فیصل آباد)

خواتین یونیورسٹی کا قیام

پاکستان کی نصف سے زیادہ آبادی خواتین پر مشتمل ہے لیکن اُنہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھنا پڑتا ہے جو کئی لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

اربابِ اختیار سے گزارش ہے کہ وہ خواتین یونیورسٹی کے قیام پر فوری توجّہ دیں اور اُس کی تعمیر کے لیے رقم مختص کریں تاکہ اس کی عملی شکل سامنے آسکے۔ (حمیرا جبیں۔ اُردو سائنس کالج، کراچی)

فیصلے جو ہوتے ہوتے رہ گئے

نومبر ۸۶ء میں آپ نے بجا لکھا ہے کہ "مسلم لیگ کو حکومت کی لونڈی بنانے کے بجائے اُسے آزاد سیاسی جماعت کی حیثیت دی جائے۔ ماضی میں بھی سارا فساد اُس وقت پھیلا جب اُس کی صدارت کے مناصب وزیرِ اعظم اور وزرائے اعلیٰ کے حوالے کر دیے گئے"۔۔۔ ذی شعور طبقہ آپ سے متّفق ہے کہ مسلم لیگ کی وفاقی اور صوبائی صدارتیں با اثر، مخلص اور محبِ وطن افراد کو سونپ دی جائیں۔

آپ کی یہ تجویز بھی نہایت معقول ہے کہ "بدعنوان وزیروں اور افسروں کو نکال دینے سے موجودہ سیاسی نظام مضبوط ہوگا" بلکہ عوام سُکھ کا سانس لیں گے۔ قانون سے تجاوز کرنے والوں کا محاسبہ ازبس ضروری ہے۔ (شجاع ملک۔ ملتان)

بحضورِ دانائے سُبُل

حافظ افروغ حسن کا مضمون 'خاتم النبییّنؐ کی تاریخ ساز پیشگوئیاں' انتہائی دلچسپ، تحقیقی اور معیاری کاوش ہے۔ اس میں عقیدت و محبت کا اظہار منفرد انداز میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ شعرائے کرام نے بارگاہِ نبویؐ میں جو عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں، اُنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

(خالد محمود بھوترال۔ راولپنڈی)

تعلیمی اداروں کے داخلے

اس مرتبہ لاہور کے بعض کالجوں میں ۸۵ء اور ۸۶ء کے فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن والے طلبہ تو داخل کر لیے گئے مگر ۸۴ء کے ایسے ہی طلبہ داخلے سے محروم رہے جنہوں نے امتحان میں فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن حاصل کی تھی۔ پھر ستم یہ کہ ۱۹۸۴ء کے اُن اُمیدواروں کو تو داخلہ مل گیا جنہوں نے ایک یا زیادہ مضامین میں ناکام رہ کر ۸۵ء یا ۸۶ء کے سپلیمنٹری امتحانات میں کامیابی حاصل کی لیکن وہ طلبہ جو ۸۴ء ہی میں سارے مضامین پاس کر چکے تھے اور اُس وقت کسی مجبوری کی بنا پر داخلہ نہ لے سکے تھے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے حق سے محروم رکھے گئے ہیں۔ اس زیادتی کا فوری ازالہ ہونا چاہیے تاکہ اُن کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ (اعجاز اختر۔ لاہور)

✻ فیصل آباد کے گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ اور گورنمنٹ گرلز کالج مدینہ ٹاؤن میں تحریری امتحان میں اچھے نمبر لینے والے طلبہ وطالبات کو داخلہ نہیں دیا گیا بلکہ کم نمبر حاصل کرنے والوں کو انٹرویو میں زیادہ نمبر دے کر میرٹ لسٹ بنائی گئی۔ ریکارڈ میں دیکھا جا سکتا ہے کہ صوبائی حکومت کی داخلہ پالیسی کا کس طرح مذاق اُڑایا گیا ہے۔ (راجہ ضیا احمد۔ پیپلز کالونی، فیصل آباد)

انڈونیشیا میں یومِ اقبال

علّامہ اقبالؒ پاکستانی قومی شاعر ہی نہیں بلکہ بلاشُبہ وہ حکیم ملّت ہیں۔ اُن کا کلام بلبلِ نیل اُمِ کلثوم نے گایا۔ کلامِ اقبالؒ کا ترجمہ یوگوسلاویہ کی مقامی زبانوں میں ہُوا اور جاپانی میں بھی موجود ہے۔ گزشتہ دنوں انڈونیشی نوجوانوں میں شاعرِ مشرق کی مقبولیت کا مظاہرہ دیکھا۔ اسمٰعیل مرزو کی ہال جکارتہ میں 'یُوتھ اسلامک سٹڈی کلب الاظہر' کے زیرِ اہتمام ایک مذاکرہ منعقد ہُوا۔ اس میں انڈونیشیا کے مشہور شعرا جناب توفیق اسمٰعیل اور جناب حمید جبار، یونیورسٹی آف گاجا ماڈا ینگ میگارتا کے مسٹر عبدالحدی، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جکارتہ کے جناب فخر علی اور خاصی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

اس مذاکرے کے مہمانِ خصوصی سفیرِ پاکستان جناب ایس ایم قریشی تھے۔ مختلف انڈونیشی شاعروں اور ارکانِ تنظیم نے بہاسا انڈونیشیا میں علّامہ اقبالؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں سفیرِ پاکستان نے فکرِ اقبال پر ایک خیال افروز تقریر کی۔ اُنہوں نے انکشاف کیا کہ اقبالؒ کی دس کتابوں کا بہاسا انڈونیشیا میں ترجمہ ہو رہا ہے جن میں سے سات فارسی کی ہیں اور باقی اُردو کی۔ مذاکرہ نمازِ ظہر اور کھانے کا وقفہ چھوڑ کر چھ گھنٹے جاری رہا۔ انڈونیشی نوجوان اور دیگر سامعین کامل انہماک اور شوق سے تقاریر سُنتے رہے۔ (وقار کلیم نمائندہ اُردو ڈائجسٹ۔ جکارتہ)

دُکھی دلوں کی آواز

یہاں ہمارے ساتھ کچھ فلسطینی بھی کام کرتے ہیں۔ ایک دن سعودی افسر نے ایک فلسطینی کی بہت بے عزّتی کی۔ مَیں نے اُس فلسطینی سے کہا کہ اگر تمہاری جگہ مَیں ہوتا تو اس نوکری پر لات مارتا اور پاکستان واپس چلا جاتا۔ یہ سُن کر وہ رونے لگا کہ تم تو پاکستان جا سکتے ہو کہ تمہارا وہاں گھر ہے، مَیں کونسے ملک جاؤں بچّوں کو لے کر؟ میرا کوئی ملک نہیں، کوئی گھر نہیں میرے

پاس کوئی پاسپورٹ نہیں۔ اب تو اسرائیل بھی نہیں گھسنے دیتا ہم کو ہمارے اپنے گھروں میں۔ اُس نے یہ ساری باتیں کچھ اس غم زدہ انداز میں کہیں کہ مَیں سُن کر سُن ہو گیا۔

مَیں خدا کا شکر بجا لایا کہ اُس نے مجھے ایک ملک اور ایک نام دیا۔ مَیں ہر کہیں فخر سے کہہ سکتا ہُوں کہ مَیں پاکستانی ہُوں۔ بیرونِ وطن ہر پاکستانی یہی سوچتا ہے لیکن پاکستان کے اندر ایک بریگیڈیئر عاطف ہے جسے وطنِ عزیز کی قدر و قیمت اور عزت کا کوئی احساس نہیں۔ اس شخص نے جوڑ توڑ سے اپنی جھوٹی انا کی خاطر ہاکی کے میدان میں پاکستان کو ہروا دیا۔ صدرِ مملکت سے درخواست ہے کہ اسے ہاکی فیڈریشن سے فوری طور پر الگ کیا جائے۔ (حمید اللہ ہاشمی۔ تبوک، سعودی عرب)

اختیارات کی آمریت

گزشتہ دنوں ہمارے ایک وزیر با تدبیر نے فرمایا کہ بہت جلد پنچایت اور جیوری سسٹم رائج کیا جائے گا تاکہ لوگوں کے گھر تک سستا انصاف پہنچایا جا سکے۔ یہ تجویز ہے تو لائقِ تحسین لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسے عملی جامہ پہنانے میں کہاں تک کامیابی یا ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انصاف کوئی ایسی شے نہیں جسے ارزانی اور گرانی کے ترازو میں تولا جائے۔ پھر انصاف کرنے کے لیے جو قوانین و قواعد بنائے جاتے ہیں وہ بذاتِ خود بُرے نہیں ہوتے بلکہ جن لوگوں کے ذریعے جاری و ساری کیے جاتے ہیں، وہی اکثر و بیشتر خیر میں شر کی آمیزش کر دیتے ہیں اور قانونی اختیار کو ذاتی استحقاق بنا کر ناجائز اور آمرانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ اَن پڑھ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگ بھی جب کسی گھریلو ٹریبونل میں انصاف کرنے بیٹھتے ہیں تو تعصب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ اُس وقت اُنہیں خوفِ خدا ہوتا ہے نہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلوں کا خیال اور نہ وہ جمہور کے سامنے کیے گئے زبانی یا تحریری قول و قرار کا احترام کرتے ہیں۔ ذاتی مفادات کے ان اسیروں کے سامنے سب سے بڑا اصُول یہ ہے کہ کوئی اصُول نہیں۔

جناب! اگر آپ کو عدل اور انصاف کرانا ہے تو پہلے برادری ازم ختم کیجیے۔ ورنہ شہروں اور دیہات میں تھوڑی بہت محبت و اخوت کی جو اقدار باقی ہیں، وہ اس عفریت کے تعصب کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ انصاف کرنا سچ کہنے کا دوسرا نام ہے اور سچ کہنے کے لیے ضروری ہے کہ سچ سُننے والا بھی ہو۔ اگر یہ دونوں نہیں ہوں گے تو عدل و انصاف پنپ نہیں سکیں گے۔ عدل و انصاف کے لیے ایک ایسا معاشرہ ضروری ہے جہاں انصاف دینے والا اور لینے والا ہر دو غیر متعصب اور بے غرض ہوں ورنہ شہید اور قاتل کی تاریخ وفات ایک ہی مصرع سے نکلے گی۔

خدارا! پاکستان کو تجربہ گاہ نہ بنائیے۔ سابقہ تجربوں اور موجودہ عدالتوں ہی سے استفادہ کیجیے اور اگر کچھ کرنا ہے تو انصاف پسندوں کا وقار بلند کیجیے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان پر اعتماد اور اعتبار کر سکیں۔ اور اگر نظام میں تبدیلی لانی ہے تو ہوس پرستوں کی جگہ خدا پرستوں کو بٹھا دیجیے۔ پھر عدل و انصاف بھی ہوگا اور اس کا ہوتا ہم سب محسوس بھی کریں گے اور اختیارات کی آمریت کبھی جنم نہیں لے سکے گی۔ (ریاض احمد قصوری ممبر پنجاب بار کونسل، قصور)

نفاذِ شریعت سے گریز!

۱۸ ر نومبر کو اسلام آباد میں شریعت بل کے حق میں مظاہرے کے لیے جانے والے قافلوں کو حکومت نے جگہ جگہ روک کر انتہائی بے تدبیری کا ثبوت دیا۔ جامعہ اشرفیہ لاہور جیسی عظیم دینی درسگاہ کو پولیس نے گھیرے میں لے کر بے شمار بسوں کو حرکت نہ کرنے دی۔ اسی طرح اسلام آباد جانے والے مختلف راستوں پر رُکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ بے نظیر کے جلوس میں شرکت کرنے والوں کو تو ملک بھر سے لاہور اکٹھے ہونے کی کھُلی اجازت ملتی ہے اور جگہ جگہ اُس کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن شریعت کے عملی نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کی راہ میں رُکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ اس سے حکومت کے نفاذِ اسلام کے دعووں کا بھرم کھُل جاتا ہے۔ (خلیل الرحمٰن۔ چاہ دودھ ہٹہ، لاہور)

فرقانِ عظیم

پس نہیں، مَیں قسم کھاتا ہُوں اُن چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور اُن کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے، یہ ایک رسُولِ کریمؐ کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ اللہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہُوا ہے۔ اور اگر اس نبی نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسُوب کی ہوتی تو ہم اِس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اِس کی رگِ جان کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی ہمیں اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔ درحقیقت یہ تو پرہیز گار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تُم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ مُوجبِ حسرت ہے۔ اور یہ بالکل یقینی حق ہے۔ پس اے نبیؐ، اپنے ربّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

(سُورہ حاقہ — آیت ۳۸ تا ۵۲)

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خُدا کی طرف سے ہے جو عُروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور رُوح اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس اے نبیؐ صبر کرو، شائستہ صبر، یہ لوگ اُسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ وہ عذاب اُس روز ہوگا جس روز آسمان پگھلی ہُوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دُھنکے ہُوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پُوچھے گا حالانکہ وہ ایک دُوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ (سُورۂ معارج آیت ۱ تا ۱۰)

فرمانِ رسُولؐ

- جب خُدا کسی بندے کی بہتری چاہتا ہے تو اُس میں بے نیازی اور تقویٰ پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی بندے کی خرابی مقصُود ہو تو ہر وقت اُسے فقر و تنگدستی کا دھڑکا لگا دیتا ہے۔
- جب خُدائے کریم کو کسی قوم کی برتری منظور ہوتی ہے تو اُس میں سمجھ دار لوگوں کی کثرت اور جاہلوں کی قلّت ہو جاتی ہے۔ جب سمجھ دار فقیہہ اُن سے کچھ کہتا ہے تو وہ اُن کی ہم نوائی کرتی ہے اور جاہل کوئی بات کہتا ہے تو وہ اُسے مسترد کر دیتی ہے۔ لیکن جب خُدا کسی قوم کی بُرائی چاہتا ہے تو اُس میں داناؤں کی کمی اور جاہلوں کی بہتات کر دیتا ہے۔ دانا اُس میں ذلیل اور جاہل اُس میں جلیل سمجھے جانے لگتے ہیں۔
- جب تک کسی شخص میں یہ تین صفتیں موجُود نہ ہوں، اُس سے کسی قسم کی توقّع فضُول ہے۔ وہ صفتیں یہ ہیں: (۱) حیا (۲) امانت داری (۳) سچائی۔
- اگر تم سے کوئی بُرا کام سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو۔ اگر گُناہ مخفی ہو تو توبہ بھی مخفی ہو گی اور اگر خطا علانیہ ہے تو توبہ بھی ویسی ہی ہو گی یعنی علانیہ۔
- جو شخص اپنی دو بیویوں کے درمیان انصاف قائم نہ رکھ سکے، وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اُس کے جسم کا ایک حصّہ اُس سے جُدا ہو گا۔
- جب کسی مومن کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو ربّ العالمین ملک الموت سے دریافت کرتا ہے کیا تُو نے میرے بندے کے بیٹے کی رُوح قبض کی؟ وہ کہتا ہے: "ہاں۔" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے نے کیا کہا؟ ملک الموت جواب دیتا ہے کہ اُس نے تیری حمد کی اور اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون کہا۔ اُس وقت حکمِ الٰہی ہوتا ہے کہ میرے اس بندے کے لیے جنّت میں مکان بناؤ اور اُس مکان کو بیتِ حمد سے یاد کرو۔
- جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اپنے خُدا سے سات بار استخارہ کرو۔ پھر اپنے دل کو ٹٹولو کہ وہ کیا کہتا ہے اور کدھر جاتا ہے پس وہی کرو جو دل کہتا ہے کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔
- اگر تم میں چار چیزیں ہوں تو پھر کسی اور چیز کے نہ ہونے پر غمگین نہ ہو: (۱) راست بازی (۲) امانت داری (۳) حُسنِ خُلق (۴) رزقِ حلال۔

(ماخُوذ از نہجُ الفصاحت)

خطرات کا حکمت اور ہمّت سے مقابلہ کیجیے

ہماری سرحدوں پر خطرات منڈلا رہے ہیں۔ قریبًا قریبًا سبھی سیاسی جماعتیں تشویش اور اضطراب کا اظہار کر رہی ہیں۔ حکومت کے ترجمان بھی سنگین صُورتِ حال پر کڑی نگاہ رکھنے کے بیانات دیتے رہتے ہیں۔ صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم قوم کو اس امر کا بار بار یقین دلا چکے ہیں کہ ہماری مسلح افواج وطن کا دفاع کرنے کی پُوری پُوری صلاحیت رکھتی ہیں۔

اضطراب و تشویش کے اظہار میں سیاسی جماعتوں کا ایک آواز ہو جانا ایک سیاسی معجزے سے کسی طرح کم نہیں۔ اس اجتماعی اظہار نے جہاں ایک طرف قوم کو حوصلہ دیا ہے کہ سیاسی زعما ایک بہت بڑے مسئلے پر یکساں سوچ رکھتے ہیں، وہاں اُسے ایک خوفناک چیلنج کا بھی احساس دلایا ہے۔ عوام یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت نے اُمنڈتے ہُوئے خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کیا حکمتِ عملی وضع کی ہے۔

ہمارے وزیرِ خارجہ نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہُوئے کہا کہ ہم وقت آنے پر اہلِ وطن کو ہر بات بتا دیں گے۔ اس نوع کے بیانات سے یہ تأثر اُبھرتا ہے کہ حکومت خطرات کا مقابلہ تن تنہا کرنا چاہتی ہے اور عوام کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اگر یہ تأثر ایک حقیقت بھی ہے تو اس کے پھیلنے سے بہت بُرے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ امر تو ایک حد تک قابلِ فہم ہے کہ اربابِ حکومت اہلِ وطن میں جنگی جنون یا خوف و ہراس اُبھارنے سے گریزاں ہیں اور سنگین حالات کو بھی کچھ اس انداز میں پیش کر رہے ہیں کہ قوم نفسیاتی طور پر مضمحل نہ ہو جائے۔ یہ احتیاط اپنی جگہ دُرست ہی سہی مگر اب تو ذرائع ابلاغ نے فاصلے سمیٹ دیے ہیں اور بھارت میں پاکستان کے خلاف جو کچھ پک رہا ہے وہ ٹی وی کے ذریعے لاکھوں پاکستانی

بہ چشمِ خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ بھیانک حقیقتیں طوفان کی طرح ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں اور ہمارے حکمران محض مژدوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔

اس نازک مرحلے پر حکومت کے لیے مناسب یہ ہو گا کہ وہ تسلسل سے قوم کو صحیح صحیح حالات سے آگاہ بھی کرتی رہے اور اُسے جارحیت کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لیے ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر سائنٹیفک انداز میں تیار بھی کرے۔ شہریوں کو ہوائی حملوں سے بچاؤ اور فرسٹ ایڈ کی تربیت دی جائے، محلّوں میں بھائی چارے کو فروغ دینے اور رضا کارانہ طور پر خدمات بجا لانے کے لیے نوجوانوں کی تنظیمیں قائم کی جائیں۔ عسکری تربیت کا بھی کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جو عوام کے اندر ہیجان پیدا کرنے کے بجائے اُن میں اعتماد اُبھارنے کا باعث بنے۔

مسلح افواج اور شہریوں کے مابین تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کی سبیل نکلنی چاہیے۔ بدقسمتی سے مارشل لا حکومت کے زمانے میں ان روابط میں کچھ خلل پڑ گیا تھا۔ حکیمانہ طریقوں سے قربتیں بڑھائی جا سکتی ہیں اور باہمی اعتماد کا رشتہ مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام فطری انداز میں ہونا چاہیے اور تعلقاتِ عامّہ کے ماہرین اس میدان میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ شہریوں کو فوج سے قریب لانے کا سب سے مؤثر راستہ یہ ہو گا کہ فوجی تنظیم اور جدید ترین اسلحے کے بارے میں عوام کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔ جریدہ 'ہلال' جو آئی ایس پی آر کی طرف سے شائع ہوتا ہے، ان دنوں بہت اعلیٰ خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ڈیفنس جرنل جو کراچی سے شائع ہوتا ہے، اچھے عسکری تجزیے شائع کرتا ہے ـــــ لیکن عوام ہنوز بہت پیاسے ہیں اور اُس تنظیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتے رہنا چاہتے ہیں جس پر دفاعِ پاکستان کی اوّلین ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔

وطن کے مؤثر دفاع کے لیے سیاسی جماعتوں کا تعاون ازبس ضروری ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں، دینی تنظیموں اور دانشوروں کے حلقوں سے یہ آواز اُٹھنی چاہیے کہ ہم جارحیت کا متّحد ہو کر مقابلہ کریں گے اور اپنے وطن کے ایک ایک چپّے کی حفاظت میں لڑیں گے۔ جناب سردار شیرباز خاں مزاری نے یہ دلکشا بیان دیا ہے کہ ہم مُلکی سلامتی کے لیے حکومت کے ساتھ سارے اختلافات ختم کر کے تعاون کے لیے تیّار ہیں۔ یہ بیان صحت مند اور طاقتور ہے۔ اس ایک آواز سے سیاسی مزاج میں اچھی تبدیلی کی توقّع کی جا سکتی ہے۔

ہم اپنے سیاسی قائدین اور وزرائے کرام کو یہ مشورہ بھی دیں گے کہ محض شعلہ بار تقریروں سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے اعمال کو ہمارے الفاظ کی شہادت دینی چاہیے۔ وطن کی حفاظت کے جو تقاضے ہیں اُنہیں پُورا کرنے کے لیے ہمیں نظر آنے والا ایثار کرنا ہو گا۔ ہماری مغربی سرحدوں پر دُشمن کی بمباری سے پاکستانی شہری شہید اور زخمی ہو رہے

ہیں اور ہم اُنہیں دُور سے بیٹھ کر صبر و استقامت اور ہمّت و عزیمت کی تلقین کیے جا رہے ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیاں اور مکانات منہدم ہو رہے ہیں اور ہم ذاتی اور گروہی مفادات کے محل بنا رہے ہیں۔ یہ تضاد قوم کے اندر حقیقی وحدت اور اعتماد کی رُوح پھونک نہیں سکتا۔ اُونچے طبقے کا ایثار ایک عظیم تحریک اور ایک بڑے عزم کو جنم دے سکتا ہے۔ ایک ساتھ جینے کی تحریک اور ایک ساتھ آگے بڑھنے کا عزم ـــــ یہ دو عظیم قوتیں بھارت کو ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیں گی۔

طلبہ قوم کی امانت ہیں

ہماری تعلیمی پالیسی بار بار بدلتی رہی جس کے نتیجے میں پُورا تعلیمی نظام اور درس گاہیں شدید انتشار اور خلفشار کا شکار ہو گئیں۔ اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی ٹُوٹ پھوٹ سے طلبہ کے اندر والدین، اساتذہ اور معاشرے کی طرف سے عدمِ توجّہی کا بے پناہ احساس اُبھرا اور مالی مشکلات اور تاریک مستقبل نے اُنہیں لامحدود فرسٹریشن سے دوچار کر دیا۔ اُن کی فرسٹریشن سے منفی رُجحانات رکھنے والی سیاسی جماعتوں اور غیر ملکی نظریات سے وابستہ شخصیتوں نے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا اور درس گاہوں کو اسلحہ خانوں میں تبدیل کر دیا۔

خوش قسمتی سے طلبہ میں صحت مند تنظیمیں بھی کام کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے منفی قوّتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پاکستان اور اسلام کے ساتھ گہری محبّت کا پیغام دیا۔ حکومت نے طلبہ یونینوں اور تنظیموں پر پابندی عاید کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان دُشمن قوّتیں تو پہلے ہی کی طرح طلبہ میں درپردہ سرگرم رہیں لیکن صحت مند عناصر کے راستے میں بہت سی مُشکلات پیدا ہو گئیں۔ پھر یہ بھی ہُوا کہ صوبائی حکومتوں نے اپنے مفادات میں یا بیوروکریسی کی سازش کے نتیجے میں اُن طلبہ پر ظُلم اور تشدّد روا رکھا جو پاکستان کی حفاظت کو اپنا مقدّس فرض سمجھتے ہیں۔ حکومت کی مشینری نے بعض اوقات غلط عناصر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسلحہ بھی فراہم کیا۔ اس نئی صورتِ حال نے تعلیمی اداروں میں تصادم کا سلسلہ بہت وسیع کر دیا۔ اب پاکستان کی شاید ہی کوئی یونیورسٹی ایسی ہو جس میں تصادم کی آگ نہ بھڑک اُٹھی ہو اور وہاں خُون بہہ نہ چکا ہو۔

طلبہ اور تعلیمی ادارے کسی قوم کی توانائی، ذہنی اُمنگ اور تعلیم یافتہ افرادی قُوّت کے ذخائر ہوتے ہیں۔ ایک نسل تیّار ہوتی ہے اور نئے خیالات اور اُمنگوں کے ساتھ قومی امور میں حصّہ لیتی ہے۔ انہی اداروں سے اہلِ علم و فضل پیدا ہوتے ہیں اور قوم کی ترقّی اور علمی برتری کی راہیں کھولتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ایک نسل

کو ذہنی افلاس اور معاشرتی بدنظمی کے سوا کچھ نہ دے سکے۔ تعلیمی اداروں میں یقیناً بے حساب اضافہ ہُوا ہے۔ علم اور سائنس کی روشنی بھی پھیلی ہے لیکن انسانی رویّوں میں اعتدال، توازن اور وقار کم ہی پیدا ہُوا ہے۔

ناخواندگی اور جہالت کے خلاف جہاد بے حد ضروری ہے مگر اس سے کہیں زیادہ ضروری موجودہ تعلیمی اداروں کا استحکام اور طلبہ کی ذہنی آسودگی اور بہبود ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دفاع کے بعد طلبہ اور نوجوانوں کے اُمور اوّلین ترجیحات کے مستحق ہیں۔ نوجوان بےراہرو یا اپنے مستقبل سے مایوس ہو گئے یا دوسرے کا خُون بہانے پر تُل گئے تو پاکستان کا وجود سخت آزمائش سے دو چار ہو جائے گا۔

طلبہ یُونینوں کے خاتمے سے وہ نظام ہی ٹُوٹ گیا جس کے ذریعے طلبہ کے مطالبات اور احساسات اپنا اظہار کیا کرتے تھے۔ اب یونیورسٹی اور کالجوں کی ایڈمنسٹریشن بے لگام ہو گئی ہے اور طالب علموں کے جذبات کو کچل دینے میں ایک فخر محسوس کرتی ہے۔ اس رویّے سے طلبہ میں بے چینی بڑھ گئی ہے اور وہ پُورے معاشرے کے خلاف بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

ہماری رائے میں حکومت کو سب سے پہلے طلبہ یونینوں کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ماضی میں کچھ طلبہ یونینوں کا وجود امنِ عامّہ اور تعلیمی زندگی کے لیے ایک خطرہ بن گیا تھا لیکن چند غیر ذمّے دار عناصر کی سزا پُوری طلبہ برادری کو دینا انصاف کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ جمہوری قدروں کے فروغ اور طلبہ میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور ایڈمنسٹریشن اور طلبہ کے درمیان ایک معروف رابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی نظام تو وضع کرنا ہی چاہیے۔ اس معاملے میں جس قدر تاخیر ہوگی اُسی قدر طلبہ کے مسائل پیچیدہ ہوتے چلے جائیں گے۔ والدین اور طلبہ کے غیرسرکاری نمائندوں کے ساتھ مشاورت کے ذریعے کوئی قابلِ عمل فارمولا طے کیا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مفاہمت کی راہ ضرور نکل آئے گی۔

تمام طلبہ تنظیموں کے ساتھ حکومت ایک جیسا رویّہ اختیار کرنا چاہتی ہے؛ حالانکہ پاکستان کے خلاف سرگرم تنظیموں کی قانونی اور انتظامی طور پر حوصلہ شکنی ہونی چاہیے اور پاکستان سے محبت کرنے والی تنظیموں کی طاقت میں اضافے کی تدبیر کرنا وطن کے مفاد میں ہو گا۔ انتظامیہ نیکی اور بدی دونوں ہی کو قابلِ تعزیر سمجھتی ہے اور دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ قانون شکن عناصر سے چشم پوشی اب اُن کی پالیسی کا سب سے اہم جزو بن گیا ہے۔ وہ حکومت جو پاکستان کے دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر سکتی، اُسے عوام کا حقیقی اعتماد کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

طلبہ طاقت کے بجائے محبّت سے تسخیر کیے جا سکتے ہیں۔ اساتذہ اُن کے مسائل

میں دلچسپی لیں، اُن کے دُکھوں میں شریک ہوں اور تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اُن کی جائز خواہشات کا احترام کرے اور وافر تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے پر خصُوصی توجہ دے تو اس برادری کا بہت بڑا طبقہ مثبت ردِّعمل ظاہر کرے گا۔

تعلیمی اداروں میں کچھ ایسے عناصر ضرور ہیں جن کی سیاسی وابستگیاں بھی ہیں اور غیر مُلکی وسائل بھی اُنہیں میسّر ہیں۔ اُن کے ساتھ کوئی رُو رعایت نہ برتی جائے۔ وہ طلبہ جن کے کمروں سے ناجائز اسلحہ برآمد ہو، اُنہیں قانون کے شکنجے میں کس دیا جائے۔ پچھلے دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں ایک طالب علم کے کمرے پر پولیس نے چھاپہ مارا اور وہاں سے اسلحہ برآمد ہُوا۔ وہ طالب علم اُن دنوں حکومت کے چہیتوں میں شامل تھا؛ چنانچہ سیاسی اثر و نفوذ کے ذریعے اُس طالب علم کو قانون کے ہاتھ سے چھُڑا لیا گیا اور وہ پولیس انسپکٹر معطّل کر دیا گیا جس نے ہوسٹل پر چھاپہ مارا تھا۔ اس نوع کی جانب داری حالات میں پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ طلبہ کے تمام صحت مند عناصر اس امر پر یقینی طور پر متفق ہو جائیں گے کہ حکومت اُن طلبہ کے خلاف بھرپُور ایکشن لے جو اسلحہ استعمال کرتے ہیں اور اداروں میں خُون خرابے کا باعث بنتے ہیں۔

صدر ایّوب خاں کے زمانے میں طلبہ کے اضطراب کا سُراغ لگانے کے لیے جسٹس حمود الرحمٰن کمیشن قائم ہُوا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ آج بھی گہرے غوروفکر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اربابِ حکومت کو رپورٹ کے مطالعے اور اُس کے قابلِ عمل نکات کو عملی جامہ پہنانے کا وقت میسّر آ جائے گا۔

تعلیمی اداروں کا ماحول پُرسکون بنانے میں حکومت کو غیر معمولی تدبّر اور محنت سے کام کرنا ہو گا۔ کامل غیر جانب داری، مستحکم فیصلے، مضبوط ہاتھ اور مُلکی مفادات پر سیاسی اغراض قربان کر دینے کی حکمتِ عملی بِکھرے ہُوئے حالات کو معمول پر لا سکتی ہے۔ یہ بات بڑی تشویش ناک ہے کہ قانون شکن عناصر بےخوف ہوتے جا رہے ہیں اور انسانی خُون بہت ارزاں ہو گیا ہے۔ پولیس شاید اس نئی صُورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیّار نہیں۔ آج ہی وزیرِاعظم کو سیاست اور حکومت کی سطح پر کوئی بڑا فیصلہ کرنا چاہیے ورنہ بیروت کی خانہ جنگی کے مناظر ہمارے ہاں بھی عام ہو جائیں گے۔

ایک حوصلہ مند فیصلہ

وزیرِاعظم پاکستان نے پہلے اپنی کابینہ کے ایک وزیر سے قلمدانِ وزارت واپس لیا اور اُن کی سفارش پر چند روز بعد صدرِ مملکت نے اُس وزیر کو کابینہ سے برطرف کر دیا۔ خبروں کے انداز سے یہ تأثّر ملتا ہے کہ یہ سخت قدم، بدعنوانیوں کا سُراغ ملنے اور اُن کا ثبوت مل جانے کے بعد، اُٹھایا گیا تھا۔ ہم وزیرِاعظم کے اس فیصلے کو بڑی

اہمیّت دیتے ہیں۔ اُنھوں نے بدعنوانی کے خلاف ایک مضبوط اقدام کر کے سیاسی عزم اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اپنی حکومت اور انتظامیہ کو جتنی جلد ان آکاس بیلوں اور جنگلی جڑی بُوٹیوں سے صاف کر دیں گے، اُتنی ہی جلد اُن کی سیاسی قوّت اور دیانت کا اعتبار قائم ہو گا۔ اُن کے اس عمل پر بہت سے لوگوں کی یہ شکایت بھی دُور ہو جائے گی کہ بجلی صرف چھوٹے لوگوں ہی پر گرتی ہے۔

اُصولی طور پر اس امر کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بدعنوان افسر یا سیاسی افراد قوم کو لُوٹ کر بعد میں ایک طرف ہو جاتے ہیں اور جمع شُدہ دولت پر دادِ عیش دیتے ہیں۔ محاسبے کے دانت کچھ اور تیز کیے جائیں اور اُنہیں بر وقت حرکت میں آنا چاہیے۔ یہ ہمارے سیاسی اور انتظامی نظام کے اندر بہت بڑی خرابی پائی جاتی ہے کہ بدعنوانیوں کا علم سب کچھ ہو جانے کے بعد ہوتا ہے اور مجرم قانونی مُوشگافیوں یا اثر و نفوذ کے ذریعے صاف بچ نکلتا ہے۔ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ محاسبہ اور مؤاخذہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔

ستائیسویں رات

اس بات پر خوشی کا اظہار ہی کرنا چاہیے کہ ٹی وی کی ایوارڈ تقریب، بھارت کے جنگی جنون کی طرح، یک لخت پھیل گئی ہے۔ اس تقریب میں دس ہزار کے لگ بھگ مہمان شریک ہوئے اور تین گھنٹے ٹی وی پر براہِ راست پروگرام دکھایا گیا۔ عین اُسی وقت بھارتی ٹی وی سے گورباچوف کی بھارت میں آمد، معاہدوں کی تفصیلات اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت آگے نکل جانے کے عزائم نشر کیے جا رہے تھے۔ فوجی ماہرین رُوس اور بھارت کی مشترکہ فوجی حکمتِ عملی کے نکات اور فوجی بالادستی کے معاملات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک طرف لطیفوں، چُٹکلوں اور گانوں کی تقریب اور دوسری طرف پُورے علاقے پر چھا جانے کے فیصلے۔ یہ تضاد ایک ایسے وقت میں اور بھی نمایاں ہُوا جب پاکستان کی سرحدوں کے آس پاس بھارت کی چھ ڈویژن فوج جنگی مشقوں میں دن رات مصروف ہے۔ انہی دنوں یہ اطلاع بھی آئی ہے کہ سیاچن گلیشیر پر بھی کثیر تعداد میں بھارتی فوج پہنچ گئی ہے۔

عام ذہن میں یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی میں اداکاروں کو اتنی اہمیّت کیوں حاصل ہو گئی ہے۔ اب سائنسدان، ریاضی دان، اچھے منتظم، اعلیٰ پائے کے اساتذہ اور فکری رہنما پس منظر میں جا رہے ہیں اور گلوکار، اداکار اور بھانڈ سب سے زیادہ محترم ٹھہرے ہیں۔ اس نوع کی تقریب اور وقت کے ضیاع کا جواز آج کے سنگین حالات میں تلاش کرنا بہت دُشوار ہو گا۔ کیا ہم اپنی قوم کے سامنے زندہ رہنے کا یہی

ایک ہی اسلوب پیش کرنا چاہتے ہیں کہ بڑی سے بڑی آزمائش کے لیے تیار ہونے کے بجائے گنگناتے اور اداکاری کرتے رہو۔

شریعت کی بالادستی

پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ اور شریعت کی بالا دستی قائم کرنے کی مساعی پاکستان بننے کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھیں۔ تمام طبقہ ہائے فکر کے عُلما نے اتفاق رائے سے ۲۲ نکات بھی مرتّب کیے تھے جنھیں اسلامی دستور کی اساس کی سی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہی کوششیں پارلیمنٹ کی دہلیز تک پہنچ گئی ہیں۔

شریعت کی بالا دستی کے سلسلے میں وزیرِ اعظم محمد خاں جونیجو نے گزشتہ سال یقین دلایا تھا کہ وہ آئین میں نواں ترمیمی بل پیش کریں گے۔ وہ بل سینٹ میں آیا اور منظور بھی ہو گیا۔ اب اس پر قومی اسمبلی میں بحث ہو گی۔

متعدّد سرکردہ عُلما نے یہ محسوس کیا کہ محض آئین میں ترمیم کر دینے سے شریعت نافذ نہیں ہوتی، اس کے لیے قانون بنانا ضروری ہے؛ چنانچہ پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے ایک شریعت بل تیار کیا گیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اُس کا جائزہ لیا اور بعض ترامیم کی سفارش کی۔ اس بل کے خلاف خواتین کے ایک طبقے نے مظاہرے کیے۔ وہی طبقہ جو اسلام کو آزادیٔ نسواں کے خلاف تصوّر کرتا ہے۔ شریعت بل کے حق میں ایک متحدہ محاذ وجود میں آ چکا ہے اور اُس کے زیرِ اہتمام پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے بہت بڑا مظاہرہ بھی ہو چکا ہے۔ حکومت نے اس پرائیویٹ شریعت بل کے مقابلے میں ایک سرکاری شریعت بل پیش کر دیا ہے۔ عام شہری اس اُلجھی ہُوئی صُورتِ حال سے بے حد پریشان ہے۔

عُلمائے کرام اور حکومت کو اس ضمن میں چند بنیادی نکات پر غور کرنا چاہیے:

(۱) کیا نویں ترمیمی بل کے الفاظ اسلامی قانون کے نفاذ میں مؤثر ثابت ہوں گے؟ وفاقی شرعی عدالت کا دائرۂ کار وسیع تو ہو گیا ہے مگر اُس کے فیصلوں کی حیثیت ایک سفارش سے زیادہ کی نہیں ہو گی۔ یہ بھی درج نہیں کہ حکومت یا قانون ساز اسمبلی کتنی مدت میں غیر اسلامی قانون کی جگہ اسلامی قانون لانے کی پابند ہو گی۔

(۲) آئین میں مناسب ترمیم کے بغیر شریعت بل کی منظوری سے کوئی فرق واقع ہو گا یا نہیں؟ ہمارے خیال میں اعلیٰ عدالتیں کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گی۔

(۳) شریعت بل کے بارے میں جو کچھ اختلافات سامنے آ رہے ہیں، اُنہیں دُور کرنے کا مناسب راستہ کیا ہے؟

(۴) عوام شریعت بل کی اہمیت کتنی سمجھتے ہیں ؟ اُنہیں عُلما نے عام فہم زبان میں کیا بتایا ہے اور عام زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کس قدر جوڑا ہے ؟

(۵) حکومت نے اپنے بل میں یہ لکھا ہے کہ اس کا نفاذ فقہی مسلک اور عقیدے کے مطابق ہو گا۔ کیا اس سے یہ مطلب نہیں کہ اسلامی قانون کو پرسنل لا کی سی حیثیت حاصل ہو گی اور اُسے پبلک لا نہیں بنایا جائے گا؟

عُلما کو سوچ سمجھ کر تحریکِ نفاذِ شریعت کو آگے بڑھانا چاہیے۔ تمام پہلوؤں پر غور و فکر ضروری ہے۔ مظاہروں سے زیادہ دستوری اور قانونی مہم پر توجہ مرکوز کرنے سے معاملات ٹھیک طور پر سُلجھائے جا سکیں گے۔ حکومت کو بھی تنگ نظری اور کم فہمی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ اسلام کی خدمت تو ایک سعادت ہے جس کی تمنا صدّیقین اور شُہدا نے کی ہے۔

اسمبلیوں میں کورم کا مسئلہ

منتخب اسمبلیوں میں کورم پُورا رکھنے کا مسئلہ ہر جمہوری ملک میں پریشانی کا باعث بنا رہا ہے۔ عوامی نمائندے لوگوں کے کام کاج کرانے میں دوڑتے پھرتے ہیں اور وُزرا امورِ مملکت چلانے میں گھِرے رہتے ہیں۔ امریکہ، بھارت اور انگلستان نے برسوں کے تجربات کے بعد کورم کے تعیّن میں غیر معمولی تخفیف سے کام لیا ہے۔ بھارت میں کورم کُل تعداد کا صرف دس فیصد ہے۔ پاکستان میں عام انتخابات غیر جماعتی بُنیادوں پر ہُوئے تھے۔ پارلیمنٹ میں اب سیاسی جماعتیں وجود میں آ چکی ہیں لیکن سیاسی نظم و ضبط خاصا ڈھیلا ہے۔ اور جن ملکوں میں ڈسپلن سخت ہے، وہاں بھی کورم کی حد بہت کم رکھی گئی ہے۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے پاکستان کے دستور میں مناسب ترمیم کی جائے اور کورم دس فیصد ہی رکھا جائے۔ اس طرح آئے دن جمہوریّت کا مذاق نہیں اُڑے گا، کورم بھی بار بار نہیں ٹُوٹے گا اور پارلیمنٹ کی باقاعدہ کارروائی میں بھی خلل واقع نہیں ہو گا۔ ہماری رائے میں حزبِ اختلاف کو اس معقول دستوری ترمیم پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

قومی پریس سے درد مندانہ اپیل

ہمارے قومی اخبارات کے سیاسی زندگی پر اثرات گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اُن میں شائع شدہ خبریں اور تجزیے ذہن بنا بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ حکومت کی نرم پالیسی کے باعث بعض سیاست دان اور کچھ سیاسی عناصر، ایک منصُوبے کے تحت، پاکستان کے خلاف کُھلّم کُھلّا تقریریں کرتے ہیں اور (خاکم بدہن) اُسے دُشمن کے

ساتھ مل کر توڑ دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بدبخت گروہ ایسا بھی ہے جو قائدِاعظمؒ کی تصویر کو پھاڑ دینا اور پاکستان کا پرچم جلا ڈالنا خدمتِ 'قومیت' سمجھتا ہے۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اُن کی تشہیر ہو اور اُن کے خیالات عام آدمی تک پہنچ جائیں تاکہ اُس کا پاکستان کے مستقبل پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔

ہمارے بعض قومی اخبارات اس چھوٹے سے سیاسی طائفے کی خبریں اس طرح فلیش کرتے ہیں گویا اس کی سوچ پُورے ملک پر حاوی ہو گئی ہے اور اُس کے سیاسی نظریات میں بھی افادیّت کے پہلو موجود ہیں۔ اخبارات و جرائد کا یہ طرزِ عمل فوری نظرِ ثانی کا تقاضا کرتا ہے۔ ملک میں کیا کیا رُجحانات اُبھرتے جا رہے ہیں، اُن سے قاری کو آگاہ رکھنا ضروری ہے مگر اُنہیں اس انداز میں پیش کرنا قومی ذمّے داری کے منافی ہے کہ وہ رُجحانات غالب آنے والے ہیں اور اُن پر ایک سیاسی مُتبادل کی حیثیّت سے غور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں مدیرانِ اخبارات و جرائد کو اس اُصول پر کاربند رہنے کا عزم کر لینا چاہیے کہ اُن کے اخبارات و رسائل میں کوئی بات ریاست اور اُس کے اساسی تصوّرات کے خلاف شائع نہیں ہو گی اور کوئی ایسا فارمولا زیرِ بحث نہیں آئے گا جو پاکستان کو مختلف مملکتوں میں تقسیم کر دینے والا ہو۔

پھر یہ بھی قومی پریس کی ذمّے داری ہے کہ وہ قوم کو نفسیاتی شکست و ریخت سے محفوظ رکھے۔ اخبارات میں اگر اس طرح کے بیانات جلی سُرخیوں میں شائع ہوتے رہیں کہ 'پاکستان کا مستقبل بڑا ہی تاریک ہے'، 'یہ مُلک چند ماہ میں ٹوٹ جانے والا ہے اور اب ۷۱ء کا ڈرامہ جلد ہی دُہرایا جائے گا' اور 'پاکستانی قوم کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہیں اور ہماری حکومت دُشمن سے مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی' تو عام شہری کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نوع کے نفسیاتی حربے تو دُشمن استعمال کیا کرتا ہے۔ اور ہم شاید غیر شعوری طور پر یہی کام سرانجام دے رہے ہیں۔

ہماری قومی پریس سے درد مندانہ اپیل ہے کہ وہ آزاد قوم کے باعزم اور آزادی کی حفاظت کرنے والے متحد نگہبان کا شاندار کردار ادا کرے اور عوام کے حوصلے بلند رکھے۔ مشکل وقت میں قوّتِ ارادی حالات کا رُخ یکسر بدل سکتی ہے۔

الطاف حسن قریشی

۲۸ر نومبر ۱۹۸۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کوپن بھریے اور تپ دق کے مریض کو بچائیے

یہ سادہ سا سوالنامہ مکمل کیجیے اور کسی تپ دق کے مریض کی امداد کا ثواب حاصل کیجیے

ہر ماہ صرف ۲۵۰ روپے خرچ کر کے یہ نیک کام کیجیے جس کے نتیجے میں ایک غریب خاندان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔ محنتی لوگوں کو عزت سے روزگار کمانے میں مدد مل سکتی ہے۔ آپ کے بھیجے گئے عطیے سے ایک غریب مریض کی مایوسی اُمید میں بدل سکتی ہے۔ آپ کے لیے تو ۲۵۰ روپے معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہی رقم جمع ہو کر عظیم کام سرانجام دے سکتی ہے۔

میرا نام : ____________________

پتہ : ____________________

آپ خود فرمائیں کہ آپ کسی ایک مریض کی کہاں تک مدد کر سکتے ہیں؟
اور آپ مریض کے علاج کے لیے رقم کتنی مدت کے لیے بھیجنا پسند فرمائیں گے؟

ماہانہ ۲۵۰ روپے ☐
سہ ماہی ۷۵۰ روپے ☐
سالانہ ۳۰۰۰ روپے ☐

ظاہر ہے کہ آپ عطیہ دی ہوئی رقم کے صحیح طریقے سے خرچ ہونے سے متعلق معلومات بھی حاصل کریں گے۔ فرمائیے کہ اس ضمن میں آپ کو سالانہ رپورٹ تفصیل اخراجات ارسال کی جائے؛

ہاں — نہیں

آپ کے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

براہِ مہربانی چیک یا ڈرافٹ پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن سیونگ اکاؤنٹ نمبر ۵ - ۱۵۳۷۷ حبیب بنک لمیٹڈ گلبرگ نمبر ۲ (مین مارکیٹ برانچ) کے نام تیار کیا جائے۔

نوٹ: اندرون یا بیرون ملک مقیم حضرات اپنے عطیات اس پتے پر روانہ کریں۔

پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن ۳۴۔ ایف گلبرگ نمبر ۲ نزد مین مارکیٹ لاہور۔۱۱ فون نمبر ۸۷۳۲۶۸

تار : PUNTEEBEE

تپ دق کا مریض یقیناً آپ کی امداد اور زکوٰۃ کا مستحق ہے

اصل خطرہ کدھر سے ہے؟

بڑی طاقتوں کے خفیہ پیغامات
آنے والے حالات کی کیا تصویر پیش کرتے ہیں
اور ہمارے داخلی عوامل کیا سگنل دے رہے ہیں۔

الطاف حسن قریشی

پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بھارتی افواج کے اجتماع اور نقل و حرکت کی پہلی خبر بی بی سی نے ڈیڑھ ماہ پہلے نشر کی تھی۔ اس خبر نے ایک ہیجان سا برپا کر دیا۔ انہی دنوں روس کے سربراہ میخائل گورباچوف چار روزہ سرکاری دورے پر دہلی تشریف لے آئے۔ پاکستان کے اندر ایک حلقے نے یہ تاثر دیا کہ اس دورے کے اختتام پر ایک بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں ہماری مغربی سرحدوں پر افغانستان کے ہوائی حملوں میں بھی شدت آگئی اور توپوں کی گھن گرج میں بھی اضافہ ہو گیا۔ روزنامہ خلیج ٹائمز نے اور باتوں کے علاوہ اس امر کا بھی انکشاف کیا کہ بھارتی ایجنٹ پاکستان میں تخریب کاری کے لیے افغانستان پہنچ گئے ہیں اور افغانستان کے جنگی ہوائی جہاز بھارتی ہوا باز اُڑا رہے ہیں۔ اسی عرصے میں راجستھان سے اس نوع کی خبریں بھی موصول ہوئی ہیں کہ بھارت نے سندھ کی سرحد کے بالکل قریب، مکتی باہنی کی طرز پر ایک سول فوج تیار کر لی ہے اور اسی علاقے میں فوجی تربیت کے بہت سے کیمپ کھول دیے ہیں اور گوریلوں کی کمان سندھ سے فرار ہو کر آنے والے ایک ہندو لیڈر کے ہاتھ میں ہے۔

تشویش و اضطراب میں پیہم اضافہ کرنے والی یہ خبریں ڈیڑھ دو ماہ سے گردش کر رہی ہیں۔ بھارت کے وزیرِاعظم کا لب و لہجہ گزشتہ چار پانچ ماہ سے بے حد بدلا ہوا ہے۔ اُنھوں نے پاکستان کو سبق سکھانے کی وعید بھی سُنائی ہے۔ اُن کے بہت قریبی دوستوں نے بعض غیر ملکی سفارت کاروں کو یہ واضح تاثر دیا ہے کہ راجیو گاندھی اس بات پر یقین کیے بیٹھے ہیں کہ پاکستان نے

اُنہیں قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی۔

ان خبروں اور ان تاثرات سے ہم کیا نتائج اخذ کر سکتے ہیں؟

❁

یہ ایک بڑا ہی مشکل سوال ہے۔ عالمی سیاست بھی اُلجھی ہوئی ہے اور علاقائی معاملات بھی پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے داخلی حالات میں ایک زلزلہ سا آیا ہوا ہے۔ سیاسی مبصرین اور دفاعی اُمور کے ماہرین واقعات کے آثار چڑھاؤ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ اُن کے تجزیے سامنے بھی آ رہے ہیں جن سے تشویش میں شدت اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ دراصل آج کی دُنیا منافقت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے اور بات کی تہ تک پہنچنا حد درجے دُشوار ہو گیا ہے۔ امن کے راگ الاپنے والے اپنے پڑوسی ملک پر شبخون مارنے کا منصوبہ تیار کر رہے ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگجویانہ باتیں کرنے والے پُرامن طریقوں سے کچھ اور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں خُدا کے فضل سے حالات کا صحیح تجزیہ کرنے والے موجود ہیں۔ ہمارے ہاں فوجی مدبّر بھی ہیں اور سیاسی دماغ بھی۔ بین الاقوامی اُمور کے ماہر بھی ہیں اور قومی مسائل پر نگاہ رکھنے والے بھی۔ اس لحاظ سے ہم کسی کم نظری کا شکار نہیں ہوں گے اور حقائق تک ضرور پہنچ جائیں گے؛ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ وقت ہمیں حقائق تک پہنچنے کی مُہلت بھی دے گا یا نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و تمدّن کی بے انتہا ترقّی کے باوجود آج بھی جنگل کا قانون کہیں کہیں کارفرما نظر آتا ہے۔ بھارت نے حیدر آباد دکن کی ریاست آنکھ جھپکنے میں ہڑپ کر لی۔ کشمیر میں بھارتی فوجیں کسی جواز کے بغیر پہنچ گئیں۔ افغانستان پر رُوس قابض ہو گیا۔ ہنگری میں رُوسی ٹینکوں نے حریت پسند کُچل کر رکھ دیے۔ امریکہ نے لیبیا پر خونخوار ہوائی حملے کیے۔ ان واقعات کے پس منظر میں فقط ڈپلومیسی پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بازوؤں کے اندر بھی طاقت ہونی چاہیے۔ بعض دفعہ امن کی حفاظت اسلحے سے کرنا پڑتی ہے۔

پاکستان کے اِردگرد جن حالات نے محاصرہ کر رکھا ہے، ان میں خطرات کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ یہ خطرات فرضی ہیں، وقتی ہیں یا حقیقی، اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ تینوں امکانات اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ ہم ہر امکان کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

❁

ہمارے ہاں یہ سوچ موجود ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ہی داخلی مسائل میں گھرے ہُوئے ہیں اور اُنہوں نے عوام کی توجہ بُنیادی معاملات سے ہٹانے کے لیے جنگ کی سی فضا پیدا کر دی ہے اور یہ ایک ڈرامے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اس نقطۂ نظر میں یہ بُنیادی بات فرض کر لی گئی ہے کہ بھارت اور پاکستان کے زعما کے درمیان ایک خُفیہ گٹھ جوڑ ہوا ہے اور اُنہوں نے عوام کو بے وقوف بنانے کا ایک ڈرامہ رچا لیا ہے۔ واقعات و شواہد اس مفروضے کی تائید نہیں کرتے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی میں جس انداز سے اضافہ ہو رہا ہے اس کے پیچھے کسی طے شدہ منصوبے کی تلاش ایک سعیٔ لاحاصل معلوم ہوتی ہے۔ ماضی میں ایسا کبھی ہُوا نہیں اور ہمارے تاریخی اور سیاسی پس منظر میں اس کی گنجائش بھی نہیں۔ اتنا بڑا اور اتنا خوفناک ڈرامہ مصنوعی طریقے سے نہیں کھیلا جا سکتا جبکہ پُوری دُنیا کی نظریں اس خطے پر جمی ہُوئی ہیں۔

بھارت کے بارے میں البتہ یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ اُس کی قیادت نے فوجوں کی نقل و حرکت عوام کی توجہ داخلی مسائل سے ہٹانے کے لیے کی ہو مگر فوجوں کا اجتماع اور اس قدر بڑے پیمانے پر اُن کی نقل و حرکت کوئی معمولی بات نہیں۔ اس طرح کی مُہم جُوئی میں خود حکومت کے لیے بے پناہ خطرات مضمر ہیں اور کوئی سیاست دان اپنے اقتدار کو جان بُوجھ کر خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خطرہ محض فرضی نہیں۔ بھارتی وزیرِ اعظم کے یہ الفاظ نظر انداز نہیں کیے جا سکتے کہ ہم پاکستان کو سبق سکھائیں گے۔

چھ ڈویژن فوج اگر واقعی راجستھان کے علاقے میں جمع ہے

اور بڑے پیمانے پر جنگی مشقیں کر رہی ہے اور اگر یہ خبر بھی دُرست ہے کہ رَن کچھ کے قریب بھارتی بحریہ نے ایکسر سائز شروع کر دی ہے تو اس پُورے عمل کو ایک معمول کا عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک بڑے منصوبے کا حصّہ نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وسیع انداز میں پھیلی ہُوئی ان خبروں کی تصدیق کیونکر ہو؟

وزیرِ اعظم محمد خاں جونیجو سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لیے وسط نومبر میں بنگلور گئے۔ واپسی پر اُنہوں نے پریس کانفرنس میں یہ مژدہ سُنایا کہ بھارتی فوجوں نے راجستھان میں نقل و حرکت نہیں کی اور یہ بات اُنہیں وزیرِ اعظم راجیو نے بتائی ہے اور چونکہ وہ ایک بڑے ہمسایہ ملک کے وزیرِ اعظم ہیں، اس لیے ہمیں اُن کی یقین دہانی پر اعتبار کر لینا چاہیے۔ پریس کانفرنس میں جناب وزیرِ اعظم سے بعض تیکھے سوال بھی ہُوئے۔ اُن سے یہی پُوچھا گیا کہ کیا دُشمن ہمیں پیشگی اطلاع دے کر ہم پر حملہ کرے گا۔ وزیرِ اعظم جناب جونیجو نے سوالات کے جواب میں اختصار اور احتیاط سے کام لیا۔ وہ شاید قوم کی بے یقینی اور پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

پریس کانفرنس کے چند روز بعد صدرِ مملکت نے ایک موقع پر یہ بات پھر دُہرائی کہ بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں کے قریب انتہائی بڑے پیمانے پر جنگی مشقیں کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں مگر ان جنگی مشقوں سے پاکستان کی سلامتی کو فوری خطرہ لاحق نہیں۔ اس بیان میں بھی اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اہلِ وطن کے اضطراب میں اضافے سے گریز کیا جائے۔ اُنھی دنوں وزیرِ اعظم پاکستان کے حوالے سے اس عنوان کی خبریں شائع ہوئیں کہ اُنہوں نے فضائی آپریشن ہیڈ کوارٹر کا معاینہ کیا اور قومی اسمبلی کی اُمورِ خارجہ کمیٹی سے اپنے چیمبر میں نہایت اہم گفتگو کی اور پاکستان کے دوستوں کو بھارتی افواج کے اجتماع سے پیدا ہونے والے ممکنہ اثرات و نتائج سے آگاہ رکھنے کی حکمتِ عملی بنائی۔ ان واضح اشاروں سے ایک ہی تصویر بنتی ہے کہ بھارتی فوجوں کے اجتماع کی خبریں من گھڑت نہیں۔

❁

بھارت اور سوویت یونین کے مابین گہرے سیاسی، دفاعی اور اقتصادی تعلّقات کے پس منظر اور پیش منظر میں یہ شدید احساس اُبھرتا ہے کہ یہ دونوں مُلک مل جُل کر پاکستان کو سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ برزنیف نے تو جنتا حکومت کو یہی کام کرنے کے لیے آٹھ سال پہلے کہا تھا مگر اُس وقت کے بھارتی وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی نے رُوسی قیادت کی خواہش پُوری کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ شاید گورباچوف اب وہی کام راجیو گاندھی سے لینا چاہتے ہیں اور وہ اسی لیے دہلی آئے تھے۔

دوسرا احساس یہ اُبھرتا ہے کہ بھارت سندھ کے حالات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور وہ بالکل وہی حکمتِ عملی اختیار کرتا جا رہا ہے جو ۱۹۷۱ء میں اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں وضع کی تھی۔ تب مشرقی پاکستان کے داخلی حالات خراب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر لٹریچر اور اسلحہ سمگل کیا گیا تھا۔ طالب علموں کے اندر مذہب اور پاکستان کے خلاف نفرتیں پھیلانے کی غرض سے بڑی تعداد میں نوجوان بھارت سے بھیجے گئے تھے۔ سیاسی جماعتوں میں بھارت کے ایجنٹ گھُس گئے تھے اور تخریب کاری کا دائرہ وسیع تر ہو گیا تھا۔ پھر جُوں جُوں بغاوت کی لہر اُبھرتی گئی بھارت نے تربیت یافتہ گوریلے بھیجنے شروع کر دیے اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہُوا اور پاکستان کو پُوری دُنیا میں رُسوا کرنے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔

بھارت کے حکمران وہی کھیل سندھ میں کھیلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اُن کے خیال میں مشرقی پاکستان کی طرح سندھ بھی پکے پھل کی طرح اُن کی گود میں آ گرے گا۔ اسی اندازے کے مطابق شریمتی اندرا گاندھی نے اگست ۱۹۸۳ء میں سندھ میں چند روزہ ہنگاموں کے دوران یہ بیان دے دیا تھا کہ ہم سندھ کے حریت پسندوں کے ساتھ ہیں۔ اُن کی آرزو خاک ہُوئی اور سندھ کے حالات چند ہفتوں بعد معمول پر آ گئے۔ اس ناکامی کے بعد بھارت نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں اور گزشتہ ماہ کراچی، حیدر آباد اور اندرونِ سندھ جو خُوں رنگ واقعات

ظہور پذیر ہُوئے اُن میں بھارتی تخریب کاروں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ڈاکوؤں کے رُوپ میں بھی بھارتی گوریلے سندھ میں امنِ عامّہ کے لیے مسئلہ بنے ہُوئے ہیں۔ ریل کی پٹریاں، ٹیلی فون اور بجلی کے تار کاٹنے والے بھی تربیت یافتہ بھارتی تخریب کار تھے۔ ان کے قلع قمع کے لیے پاکستان کو بھی تربیت یافتہ دستے استعمال کرنے پڑے۔

بھارتی سفارت کار سندھ میں بہت زیادہ سرگرم ہیں۔ اُن کا مقصد سندھ کی آبادی کو لسانی اور جغرافیائی طور پر تقسیم کر دینا اور اُنہیں ایک دوسرے سے لڑا دینا ہے۔ قومی محاذ تحریک غیر شعوری یا شعوری طور پر بھارتی خواہشات کی تکمیل کا باعث بن گئی۔ عام تاثر یہ ہے کہ اس تحریک میں بھارت نے اپنے حاشیہ نشین شامل کر دیے تھے اور اُنہوں نے عیّاری سے پورا نقشہ ہی تلپٹ کر دیا اور واقعات کو خُونیں رنگ دے دیا۔ طلبہ میں پہلے ہی سے پاکستان گریز عناصر کام کر رہے ہیں اور سندھ کی جواں قُوتوں کو منفی سرگرمیوں میں اُلجھائے رکھتے ہیں اور اُن میں سندھی قومیت کے جذبات اُبھارتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے سادہ لوح عوام دُشمن کی ان چالوں کا صحیح ادراک نہیں رکھتے اور نعروں سے بہک بھی جاتے ہیں اور بہہ بھی جاتے ہیں۔

سندھ میں بھی احساسِ محرومی کو اسی انداز سے ہوا دی جا رہی ہے جس انداز سے مشرقی پاکستان میں دی گئی تھی؛ حالانکہ دونوں کی جغرافیائی، سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال میں بڑا فرق ہے۔ آج پروپیگنڈے نے ایک سائنس کی حیثیت پالی ہے اور عوام کے ذہنوں میں کوئی بات بٹھانے کے ایسے ایسے نفسیاتی طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں کہ وہ بالکل فطری اور معصوم سے نظر آتے ہیں۔ جوان ذہن پروپیگنڈے سے جلد اور جذباتی انداز میں اثر قبول کرتے ہیں۔ اُن کا ردِّ عمل بھی شدید ہوتا ہے۔

تازہ ترین خبروں کے مطابق بھارت نے راجستھان میں کیمپ کھول دیے ہیں جن میں ۶۵ء اور ۷۱ء میں سندھ سے فرار ہونے والے ہندو رکھے گئے ہیں۔ یہ بھی وہی تکنیک ہے جو مشرقی پاکستان میں بروئے کار لائی گئی تھی۔ اُس وقت یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومتِ پاکستان کے ناقابلِ برداشت ظلم سے پناہ لینے کے لیے لوگ بھارت آ گئے ہیں اور انسانی حقوق کے احترام میں بھارتی حکومت نے اُن کے لیے کیمپ قائم کر دیے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کے بعد بھارت نے سات آٹھ ماہ پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا اور عالمی رائے عامّہ کو بنگلہ دیش کے حق میں ہموار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا۔ کیمپوں کا وہی تجربہ آج راجستھان میں دُہرایا جا رہا ہے، حالانکہ سندھ میں حالات بڑی حد تک معمول پر ہیں اور صرف سماج دُشمن عناصر بگاڑ پیدا کر رہے ہیں جن پر قابُو پانا حکومت کی قانونی اور سیاسی ذمّے داری ہے۔

مکتی باہنی کے خطوط پر راجستھان میں ایک نیم فوجی تنظیم بھی کھڑی کر لی گئی ہے اور ایک خبر کے مطابق اس نوع کی تنظیموں میں ایک لاکھ افراد بھرتی کر لیے گئے ہیں۔ نقشہ وہی ہے کہ سندھ کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے اور دوسری طرف سندھ کے اندر تخریبی عمل کو تیز کر کے یہ تاثر دیا جائے کہ عوام حکومت کے شدید مخالف ہیں اور اپنی آزادی کے لیے بھارت کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے بعض عافیت نا اندیش افراد نے سندھ میں کچھ مقامات پر یہ تاثر دیا ہے کہ وہ بھارتی ٹینکوں پر آنے والی فوج کا خیر مقدم کریں گے۔ یہ گِنے چُنے افراد وہی ہیں جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور خُدا کی نعمت آزادی کا برملا کُفران کر رہے ہیں۔ ان کی برین واشنگ مختلف انداز سے کی جاتی رہی ہے اور وہ اپنے بدترین دُشمن کو اپنا بہترین دوست سمجھ رہے ہیں۔

❦

اب اطّلاعات کے مطابق بھارت راجستھان اور رن کچھ کے علاقوں میں چار ماہ کی جنگی مشقیں کرنے کی تیّاریاں کر رہا ہے۔ اُس نے ایک ایسا علاقہ منتخب کیا ہے جہاں سے بآسانی سندھ میں فوجی مداخلت کی جا سکتی ہے۔ بظاہر بھارت کا فوجی منصوبہ یہی نظر آتا ہے مگر اس پر عمل کرنا کچھ سہل نہ ہوگا۔

عالمی رائے کی طاقت کوئی معمولی طاقت نہیں۔ اسے نظر انداز کرنے سے بھارتی حکمرانوں کا امیج بھی خراب ہوگا اور ممکن ہے اسے ناقابلِ تلافی نقصان بھی اُٹھانا پڑے۔

عالمی رائے عامّہ اور بالخصوص امریکی عوام کو پاکستان کے خلاف بھڑکانے کے لیے بھارتی قیادت نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو نہایت خوفناک انداز میں پیش کرنے کی مُہم تیز تر کر دی ہے۔ وہ یہ تاثّر دینا چاہتی ہے کہ پاکستان امن کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے کیونکہ اُس نے خاموشی سے ایٹمی دھماکہ بھی کر لیا ہے۔ امریکی رائے عامّہ ایٹمی ہتھیاروں کے سخت خلاف ہے۔ بھارتی حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے امریکی عوام اور امریکی کانگرس کو پاکستان سے بدظن کیا جا سکتا ہے اور اگر بھارت نے اُس کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کیا تو امریکہ اپنے حلیف کی مدد کو نہیں پہنچے گا۔

گورباچوف کے حالیہ دَورے کے بارے میں یہ تاثّر دیا جا رہا ہے کہ رُوس اور بھارت نے جو مشترکہ فوجی حکمتِ عملی وضع کی ہے اور جس کا تقریبوں اور بیانات میں بہت چرچا ہُوا ہے اُس کا بڑا مقصد بھارت کو پاکستان پر حملہ آور ہونے کی صورت میں پُوری دفاعی اور سیاسی حمایت فراہم کرنا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ راجیو گاندھی نے رُوسی سربراہ کو خوش آمدید کہتے ہُوئے سب سے زیادہ زور ۷۱ء کے معاہدے پر دیا ہے جس نے مشرقی پاکستان کی علحدگی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

❦

تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رُوس افغانستان میں بُری طرح پھنس گیا ہے اور اُس کی سیاسی اور فوجی ساکھ پر حرف آیا ہے۔ پاکستان نے افغانستان پر جو اُصولی موقف اختیار کیا، اُس نے عالمی اداروں اور بین الاقوامی تنظیموں پر صحت مند اثرات مرتّب کیے ہیں۔ اقوامِ متحدہ، غیر جانب دار تحریک اور اسلامی کانفرنس تنظیم نے بار ہا بھاری اکثریت سے پاکستان کے موقف کا ساتھ دیا ہے۔ رُوس یہ چاہے گا کہ پاکستان کو اس گستاخی کا سبق سکھایا جائے اور اس پر اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ فوجی اور اقتصادی اعتبار سے بے حد کمزور ہو جائے اور پھر اُسے ہر طرح کی شرائط مان لینے پر مجبور کر دیا جائے۔

رُوس پاکستان پر براہِ راست حملہ کرتا ہے تو اُس کے نتائج بے حد خوفناک ہوں گے۔ وہ یہی مقصد بھارت کے ذریعے آسانی سے حاصل کر سکتا ہے اور بھارتی حکمران ان دنوں مُہم جُوئی کے موڈ میں بھی ہیں ــــ مگر کسی جواز کے بغیر ہمسایے پر فوج کشی کوئی معمولی بات نہیں جبکہ پاکستان کے اندر بھی دُشمن کا مُنہ توڑ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہمیں کچھ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ بھارت کا پاکستان کی سرحدوں پر اپنی چھ ڈویژن فوج لے آنے کا بُنیادی مقصد تصادم سے زیادہ اپنی گنوائی ہُوئی سیاسی اہمیت دوبارہ حاصل کرنے کا ہے۔ ممکن ہے اُس کے پیشِ نظر دونوں ہی مقاصد ہوں۔

بھارت کی گنوائی ہُوئی سیاسی اہمیت کا سُراغ لگانا آج کے حالات کو سمجھنے کے لیے ازحد ضروری ہے۔

❦

بھارتی حکمرانوں کو سب سے بڑی آرزو یہ رہی ہے کہ اسے جنوبی ایشیا کی بالادست طاقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ رُوس نے اپنے سیاسی فوجی مقاصد کے لیے بھارت کو اقتصادی اور فوجی امداد فراہم کی اور اُسے علاقے کی بالادستی سونپ دی۔ چین کے لیے بھارت کی یہ خواہش ایک چیلنج کی صُورت اختیار کر گئی۔ اُس نے بالادستی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسی کشمکش کے نتیجے میں دونوں کے مابین فوجی تصادم بھی ہُوا اور دونوں کے راستے جُدا جُدا ہو گئے۔ رُوس نے چین کا ساتھ دینے کے بجائے بھارت کی قوّت میں اضافہ کیا۔ چین تن تنہا رہ گیا۔ اس مشکل وقت میں پاکستان نے اُس کا ساتھ دیا اور یہ دونوں ملک رُوس اور امریکہ کی مرضی کے خلاف دوستی اور تعاون کے مضبوط رشتوں میں بندھتے چلے گئے۔ اندرا گاندھی

نے پاکستان، چین اور امریکہ تینوں ممالک سے ایک فاصلہ رکھا اور اپنے آپ کو رُوسی مفادات کے حوالے کر دیا۔ اُن کے قتل سے پہلے یہ صُورتِ حال ہو گئی تھی کہ بھارت رُوس کا سٹیلائٹ تصوّر ہونے لگا تھا۔

برژنیف نے بھارت کو جنوبی ایشیا میں کلیدی رول سونپا تھا؛ چنانچہ وہ کمونسٹ پارٹی کی سالانہ کانگرس میں بھارت کا ذکر بہت اہتمام سے کرتے تھے اور عالمی اداروں میں بھی اُسے سب سے مضبوط دوست کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ رُوس نے چین کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ ایک زمانے میں تو اُس کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے ایشیا کی سلامتی کا منصوبہ بھی پیش کیا تھا اور اُس پر اصرار بھی ہوتا رہا تھا۔ پاکستان نے اُس کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔

اندرا گاندھی کی ہلاکت کے بعد راجیو گاندھی وزیرِ اعظم بنے۔ اُن کی تعلیم زیادہ تر مغرب میں ہُوئی تھی اور اُن کی اہلیہ بھی اطالوی ہیں۔ اس پس منظر سے عالمی حلقوں میں رائے زنی ہونے لگی کہ بھارت رُوس کے حلقۂ اثر سے باہر آنے کی کوشش کرے گا۔ راجیو گاندھی نے ماسکو یاترا کے بعد واشنگٹن کا رُخ کیا۔ امریکہ نے اعلیٰ ٹیکنالوجی فراہم کرنے کی پیشکش کی اور اس تاثر کو تقویت ملی کہ بھارت دفاعی اور ٹیکنیکی معاملات میں فقط رُوس پر انحصار کرنے کے بجائے یورپ اور امریکہ سے بھی معاہدے کرنا چاہتا ہے۔

اِدھر رُوس میں قیادت بدل گئی۔ گورباچوف نے اقتدار پر قابض ہوتے ہی ایک نئے انداز سے علاقائی اور عالمی مسائل کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اُس نے غالباً یہ سوچا کہ ہمیں ایشیا میں فقط بھارت پر انحصار کرنے کے بجائے دوسرے ممالک سے بھی رابطے بڑھانے چاہییں۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جب راجیو گاندھی امریکہ سے تعلقات بڑھانے کے لیے اپنی حکمتِ عملی میں قدرے لچک پیدا کر رہے تھے۔ گورباچوف نے محسوس کیا کہ ہم جس ملک پر مکمل انحصار کیے ہُوئے ہیں، وہ کسی وقت مغربی بلاک سے رشتے مضبوط کر سکتا ہے؛ چنانچہ ایشیا کے بارے میں ایک نئی حکمتِ عملی وضع ہونے لگی۔ بھارت نے بعض یورپی ممالک سے اسلحہ خریدا اور جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے معاہدے کیے۔ گورباچوف نے بھارت کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور چین کے ساتھ برسوں کے بگڑے ہُوئے تعلقات میں اصلاح پیدا کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ ۲۸ اکتوبر ۸۶ء کو رُوسی سربراہ نے ولاڈی واسٹک میں ایشیا سے متعلق ایک پالیسی بیان دیا۔ اپنی اس انتہائی اہم تقریر میں زیادہ وقت عوامی جمہوریہ چین سے تعلقات استوار کرنے پر دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ رُوس منگولیا سے اپنی افواج کا بڑا حصہ ہٹا لے گا اور چین کی سرحدوں پر جو پچاس ڈویژن فوجیں تعینات ہیں، اُن میں بہت کمی کر دی جائے گی۔ یہ بھی اعلان کیا کہ دریائے آمور پر سرحد کے تعیّن میں چین کا موقف تسلیم کر لیا جائے گا۔ اسی تقریر میں گورباچوف نے افغانستان سے رُوسی فوجوں کی جُزوی واپسی کا بھی اعلان کیا تھا۔

اس پالیسی بیان میں گورباچوف نے جاپان کے ساتھ اقتصادی تعلقات قائم کرنے کی بھی پیشکش کی جو ایک مدت سے منقطع تھے۔ حیرت کی بات یہ کہ جاپان کے لیے انھوں نے درجۂ اوّل کی طاقت کے الفاظ استعمال کیے۔ اس تقریر میں ایک بات یہ بھی غیر معمولی تھی کہ سوویت سربراہ نے ایشیائی سکیورٹی پلان کے احیا پر بھی زور دیا۔ پہلا پلان سب سے پہلے ۱۹۶۹ء میں پیش کیا گیا تھا جس کا بُنیادی مقصد چین کی ناکہ بندی تھی اور اُس میں بھارت کو بُنیادی اہمیت حاصل تھی۔ نئے پلان میں چین کو ایک اہم ملک کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔ تقریر میں بھارت کی بھی تعریف کی گئی مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا درجہ پیچھے رہ گیا ہے اور اصل اہمیت چین اور جاپان کو دی جا رہی ہے۔

اس تبدیلی پر بھارت کے پالیسی ساز افراد اور اداروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ گورباچوف نے اہم خطاب میں بھارت کی علاقائی اہمیت کا ذکر تک نہ کیا تھا اور یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ ہمارا قریب ترین دوست ہے۔ یہ کوئی معمولی تغیّر نہیں تھا؛ چنانچہ ولاڈی واسٹک کی تقریر کے بعد بھارتی حکومت یک لخت سرگرم ہو گئی اور فوجی دماغوں نے رُوس کو اپنے قریب رکھنے کے کئی ایک طریقے سوچنے شروع کر دیے۔

اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بھارتی فوجوں کا پاکستان کی سرحدوں پر اجتماع اس مقصد کے لیے ہو کہ رُوس کی امداد کی خاطر بھارتی حکمران یہ اشارہ دیں کہ افغانستان والی طرف سے پاکستان کو الگ تھلگ کر دینے کے لیے ہم اپنی طرف سے حملہ کر دیتے ہیں اور آپ ہماری ہر طرح سے مدد کیجیے۔ اس خدمت کے صلے میں گورباچوف سے علاقائی طاقت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور اُسے چین کی طرف تیز پیش قدمی سے بھی روکا جا سکتا ہے۔

❦

راجیو گاندھی اور گورباچوف کے مابین تنہائی میں کیا طے پایا اور رُوسی افواج کے سربراہ اور بھارتی افواج کے تینوں سربراہوں کے درمیان کیا حکمتِ عملی زیرِ بحث آئی، ان کے بارے میں ابھی کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی — لیکن سوویت سربراہ نے پریس کانفرنس میں جو انداز اختیار کیا وہ اپنے اندر بہت سے مضمرات رکھتا ہے اور اسی اندازِ تکلم سے ایک پوری کہانی ترتیب دی جا سکتی ہے۔

ایک صحافی نے پُوچھا پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ گورباچوف نے بڑی خوبصورتی سے جواب دیا:

"رُوس بھارت اور پاکستان قریبی ہمسائے ہیں اُنہیں امن اور سلامتی کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

ایک اور سوال پُوچھا گیا:

"۶۲ء میں چین اور بھارت کے درمیان تصادم میں رُوس نے کہا تھا کہ بھارت ہمارا بھائی ہے اور چین ہمارا دوست اور ہم اپنے بھائی کا ساتھ دیں گے۔ آج اگر بھارت اور چین کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو آپ کس کا ساتھ دیں گے؟"

گورباچوف نے ڈپلومیسی کے لب و لہجے میں جواب دیا: ہم ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں جنگ کی نوبت آئے گی نہ کسی کا ساتھ دینے کی۔"

افغانستان کے بارے میں ایک سوال ہُوا:

"آپ نے افغانستان میں سیاسی حل دریافت کرنے کی اُمید دلائی ہے۔ اس اُمید کی بُنیاد کیا ہے؟" گورباچوف نے دھیمے لہجے میں کہا:

"مجھے اُمید ہے کہ سیاسی حل تلاش کر لیا جائے گا۔ کارڈووِیز کی مساعی میں پیش رفت ہُوئی ہے اور میں آزاد اور غیر جانبدار افغانستان پر یقین رکھتا ہوں اور افغانستان کے عوام کو اپنی پسند کی حکومت بنانے کا پُورا پُورا حق حاصل ہے اور یہ حق اُنھیں ملنا چاہیے۔"

ان تینوں جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورباچوف نے بھارت کے منصوبے میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ افغانستان کا مسئلہ ہم طاقت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے سیاسی حل کی تلاش میں تعاون کریں گے۔ پاکستان کے حوالے سے یہ بھی کہا کہ رُوس نے مشکل وقت میں اُس کی مدد کی ہے اور آیندہ بھی خوشگوار تعلقات کو فروغ دیا جائے گا۔

❦

گورباچوف نے امن اور سلامتی پر اس قدر کیوں زور دیا ہے؟

اس کے مقاصد ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ایک مقصد تو یہی ہو سکتا ہے کہ اُوپر سے امن اور آشتی کے گیت گائے جائیں اور یہ تاثر دیا جائے کہ رُوس ایک امن پسند طاقت ہے اور وہ افغانستان میں فقط امن قائم کرنے آیا ہے۔ امن قائم ہو گیا تو اُس کی فوجیں بلا تاخیر واپس چلی جائیں گی۔

دُوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امن کی باتیں جس زور شور سے کی گئیں اُسی زور شور سے طاقت کے استعمال کی تیاریاں کی جا رہی ہوں۔ پاکستان کے خلاف کوئی بڑا محاذ کھولنے سے پہلے یہ تاثر دینا ضروری سمجھا گیا ہو کہ ہم تو پُرامن پڑوسیوں کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں مگر پاکستان خطے کا امن تباہ کرنے پر تُلا ہُوا ہے، وہ امریکی مفادات کا ایک سیٹلائٹ بن گیا ہے

اور اواکس خرید کر ہمارے خلاف جاسُوسی کرنا چاہتا ہے۔

ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسٹر گورباچوف دیانتداری سے یہ محسُوس کرنے لگے ہوں کہ تناؤ اور کشیدگی کی فضا بنی نوعِ انسان کے لیے بہت مُہلک ہے اور روایتی، ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کا خاتمہ انسان کے خوش آیند مُستقبل کے لیے ازبس ضروری ہے۔

ان تینوں اسباب و مقاصد میں سے اصل غرض و غایت کیا ہے، اس کا جواب آنے والے حالات ہی دے سکیں گے۔ بادی النظر میں رُوس بھارت کو پاکستان پر حملے کی شہ نہیں دے سکتا۔ اُسے معلوم ہے کہ پاکستان آج عالمی برادری سے کٹا ہُوا نہیں، بلکہ اُس کے ساتھ پیوست ہے۔ اسلامی کانفرنس تنظیم کے اندر اُس کی آواز بڑی وُقعت رکھتی ہے۔ غیر جانبدار تحریک میں بھی اُس کا رول بڑا مؤثر ہے۔ اقوامِ مُتّحدہ میں اس کا ساتھ دینے والے ایک عظیم اکثریت رکھتے ہیں۔ سارک میں اُس کی پوزیشن بڑی مستحکم ہے۔

فوجی اعتبار سے بھی پاکستان اس وقت ۷۱ء کے مقابلے میں یقیناً بہتر پوزیشن میں ہے۔ ایف ۱۶ کا نیا عنصر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اِس کے علاوہ امریکہ افغانستان کی وجہ سے اس خطّے کی سلامتی میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔ گورباچوف کے دورے کے فوراً بعد اگر بھارت پاکستان کے خلاف جارحیّت کا ارتکاب کرتا ہے یا ایٹمی تنصیبات پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ رُوس کی جانب سے حملہ متصور ہوگا اور اُمّید یہ ہے کہ امریکہ بھی اپنی ذمّے داریاں پُوری کرے گا۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس بین الاقوامی سرحدیں عبور کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ کس مُنہ سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مخالفت کر سکتا ہے جبکہ خود ۷۴ء میں ایٹمی دھماکا کر چکا ہے۔ اب وزیرِاعظم راجیو نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ پاکستان میں منشیات کا فروغ ہمارے لیے باعثِ تشویش ہے۔

ممکن ہے بھارت اپنے طور پر فوجی مُہم جوئی پر چل نکلے، ہمارے خیال میں رُوس براہِ راست مداخلت کی اس وقت حمایت نہیں کرے گا۔ یہ لمحہ اُس کے لیے کسی طور موزوں نہیں۔ وہ تو چین اور جاپان سے تعلقات بہتر بنانے کی فکر میں ہے اور اس کوشش کے دُور رس عالمی اور علاقائی نتائج برآمد ہوں گے۔ رُوس ان دنوں شدید اقتصادی دباؤ سے دوچار ہے۔ چین کے ساتھ شدید تناؤ سے اُس کے اعصاب مضمحل ہوتے جا رہے ہیں۔ افغانستان اور کمبوچیا اُس کے جارحانہ عزائم کی علامت بن گئے ہیں۔ سوویت یُونین کے قائدین اپنے وطن کا امیج سنوارنا چاہتے ہیں۔ پھر وہاں اسلام کی تحریک بھی سُلگ رہی ہے۔ بعض ریاستوں میں مذہب کا احیا ہونے لگا ہے۔ ان حالات میں اُس کے لیے جنگ میں کودنا یا کودنے والے کا ساتھ دینا سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بھارت کے تیور اچھے نہیں۔ راجیو گاندھی نے سارک سربراہ کانفرنس کے بعد جو پریس کانفرنس کی اُس میں یہ تاثر دیا کہ ہم پاکستان کے تین معاملات سے سخت غیر مطمئن ہیں۔ اس فہرست میں منشیات کا مسئلہ بھی شامل ہے جس کا بھارت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ بھیڑیا شرارت پر تُلا ہُوا ہے اور کوئی بہانہ تراش رہا ہے جس کی منطق طاقت سے عبارت ہوگی مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے بھی یہ وقت موزوں نہیں۔ پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت قائم ہے۔ جمہوری ادارے کام کر رہے ہیں۔ عوام اقتدار میں شریک ہیں۔ فوج بڑی حد تک بیرکوں میں جا چکی ہے۔ سندھ اور کشمیر میں مرکز گریز تحریکیں عوام کے اندر انتہائی غیر مقبول ہیں۔ نیا سیاسی نظام عام آدمی کی اقتصادی اور سیاسی حالت بہتر بنانے میں ممد ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان میں آج مشرقی پاکستان کے سے حالات ڈھونڈنے والے احمقوں کی جنّت میں بستے ہیں۔

پھر وہ عوامل بھی توجّہ طلب ہیں جو بھارت کی داخلی قوّت پر منفی انداز میں اثر انداز ہو رہے ہیں۔ سکھوں کے مسئلے کو مسز اندرا گاندھی نے فوجی آپریشن سے بہت سنگین بنا دیا۔ آسام

کے الاؤ سُلگ رہے ہیں۔ گورکھا لینڈ کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔ جنوب میں سوچ کے دھارے شمال کے دھاروں سے یکسر مختلف ہیں۔ عوام کی بہت بڑی تعداد فلاکت زدہ ہے۔ ضمنی انتخابات میں حکمران جماعت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ ان حالات اور مسائل سے آنکھیں بند کر کے اگر وزیرِاعظم راجیو گاندھی کوئی رسک لینا چاہتے ہیں تو نتائج کے ذمّے دار وہ خود ہوں گے۔

بھارت کا امیج ایک جنگجو ملک کا بنتا جا رہا ہے۔ اُس کی اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ سخت اَن بن ہے۔ داخلی معاملات میں مداخلت کی شکایتیں روزافزوں ہیں۔ تخریب کاری کے شواہد مل رہے ہیں۔ نیپال شاکی ہے، سری لنکا دُہائی دے رہا ہے۔ بنگلہ دیش بھارت کے لگائے ہُوئے زخم چاٹ رہا ہے بھوٹان سہما ہُوا اور پاکستان خطرات کی زد میں ہے ـــــ اور وزیرِاعظم راجیو گاندھی کا سیاسی قد اُن کے جسمانی قد کے مقابلے میں ابھی چھوٹا ہے۔ اُنہیں وہ مقام حاصل نہیں جو اُن کی ماتا اور اُن کے نانا کو حاصل تھا۔ عالمی لیڈر بھارت کو تو وزن دیتے ہیں مگر وزیرِاعظم کو کسی قدر ناتجربے کار سمجھتے ہیں، اس لیے وہ کوئی بڑا بحران پیدا کر کے اُس پر قابو پانے کی پوزیشن میں نہ ہوں گے۔

ہمیں راجیو گاندھی کی سیاسی ناپختگی ہی سے خوف آ رہا ہے۔ ایک ناپختہ ذہن منچلے پن میں کوئی بھی قدم اُٹھا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے راجیو گاندھی نے اپنے چاروں طرف ایسے افراد جمع کر لیے ہیں جو پاکستان کے شدید مخالف ہیں۔ وہ یقیناً راجیو کو یلغار پر اُکساتے رہتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بھارتی فوج کے اندر بھی عقاب موجود ہیں۔ دانشوروں میں بھی ایک ایسا عنصر پایا جاتا ہے جو اپنی تاریخ کا انتقام پاکستان سے لینا چاہتا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں بھارت سنجیدہ لوگوں سے خالی نہیں ہُوا۔ عوام جنگ میں جھلسنا نہیں چاہتے۔ اُن کا مفاد تو اسی میں ہے کہ بھارت اور پاکستان اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں۔

اور ہمیں اصل خطرہ اپنی ہی طرف سے ہے۔

دُشمن کا رول ہم خود ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے تہیّہ کر رکھا ہے کہ جو حکومت قائم ہے اُس کی بُنیادیں ہلاتے رہیں گے اور اُس کا اعتبار اور اعتماد مستحکم نہ ہونے دیں گے۔ کوئی سیاسی نظام چلنے نہیں دیں گے اور جمہوری اداروں کو پنپنے کے مواقع مہیا نہیں کریں گے۔ حکومت نے حتمی فیصلہ کر رکھا ہے کہ باصلاحیت افراد کو اپنے قریب نہ آنے دیں گے اور وقت گزاری کے لیے کچّے پکّے کام کرتے رہیں گے۔ انتظامیہ نے اپنے اُوپر کے افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی پالیسی اپنائی ہے اور عوام کو ایک فاصلے پر رکھنے کا عہد کر رکھا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ نے اپنے ہاتھوں سے درس گاہیں اُجاڑنے کا عزم کر لیا ہے۔ عوامی نمائندوں کی بھاری اکثریت نے زیادہ سے زیادہ مراعات اور مفادات حاصل کرنے کی روش اختیار کر لی ہے خواہ اس میں عزّتِ سادات ہی جاتی رہے۔

سیاسی جماعتوں کا تمام تر پروگرام حکومت پر برسنا، عوام کے حقوق کا ذکر کرنا اور ہر روز اخبارات میں ایک بیان شائع کرا دینا ہے یا پھر نفرتوں اور تعصبات کو بھڑکاتے رہنا یا معاشرے میں بے چینی اور بے یقینی کو فروغ دینا ہے۔ ہمارے بیشتر وزرا ضابطوں اور قاعدوں اور اعلیٰ روایات کی توڑ پھوڑ میں لگے ہُوئے ہیں۔ وطن کی فکر اُنہیں کسی طور لاحق نہیں۔ حکومت کے اندر اس قدر تضاد اور تصادم ہے کہ قومی زندگی کا ایک مربُوط نقشہ اُبھرتا ہی نہیں۔

ہمارے پاس جو تھا وہ لُٹا دیا ـــــ اور جو ہے اُسے بے دردی سے مسمار کیے چلے جا رہے ہیں۔ شخصیات، ادارے، نظام ہر شے منہدم ہو رہی ہے اور تعمیر کا عمل بے حد سُست اور بکھرا بکھرا سا ہے۔ ہم اگر باہر کا جھٹکا سہہ گئے تو شاید ہماری اجتماعی قُوّتِ ارادی خودی کی سان پر تیغِ آبدار ہو جائے اور ہمارے اندر سے طاقت کا ایک نیا چشمہ پھُوٹ پڑے ـــــ اور ہمیں نعمتوں کی پہچان ہو جائے ـــــ شاید پھر ہم اپنی آزادی اور اپنے وطن سے والہانہ محبّت کرنے لگیں اور اپنے آپ کو دریافت کر لیں اور ہر خطرے سے آزاد ہو جائیں۔ ■■

حکومت صوبہ سرحد

ڈائریکٹوریٹ آف انڈسٹریز، کامرس اینڈ منرل ڈویلپمنٹ

(سپلائی ونگ) پشاور

ٹنڈر نوٹس

نمبر شمار	ٹنڈر انکوائری نمبر	سٹور کی نوعیت مختصراً	ٹنڈر کھلنے کی تاریخ	ٹنڈر فیس
۱	FE/۷۴/-۳/۱۵۷۳/A	ریشم کے کیڑے کے انڈے	۱۰-۱۲-۸۶	۴۰/- روپے

مقابل دی گئی ٹنڈر کھلنے کی تاریخ کو ٹنڈرز صبح ۳۰-۱۰ بجے تک دفتر ہٰذا میں پہنچ جائیں۔ ٹنڈرز مقررہ تاریخ کو ۰۰-۱۱ بجے ٹنڈر کھلنے کے وقت موجود رہنے کے خواہش مند ٹنڈر دہندگان کے سامنے کھولے جائیں گے۔ ٹنڈرز لازماً مجوزہ فارمز پر داخل کیے جائیں جو کیشیئر، ڈائریکٹوریٹ آف انڈسٹریز، کامرس اینڈ منرل ڈویلپمنٹ (سپلائی ونگ) حکومت صوبہ سرحد پشاور سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ٹنڈر فیس ناقابلِ واپسی ہوگی۔ ڈاک کے ٹکٹ اور پوسٹل آرڈرز ٹنڈر فیس کے طور پر قبول نہیں کیے جائیں گے۔ پشاور سے باہر کے ٹنڈر دہندگان ٹنڈر انکوائری حاصل کرنے کے لیے ٹنڈر فیس صرف منی آرڈر کے ذریعے بھیجیں جس پر ٹنڈر نمبر، تاریخ اور پتہ واضح طور پر لکھا ہو۔

دستخط

(اخون زادہ انور سعید)
اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سپلائی)
برائے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز، کامرس اینڈ منرل
ڈویلپمنٹ، صوبہ سرحد، پشاور

آئی این ایف (پی) ۳۱۵۲

لندن نامہ

انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کے نئے مسائل اور جوان نسل کے نئے رجحانات

محسنہ جیلانی

برطانیہ میں ایسا لگتا ہے کہ انصاف کی قدریں بدل رہی ہیں۔ ایک زمانے میں برطانوی عدلیہ کو اپنے اُوپر ناز تھا کہ وہ انصاف کی اعلیٰ ترین قدروں کی علمبردار ہے اور ساری مہذّب دُنیا کے لیے ایک مثال ہے۔ عدل گستری میں نہ تو اُس پر کوئی سیاسی، نسلی یا معاشرتی دباؤ ہے اور نہ کسی قسم کی مصلحت درپیش ہوتی ہے ــــ لیکن پچھلے دنوں برطانوی عدالتوں نے جو فیصلے کیے، اُن پر باشعور افراد کا ماتھا ٹھنکا ہے۔ اُردن کے ایک عرب نزار ہنداوی کو جس کے پاس شام کا پاسپورٹ تھا، لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈّے پر اسرائیلی ایئر لائن اَل ایل کے طیارے میں بم رکھنے کے الزام میں ایک برطانوی عدالت نے ۴۵ سال قید کی سزا دی ہے۔ نزار ہنداوی پر الزام تھا کہ اُس نے اپنی ایک آئرش دوست لڑکی کو جسے وہ اَل ایل طیّارے کے ذریعے اسرائیل بھیج رہا تھا، ایک ہینڈ بیگ دیا جس میں تباہ کُن ٹائم بم رکھا تھا۔ ہیتھرو ہوائی اڈّے کے سیکیورٹی حُکّام اس بم کا پتہ نہ چلا سکے، البتہ اَل ایل کے اسرائیلی محافظوں نے اس بم کا سُراغ لگا لیا۔ نزار ہنداوی کے اس جُرم کی بُنیاد پر برطانوی حکومت نے شام سے سفارتی تعلّقات منقطع کر لیے ہیں اور وہ امریکہ اور مغربی یورپ کے ملکوں سے بھی شام کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کر رہی ہے ــــ ویسے اب فرانسیسی وزیرِ اعظم ژاک شیراک کے انٹرویو کے بعد یہ انکشاف ہُوا ہے کہ نزار ہنداوی کا پُورا معاملہ دراصل، اسرائیلی خُفیہ انٹیلی جنس مُسّاد کی سازش تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نزار ہنداوی کو مُسّاد نے شام کو ملوّث کرنے اور شام کے خلاف امریکہ اور مغربی ملکوں کو سخت اقدام پر اُکسانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

اگر یہ انکشاف صحیح ہے تو پھر اس سے برطانوی عدلیہ پر حرف آتا ہے کہ وہ نزار ہنداوی کے معاملے کی تہ تک نہ پہنچ سکی اور بڑی آسانی سے اسرائیلی مُسّاد کی سازش کا ایک فریق بن گئی۔ اس کے علاوہ ایک یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ ایک طرف نزار ہنداوی کو جس پر صرف بم رکھنے کی سازش کا محض الزام تھا اور کسی کو ذرہ برابر گزند نہیں پہنچی تھی، ۴۵ سال قید کی سزا دی گئی۔ اس کے مقابلے میں ایک انگریز نوجوان کو جس پر اپنے والدین، اپنی بہن اور اُس کے دو بچّوں کو قتل کرنے کا الزام تھا، صرف ۲۵ سال سزا سُنائی گئی، یعنی ۵ افراد کو قتل کرنے کی سزا صرف ۲۵ سال! اور ڈیوک آف مارلبرو کے ۳۰ سالہ بیٹے کو جس کے خلاف کوکین رکھنے کا سنگین الزام تھا، صرف دو سال قید کی سزا ملی اور وہ بھی عدالت نے معطّل کر دی اور اُسے

جیل نہیں بھیجا گیا۔ ۲۰ سالہ مارکی آف بلنسیہ فورٹ کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ ہر ہفتے کوکین پر ایک ہزار پونڈ خرچ کرتا تھا۔ اس وقت جبکہ پُورے ملک میں منشیات کی وبا کے خلاف زبردست مُہم جاری ہے، بہت سے لوگوں کو اس بات پر تعجّب ہُوا کہ عدالت نے لارڈ مارلبرو کے بیٹے کے ساتھ اس قدر نرمی کیوں برتی ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ ڈیوک کا بیٹا ہے اور ساٹھ کروڑ پونڈ کی جائیداد کا وارث ہے؟ کیا یہ وجہ ہے کہ شاہی خاندان سے اُس کے قریبی تعلقات ہیں؟ کیا برطانیہ عظمیٰ اب انصاف کے سلسلے میں بھی امیری اور غریبی کا فرق مدِّنظر رکھتا ہے؟ یہ سوالات ایسے ہیں جن کا خاطر خواہ جواب کہیں سے نہیں ملتا؛ چنانچہ برطانوی عدلیہ کے انصاف کے اُصولوں اور اُس کی قدروں پر شکوک و شبہات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

پچھلے دنوں، دارالعوام نے جنسیات کی تعلیم کا مسوّدۂ قانون منظور کیا ہے جس کے تحت ملک کے اسکولوں میں بچّوں کو لازمی طور پر جنسیات کی تعلیم دی جائے گی اور والدین کو اس بات کا حق نہیں ہو گا کہ وہ اپنے بچّوں کو اس تعلیم سے مستثنیٰ رکھ سکیں۔ جس وقت یہ مسوّدۂ قانون پارلیمنٹ میں زیرِ غور تھا اُس وقت اس کے مضمرات کا برطانیہ کے مسلمانوں کو پُوری طرح علم نہ ہو سکا؛ تاہم اب قانون کے خلاف مُہم زور پکڑ رہی ہے جس میں ۴۶ اراکینِ پارلیمنٹ بھی شامل ہیں جنھوں نے اس بِل کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسکولوں میں جنسیات کی تعلیم کا بچّوں کے اذہان اور اُن کے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔

لندن کی مرکزی مسجد اور اسلامک کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر الغمادی نے اس قانون کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ اسلام، شادی اور خاندان کے بارے میں صحّت مند اصول پیش کرتا ہے۔ نازیبا باتوں سے معاشرے کو بچانے کے لیے سخت اور مؤثر اقدامات کا حامی ہے۔ ان اعلیٰ تصورات کے بالکل برعکس جنسیات کی تعلیم کے نام سے بے راہ روی اور ہم جنس پرستی کو شہ دی جا رہی ہے۔ اس تعلیم کو مسلمان کسی طور بھی تعلیم نہیں سمجھتے اور نہ اسے تسلیم کر سکتے ہیں۔

لسٹر کے اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر لمناظر احسن نے خبردار کیا ہے کہ اگر مسلمان بچّوں کو خُرافات سے مستثنیٰ قرار نہ دیا گیا تو ہم ہر ممکن جائز طریقہ اختیار کریں گے۔ ہمارے بچّوں کے لیے اس قسم کی تعلیم بالکل غیر ضروری ہے۔

برطانیہ کی جمعیتِ اہلِ حدیث کے صدر اور صراطِ مستقیم رسالے کے ایڈیٹر مولانا محمد احمد میرپوری نے کہا ہے کہ اس ملک کی اکثریّت اپنے بچّوں کو گھروں میں تربیت دینے میں ناکام رہی، اسی لیے خاندان کا تصوّر ختم ہوتا جا رہا ہے اور طلاقوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا یہ حل تو نہیں کہ اُنھیں جنسیات کی تعلیم دی جائے۔ مسلمانوں کو اس قسم کے مسئلے کا سامنا نہیں۔

بلا سُود اسلامی بینکاری کے بارے میں مغربی ملکوں میں جو شکوک و شُبہات پائے جاتے تھے وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں اور اب یہ نظام مغربی انداز کی سُودی بینکاری میں برداشت کیا جا رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت پُوری دُنیا میں اسلامی بینکاری کے تحت ۱۵۰ ارب ڈالر کا انصرام کیا جا رہا ہے۔ حال میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی ایک داخلی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اسلامی بینکاری کا نظام سنگین مالی بُحران کا دھچکا برداشت کرنے کا مغربی بینکاری نظام سے کہیں زیادہ اہل ہے۔ مالی ماہرین اب اس بات کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ اس وقت مغربی ملکوں کی معیشتیں کساد بازاری کا سامنا کر رہی ہیں اور اسلامی بینکاری، اقتصادی ترقی اور فروغ میں ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے کیونکہ اس کا تمام تر زور پیداواری سرمایہ کاری پر ہے۔ اس وقت بہت زیادہ شرحِ سُود پیداواری سرمایہ کاری میں حائل ہو رہی ہے۔ مغربی مُلکوں میں سرمائے کی بہتات ہے لیکن اس پر سُود اس قدر زیادہ ہے کہ چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کے لیے قرضے بہت مہنگے پڑ رہے ہیں، لہٰذا سرمائے کی بہتات

کے باوجود وہ صنعتوں میں لگ نہیں رہا۔ نتیجہ یہ کہ پیداوار میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود بڑے بڑے بینکوں اور مالیاتی پالیسی کے اداروں کی طرف سے اسلامی بینکاری کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مخالفت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس نظام کے ساتھ اسلام کا نام وابستہ ہے۔ مالیاتی ادارے نہیں چاہتے کہ اسلام کا بینکاری نظام کامیاب ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انھیں ڈر ہے کہ مسلم مُلکوں سے جمع شدہ رقوم بڑے پیمانے پر مغربی ملکوں سے اسلامی ملکوں میں منتقل ہونے لگیں گی۔

برطانیہ میں سب سے زیادہ مخالفت بینک آف انگلینڈ کے گورنر، رابن لی پیمبرٹن کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ برطانیہ میں ۱۹۷۹ء سے، بینکاری قانون کے تحت، بینک میں جمع کی جانے والی رقم ایک متعین رقم کی حیثیت سے جمع کی جاتی ہے جس کی اُتنی ہی مالیت کی واپسی لازم ہے اور چونکہ اسلامی بینکاری نظام کے تحت بینک میں جمع کردہ رقم کی مالیت کا تعین نفع اور نقصان کی بُنیاد پر ہوتا ہے اس لیے بینکاری قانون کے تحت یہ اصول تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ان بے شمار مزاحمتوں کے باوجود برطانیہ میں متعدد اسلامی بینک کام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر البرکہ بینک ہے جو طویل المیعاد منصوبوں میں سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ اسی طرح دارالمال اسلامی، جس کے صدر دفاتر جنیوا میں ہیں، برطانیہ میں سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ امریکہ میں امانہ اسلامی فنڈ نے اگلے سال اسلامی بینکاری شروع کرنے کے لیے حکومت سے اجازت مانگی ہے۔

مغربی ملکوں کے علاوہ مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں میں بھی پچھلے سال اسلامی بینکوں نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔ ان ملکوں میں ہنگری، یوگوسلاویہ اور چیکوسلاویکیہ شامل ہیں۔ سنٹرل بینک اسلامی بینکوں کی ضمانتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چین میں بھی اب اسلامی بینک شروع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ یُوں اسلامی بینکاری نظام کے لیے یہ مرحلہ زبردست آزمائش کا ہے کہ اسے اپنے ٹھوس مالی اصولوں کو عہدِ حاضر میں سُود مند ثابت کرنا ہے۔

بیمۂ زندگی
کے میدان میں

اسٹیٹ لائف
علّامہ اقبالؔ
کے مقاصد کی
تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے

شاعر، عالم، مفکّر ہونے کے ساتھ، علامہ اقبالؔ کے بہت سے امتیازات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ماہرِ اقتصادیات بھی تھے، جنہیں اپنی قوم کی معاشی فلاح و بہبود دل سے عزیز رہی۔ اردو میں "علم الاقتصاد" پر پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں اُنہی کے قلم سے ظہور میں آئی تھی۔ اقتصادیات کے ماہر کی حیثیت سے انہیں بیمۂ زندگی کی قدر و قیمت کا بھی پورا شعور تھا۔ وہ مسلم انڈیا انشورنس کمپنی کے بانی چیئرمین تھے جو ۱۹۳۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ وہ اس کے انتظامی بورڈ پر بھی رہے۔ بیمۂ زندگی کی دستاویزات پر ڈائریکٹر کی حیثیت سے اُن کے دستخط ثبت ہوتے تھے۔

اسٹیٹ لائف
انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

کوئی گیارہ بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ لندن میں ایک ممتاز پاکستانی ادریس رحمان صاحب نے اپنے ہی گھر میں مسلمان بچّوں کے لیے ایک چھوٹے سے اسلامی اسکول کا اہتمام کیا تھا۔

جُوں جُوں پاکستانیوں میں اپنے بچّوں کو اسلامی تعلیم دینے کا شعور جاگتا گیا تُوں تُوں مسلمان بچّوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس چھوٹے سے اسکول کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر یہ اسکول نارتھ لندن مسلم ایسوسی ایشن میں مدغم کر دیا گیا۔ حالت یہ تھی کہ ماں باپ کبھی مالی اعانت کرتے اور کبھی بند کر دیتے کہ پیسے لے کر دینی تعلیم دلوانا کہاں کی تُک ہے۔

جیسے تیسے اسکول چلتا رہا۔ اب وہ ننھا سا پودا جو دس برس پہلے سرزمینِ انگلستان میں اُگا تھا، مخالف ہوا اور نامناسب موسم کے باوجود ایک نوعمر شجر کی طرح سر اُٹھائے کھڑا ہے۔ اس اسکول میں تقریباً دو سو مسلمان بچّے ہر اتوار کو جمع ہوتے ہیں اور اسلامی تعلیم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس پودے کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے دن رات محنت کی اُن میں ادریس رحمان، یوسف اسلام، عبدالقادر قریشی، احمد لقمانی، عبداللہ خان اور بیگم رضیہ علی کے نام ممتاز نظر آتے ہیں۔

ابھی تک تو یہ اسکول ہر اتوار کو شمالی لندن کے ایک سکنڈری اسکول میں لگایا جا رہا ہے۔ کرایہ اسکول کے ذمے ہوتا ہے۔ بچّوں کی بڑھتی ہُوئی تعداد اور پھر شمالی لندن میں مسلمانوں کی دوسری معاشرتی ضروریات کے تحت اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلامی اسکول کے لیے اپنی عمارت ہو۔

شمالی لندن میں ایک مسجد اور اسلامک سنٹر کی تعمیر میں مالی امداد فراہم کرنے کے لیے ان خواتین نے ایک بازار لگانے کا اہتمام کیا ہے جو اس اسلامی اسکول سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہی ہیں۔ ’یہ مسجد بازار‘ ریجنٹ پارک کی مرکزی مسجد میں ۸ نومبر کو بڑی شان و شوکت سے لگایا گیا۔ اس کی تیاری میں شمالی لندن کی خواتین کی ایک بڑی تعداد مہینوں سے مشغول تھی۔ گھر پر جوڑے سیے گئے۔ ہاتھ سے کروشیا، سلائی، بُنائی اور کھلونے بنانے سے بیڈ رُوم کے لوازمات تک کی تیاری ہوتی رہی۔ مرکزی مسجد کے بیس منٹ میں تقریباً بیس کے لگ بھگ اسٹال لگائے گئے تھے۔ ہر چیز وہاں موجود تھی۔ اہلِ دل اور اہلِ خیر حضرات نے بڑھ چڑھ کر عطیات دیے تھے۔ خواتین گھروں سے مختلف کھانے پینے کی چیزیں پکا، بنا کر لائی تھیں۔ کھانے پینے کے اسٹال آن کی آن میں ختم ہو گئے۔ یہ دیکھ کر بڑا حوصلہ اور خوشی ہُوئی کہ کتابوں کے اسٹال پر پاکستانی بچّوں کا اِزدحام تھا۔ قرآنِ پاک کے نسخے بچّوں نے بڑی محبّت اور چاہت سے لیے۔ یہ ایک بڑا ہی خوش نگاہ اور صحت مند منظر تھا۔ اس بازار سے مسجد کے لیے فنڈ جمع کرنا تو بنیادی بات رہی لیکن ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ برطانیہ کی نئی نسل اور ننھے مُنّے بچّوں کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔

سفیرِ پاکستان جناب علی ارشد اور بیگم علی ارشد نے اس بازار کا افتتاح کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہُوئے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے بازار گاہے گاہے لگتے رہیں تاکہ ایک دوسرے سے ملنے ملانے کا موقع بھی ملے اور نئی نسل بھی ایسے کارِ خیر میں حصّہ لینے میں خوشی محسوس کرے۔

شمالی لندن میں نئی مسجد اور اسلامک سنٹر کے لیے ویئر ہاؤس خریدا جا رہا ہے اس کی قیمت اور اخراجات لاکھوں پونڈ کے لگ بھگ ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے اگر صرف ۲۰۰ صاحبِ دل، صاحبِ خیر مسلم حضرات آگے بڑھیں اور ایک ایک ہزار پونڈ عطا کریں تو یہ بڑا سنگین مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اب دیکھیے کون آگے آتا ہے! بہرحال اس بازار سے تقریباً ۱۲ ہزار پونڈ کی آمدنی ہُوئی جو بعض خواتین کے لیے ناقابلِ یقین رہی۔ اس بازار کی رُوحِ رواں اور چیئرمین بیگم زینب غفار ہیں جنھوں نے شمالی لندن کی تمام خواتین ایک پلیٹ فارم پر جمع کیں اور اس بازار کا اہتمام کیا۔

بیگم زینب غفار کا کہنا ہے کہ وہ ایسے ہی ایک اور بازار کا اہتمام کریں گی اور پورے ۲۰ ہزار پونڈ جمع کر کے اسلامک سنٹر کے لیے خواتین کی طرف سے عطیہ دیں گی۔ مسلم خواتین کا یہ حوصلہ اور جذبہ بڑا ہی ایمان افروز اور دلکش ہے۔ ■■

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بے اختیار ایمان لانے والی اور اُن پر والہانہ جان چھڑکنے والی خاتون جنہیں مسلمانوں کی عظیم ترین ماں ہونے کی سعادت حاصل ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

حافظ افروغ حسن

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

- طبقات ابنِ سعد • الکامل (ابنِ اثیر) • سیرۃ النبیؐ (شبلی نعمانی) • رحمۃ للعالمین
- تفہیم القرآن • سیرتِ سرورِ عالم (سید مودودیؒ) • سیرۃ الرسولؐ (ڈاکٹر محمد حسین ہیکل)
- محمدؐ (محمد رضا مصری) • تذکارِ صحابیاتؓ (طالب ہاشمی) • خدیجہؓ (عبدالحمید الزہراوی)

Pakistanipoint Waqar Azeem

”خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رُسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ آپ کے اخلاق کریمانہ ہیں۔“

یہ الفاظ اپنے ادا کرنے والے کی شخصیت و سیرت، طرزِ فکر، تصورِ اخلاق، اندازِ معاشرت اور اُس کی رُوحانی عظمت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ سخت پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں یہ الفاظ صرف اُسی کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جس کا پختہ یقین ہو کہ اس کائنات کا فرمانروا اور مدبّر ایک ایسی بااختیار ہستی ہے جس کی صفتِ رحمت اُس کی تمام صفات پر غالب اور جس کی نگاہ میں انسان دوستی، خدمتِ خلق، صلہ رحمی، ناداروں اور بے سہاروں کی پرورش، کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت اور مہمانوں کی تواضع اور دلجوئی جیسی صفات پسندیدہ اور قابلِ ستائش ہیں۔ یہ الفاظ بے ساختہ صرف ایسی ہی شخصیت کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کی سیرت اور اُس کے عادات و اطوار ایسے ہی بلند پایہ کریمانہ اخلاق کے سانچے میں ڈھلے ہُوئے ہوں اور اُن کی قدر و منزلت اور اہمیت و عظمت اُس کے قلب و رُوح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکی ہو۔

یہ ہیں تمام اہلِ ایمان کی وہ بزرگ ترین ماں جس نے فہم و فراست، تدبّر و حکمت، ایثار و قربانی، محبّت و وفاشعاری، خدمت و اطاعت، سلیقہ شعاری و معاملہ فہمی اور ہمدردی و دلسوزی کے وہ روشن مینار قائم کیے جن کی نُورانی شعاعوں سے رہتی دُنیا تک پوری انسانیت جگمگاتی رہے گی۔

اس عظیم ترین ماں نے اپنی سیرت و کردار کی پاکیزگی، حوصلہ کی بلندی، بے مثل عزیمت و استقامت اور بے بدل جرأت و ہمّت کی بدولت طبقۂ اناث کو وہ اعزاز و شرف عطا فرمایا کہ اسے ذلّت و خواری اور بےکسی و بےبسی کے اسفل السافلین سے اُٹھا کر ادب و احترام اور عزّت و وقار کے اوجِ ثریّا تک پہنچا دیا۔ اب اس صنفِ نازک سے تعلّق رکھنے والی ہر سلیم الفطرت خاتون فخر

کے ساتھ سر بلند کر کے کہہ سکتی ہے کہ "ہمارا تعلق اُس طبقے سے ہے جس کی امام اور سرخیل سیدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں اور ہمیں اس امر پر ناز ہے کہ ہم اُن کی رُوحانی بیٹیاں ہیں"۔

سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ بنتِ خویلد بن اسد قبیلہ قریش کی ایک نہایت معزز اور باوجاہت شاخ بنی اسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خاندان اپنی شرافت و نجابت اور کاروباری معاملات میں اپنی ایمانداری اور راست روی سے عزت و شہرت کے بلند مقام پر فائز تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنتِ زائدہ تھا۔

اہلِ مکہ کا حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے زمانہ ہی سے سب سے اہم ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ قریش کے تجارتی تعلقات اندرونِ عرب اور بیرونِ ملک بڑے وسیع اور مستحکم تھے۔ سیدہ خدیجہؓ کے والد خویلد عرب کے مشہور تاجر اور قریش میں معزز اور نامور تھے۔ دولت و ثروت اُن کے گھر کی کنیز تھی۔ سیدہ موصوفہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں شرافت، دیانت و امانت اور ایفائے عہد اور احساسِ ذمّے داری کی اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ دولت کی ریل پیل تھی۔ ان اخلاقی خوبیوں، مادی فراوانیوں اور گھر کی تربیت اور ماحول نے ابتدائے زندگی ہی سے جُود و کرم، عطا و سخا، غریب پروری و مسکین نوازی اور فراخ دلی و عالی حوصلگی جیسی اعلیٰ صفات کو اُن کی طبیعت و فطرت کا لازمی حصّہ بنا دیا تھا۔

حضرت قتادہؓ کے قول کے مطابق حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی عتیق بن عابد مخزومی سے ہُوئی جس سے کوئی اولاد نہ ہُوئی۔ اس کے انتقال کے بعد آپ کی دوسری شادی ابوہالہ ہند بن نباش تمیمی سے ہُوئی جن سے تین لڑکے ہند، ہالہ اور طاہر پیدا ہُوئے۔ کچھ عرصے کے بعد ابوہالہ بھی اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

اس دوسرے شوہر کی وفات کے بعد سیدہ خدیجہؓ نے اپنی تمام تر دلچسپیوں اور توجّہات کا مرکز اپنے تجارتی کاروبار کو بنا لیا۔

سیدہ محترمہ اپنی عفت و حیا، پاکیزہ سیرت اور طبیعت کی شرافت کی وجہ سے قریش میں طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، پُورے قبیلے میں اُن کی دانائی اور اُن کے اخلاقی اوصاف کے باعث اُن کا بے حد احترام کیا جاتا۔ اس کے ساتھ خالقِ کائنات نے اُن کو حُسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ قریش کی کوئی عورت اور کوئی مرد اُن سے زیادہ مالدار نہ تھا۔ ابنِ سعد کے بیان کے مطابق قریش کا تجارتی قافلہ جب مکّے سے روانہ ہوتا تو اُس میں آدھے سے زیادہ سامان سیدہ خدیجہؓ کا ہوتا۔

سیدہ طاہرہ خدیجہؓ اب بیوہ تھیں۔ اب اُن کا انہماک اپنے کاروبار کی طرف تھا۔ وہ کسی مرد کو اپنا سامانِ تجارت مقررہ اُجرت پر یا مضاربت کے اُصول کے تحت حصّے پر دے دیتیں۔ اس مقصد کے لیے اُنہیں ہر وقت ایسے شخص کی تلاش رہتی جو شریف النفس ہو، صادق القول ہو جس کی امانت و دیانت پر بھروسہ کیا جا سکے۔

اسی شہر مکّے میں ایک نوجوان ہے جس کا تعلق قبیلہ قریش کے معزز ترین خاندان بنی ہاشم سے ہے۔ وہ آغازِ جوانی ہی سے اپنے چچا سردارِ مکّہ ابوطالب کے تجارتی کاروبار میں بطور مددگار فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس مقصد کی خاطر وہ کئی تجارتی سفر بھی کر چکا ہے۔ اُس کے سب ساتھی اُس کی ہوشمندی اور معاملے کی صفائی کے معترف ہیں۔ اُس کی صداقت و دیانت کے چرچے عام ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ شہرت اپنا حلقہ وسیع کرتی جاتی ہے۔ ابھی اس جوانِ دلربا نے اپنی عُمر کی پچیسویں منزل میں قدم رکھا ہے کہ اُس کی قوم یعنی قبیلہ قریش پر اُس کی شرافت، دیانت و امانت، صداقت شعاری، نیک نفسی، حُسنِ اخلاق، سنجیدگی و دانشمندی، ضبطِ نفس اور حلم و وقار اور سردارانہ شان کی خوبیاں نمایاں ہونے لگیں۔ اُس کا غیر معمولی احترام، اعتماد اور اثر و نفوذ لوگوں میں قائم ہوتا چلا گیا۔ یہ جوان جس کا مردانہ حُسن دلکش مگر پُر رعب تھا اور جس کی جوانی ہر قسم کے داغ سے پاک تھی، محمّد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تھا۔

ابنِ سعد نے طبقات میں محمّد بن عقیل کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوطالب نے حضرت خدیجہؓ سے جا کر کہا کہ اے خدیجہؓ! کیا تم یہ پسند کرو گی کہ اپنی تجارت کے لیے کسی اور کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے معاملہ کر لو۔ اُنہوں نے جواب دیا آپ اگر کسی دُور کے ناپسندیدہ آدمی کے لیے بھی فرماتے تو میں مان لیتی۔ آپ تو اُس شخص کے لیے کہہ رہے ہیں جو بہت قریبی ہے۔

علامہ ابنِ اثیر نے اپنی 'الکامل' میں بیان کیا ہے کہ جب سیدہ [illegible] کو آنحضور کے اخلاق و کردار کے متعلق معلوم ہُوا تو اُنہوں نے کسی ایک آدمی کے ذریعے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا سامانِ تجارت لے کر شام کی طرف تشریف لے جائیں تو میں دوسروں [illegible] آپ کو دوگنا معاوضہ دوں گی۔ آپ نے سیدہ خدیجہؓ کی یہ پیشکش قبول کر لی۔

ہمارے نزدیک ابنِ اثیر کی روایت زیادہ قابلِ قبول اور [illegible] ہے۔ سیدہ طاہرہ خدیجہؓ رشتے میں آپ کی چچازاد بہن تھیں۔ [illegible] قریبی تعلق کے ہوتے ہُوئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے حالات و واقعات اور آپ کی شہرت سے ناواقف اور اپنے کاروبار کی ترقی و فروغ کے لیے آپ کی خدمات حاصل [illegible] کی خواہاں اور اس کے لیے کوشاں نہ ہوں۔

علامہ ابنِ اثیر نے آنحضورؐ کے اس تجارتی سفر کی روئیداد [illegible] تفصیل سے بیان کی ہے جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

آنحضور (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سیدہ خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے ساتھ سامانِ تجارت لے کر شام کی طرف روانہ ہُوئے۔ آپ کے چچا ابوطالب نے قافلے والوں کو آپ کے خیال و نگہداشت کی [illegible] اور تاکید کر دی تھی۔ بالآخر آپ شام میں بمقام بصریٰ [illegible] ہُوئے اور ایک درخت کے زیرِ سایہ آرام پذیر ہُوئے۔ [illegible] ایک صومعہ تھا جس میں نسطورا نامی راہب عبادت میں مصروف رہتا۔ راہب نے کھڑکی سے سر نکالا اور جُھک کر میسرہ سے پوچھا: "درخت کے سائے میں یہ کون صاحب آرام فرما ہیں؟" میسرہ نے جواب دیا: "یہ قریشی ہیں۔" راہب نے پھر دریافت کیا: "کیا اس کی آنکھوں میں سُرخی ہے؟" میسرہ نے کہا: "ہاں! اور وہ سُرخی کبھی دُور نہیں ہُوئی۔" یہ سُن کر راہب بولا: "بلاشُبہہ یہ نبی ہے اور آخری نبی ــ کیونکہ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی نہیں اُترا۔"

راستے میں میسرہ دیکھتا جاتا تھا کہ جب دوپہر کے وقت گرمی شدت ہوتی تو دو فرشتے آپ پر سایہ کیے رہتے۔ میسرہ یہ سب باتیں اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ سامانِ تجارت فروخت ہُوا جس میں خلافِ توقع بہت زیادہ نفع ہُوا۔ جب آپ واپس مکّے تشریف لائے تو میسرہ نے وہ تمام باتیں جو دیکھی اور سُنی تھیں سیدہ خدیجہؓ سے بیان کیں۔ جب سیدہ خدیجہؓ نے دیکھا کہ اُن کے کاروبار میں بہت زیادہ نفع ہُوا ہے تو اُنہوں نے آپ کو متعین شدہ اُجرت سے دُگنی رقم دی۔

حافظ ابونعیم اصفہانی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ شام کے سفر سے جب یہ قافلہ مکّے پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ سیدہ خدیجہؓ اُس وقت اپنے گھر کی بالائی منزل پر تھیں۔ اُنہوں نے بھی دیکھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے اونٹ پر سوار چلے آ رہے ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ کیے ہُوئے ہیں۔

ابنِ اثیر کے قول کے مطابق قریش کا ہر وہ شخص جو نکاح کے قابل تھا، سیدہ طاہرہ خدیجہؓ سے نکاح کا خواہشمند تھا۔ مکّے کے اکثر نامور اور بااثر سرداروں نے اپنی اس خواہش کو باضابطہ طور پر آپ کی خدمت میں پہنچایا بھی لیکن آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ عُمر کی پختگی، ذہن و شعور کی پاکیزگی اور اخلاق و رُوح کی بلندی نے اب آپ کے سامنے انسانیت کا جو بلند معیار قائم کر دیا تھا، وہ ان رؤسائے قریش میں مفقود تھا لیکن جب محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم، جو اپنی قوم میں صادق اور امین کے القابات و خطابات سے معروف و مشہور تھے، کی مبارک، دل پسند اور مقدّس صورت سیدہ موصوفہ کے مشاہدے میں آئی تو وہ پہلی نظر ہی میں پہچان گئیں کہ یہ ہے میرا گوہرِ مقصود و مطلوب؛ چنانچہ اُنھوں نے آپ کے ساتھ نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا ــــــــ علّامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق اُس وقت کے عرب معاشرے میں عورت اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کرنے کی مجاز تھی خواہ وہ بالغہ ہو یا نابالغہ، بیوہ ہو یا باکرہ۔ اس لیے سیدہ نے یہ اہم معاملہ فوری طور پر خود ہی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم بالجزم کر لیا۔

ابنِ سعد کی روایت کے مطابق سیدہ موصوفہ نے اپنی قابلِ اعتماد سہیلی نفیسہ کو آپ کی رائے معلوم کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں بھیجا۔ نفیسہ اور آپ کے درمیان جو گفتگو ہُوئی، وہ کچھ اس طرح ہے:

نفیسہ: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

محمد: (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے پاس رکھا ہی کیا ہے جو میں شادی کروں۔

نفیسہ: اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ آپ کو ایسی جگہ شادی کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے جہاں جمال بھی ہے اور مال بھی، شرف بھی ہے اور قابلیت بھی۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے؟

محمد: (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ کون ہے؟

نفیسہ: وہ ہے میری قابلِ احترام سہیلی خدیجہ۔

محمد: (صلی اللہ علیہ وسلم) میری اُن سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟

نفیسہ: اسے آپ میرے اُوپر چھوڑ دیں۔

محمد: (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہُوں۔

ابنِ سعد کی مذکورہ بالا روایت کے ساتھ ساتھ ابنِ اسحٰق کی وہ روایت جسے ابنِ ہشام نے نقل کیا ہے صورتِ حال اور معاملے کی نوعیّت اور سیّدہ خدیجہؓ کی قلبی کیفیّت کو واضح کرنے کے لیے بڑی مفید اور مددگار ہے۔ اس روایت کے مطابق سیّدہ خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے براہِ راست بات کی اور کہا: "اے ابنِ عم! آپ سے میری رشتے داری بھی ہے اور میں آپ کی امانت و صداقت، حُسنِ خُلق و شرافتِ نسبی اور اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بھی یہ چاہتی ہُوں کہ آپ سے شادی کر لوں۔"

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اُس دَور میں پردے کا رواج نہ تھا۔ عورتوں کا مردوں کے ساتھ براہِ راست بات چیت کرنا کوئی اخلاقی اور معاشرتی بُرائی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ باہمی رضامندی کے مراحل طے ہو جانے کے بعد سیّدہ خدیجہؓ نے پیغام بھجوایا کہ فلاں وقت اپنے خاندان کے بزرگوں کو ساتھ لے کر نکاح کے لیے تشریف لے آئیے؛ چنانچہ حضورؐ اپنے چچاؤں اور بزرگ رشتے داروں کے ساتھ، جن میں ابوطالب اور حضرت حمزہ بھی شامل تھے، وقت مقررہ پر سیّدہ خدیجہؓ کے مکان پر پہنچ گئے۔ سیّدہ کی طرف سے اُن کے چچا عمرو بن اسد نے ولایت کے فرائض انجام دیے۔ نکاح ابوطالب نے پڑھایا۔ حضورؐ نے مہر میں اکثر روایات کے مطابق بیس اونٹ اور بعض روایات کے مطابق چار سو طلائی دینار اُسی وقت ادا کیے۔ علّامہ ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ شادی کی یہ تقریب شام کے سفر سے واپسی کے دو ماہ پچیس دن بعد ہُوئی۔ حضورؐ کی عمر اُس وقت پچیس سال اور سیّدہ خدیجہؓ کی عمر چالیس برس تھی۔

ہمارے دَور کے مایۂ ناز محقق و مؤرخ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے علامہ زرقانی کی ایک روایت کی بُنیاد پر شادی کے وقت سیّدہ خدیجہؓ کی عمر ۲۸ سال بتائی ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بہت سے عقلی، طبعی اور طبّی دلائل بھی فراہم کیے ہیں مگر یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ اہلِ علم اور ثقہ مؤرخین اور بالغ النظر سیرت نگار اسی بات پر متفق ہیں کہ شادی کے وقت سیّدہ کی عمر چالیس سال تھی۔

اس شادی کی تقریب کے موقع پر جس میں تمام قابلِ ذکر رؤسائے مکہ اور سردارانِ قریش موجود تھے، حضرت ابوطالب نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور اس کے جواب میں ورقہ بن نوفل نے بھی جوابی کلمات کہے۔ ہم ان کے کچھ اقتباسات محمد رضا مصری کی کتاب "محمدؐ" سے یہاں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابوطالب اپنے خطبے میں حمد و ثنا کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ جس کا کوئی مقابلہ عقل و شرافت اور فضل و شرف میں نہیں کر سکتا اگرچہ وہ دولت مند نہیں لیکن مال کیا ہے؟ وہ ایک ناپائیدار چیز اور ڈھلتا ہُوا سایہ ہے۔ تو میرے اس محمد نے جس کا جو رشتہ مجھ سے ہے اس سے آپ سب واقف ہیں، خدیجہؓ بنتِ خویلد سے نکاح کا ارادہ کیا ہے اور خدا کی قسم! اس کے بعد وہ مستقبل میں عظیم خیر اور شانِ جلیل کا مالک ہو گا۔"

حضرت ابوطالب کے بعد سیّدہ خدیجہؓ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے خطبہ دیتے ہُوئے کہا:

"حمد ہے اُس خدا کی جس نے ہم کو اُن فضائل و مناقب کا مالک بنایا جس کا ذکر ابوطالب نے کیا۔ ہم ہی ہیں سردارانِ عرب اور قائدینِ عرب اور ایسے ہی تم بھی ہو۔ کوئی قبیلہ بھی تمہارے فضل سے انکار اور کوئی شخص بھی تمہارے فخر و شرف کی تردید نہیں کر سکتا۔ ہم نے چاہا کہ تمہارے رشتۂ شرف سے ہمیں بھی تعلق ہو ——— پس اے گروہِ قریش! گواہ رہو کہ میں نے خدیجہ بنتِ خویلد کا نکاح محمد بن عبداللہ سے اتنے مہر پر قرار دیا۔"

شادی کی اس تقریب کی خوشی کا اظہار اُمّ المومنین سیّدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مکان پر اُن کی سہیلیوں نے دف بجا کر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمے کی تقریب کا انتظام کیا، جس کے لیے بعض روایات کے مطابق دو اُونٹ ذبح کیے گئے۔

شادی کا یہ مبارک موقع قرانِ السّعدین تھا۔ صداقت و امانت اور طہارت و سیادت کا جس کے انوار و برکات نے پُورا ماحول روشن اور منوّر کر دیا۔

شادی کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اقامت سیّدہ کے مکان ہی پر اختیار کر لی۔ اب موصوفہ کا یہ مکان باہمی محبت و ہمدردی اور خیر خواہی و دلجوئی کا ایک ایسا گہوارہ اور امن و سلامتی کا ایسا مسکن بن گیا تھا جس پر بہشتِ بریں کی بہاریں بھی رشک کرنے لگیں۔

اُمّ المومنین سیّدہ خدیجہؓ نے اپنے محبوب شوہر کی بارگاہِ عقیدت میں اپنی محبّت و وفا کا نذرانہ کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ دوئی اور من و تُو کے تمام امتیازات یکسر ختم ہو گئے۔ یگانگت و ہم آہنگی اور موانست و ملاطفت کی ایسی فضا قائم ہُوئی جس کی نظیر محبّت و الفت اور تعاون و اعتماد کی پوری دُنیا میں ملنی محال ہے۔

قابلِ احترام سیّدہ کے تجارتی کاروبار کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کئی تجارتی سفر کیے۔ امام ذہبی اور امام حاکم نے یمن کے مشہور مقام جُرش کی طرف آپؐ کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مُسندِ احمد میں یہ روایت مذکور ہے کہ جب مدینہ منورہ میں عرب کے مشرقی ساحلی علاقے سے، جسے اُس زمانے میں بحرین کہا جاتا تھا، عبدالقیس کا وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا، آپؐ نے وہاں کے ایک ایک مقام کا نام لے کر اُس کا حال پُوچھا۔ اس پر لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا میں تمہارے ملک میں خوب پھرا ہُوں۔

اُمّ المومنین سیّدہ خدیجہؓ کی سچی رفاقت اور اُن کے وسیع ترین تجارتی کاروبار میں آنحضورؐ کی مخلصانہ معاونت نے آپؐ کی مالی حالت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا جس کے باعث آپؐ کی سماجی حیثیت میں کئی گنا اضافہ ہُوا۔

معاشرے کے پسے ہُوئے طبقے کی خبر گیری اور دلسوزی، جو آپؐ کی عادت، طبیعت اور شخصیت کی ایک اہم خصوصیت تھی، اب اُس نے ایک تلاطم خیز دریا کی صورت اختیار کر لی۔ سیّدہ خدیجہؓ کا گھر، جو اب اس شخصیت کا گھر بھی تھا، جو اپنی ذات اور سیرت کے لحاظ سے دُکھی انسانیّت کے لیے مداوا اور بے سہاروں کے لیے سہارا تھی، غریبوں، مسکینوں، ناداروں اور بے کسوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ یہاں ضرورت مندوں کی ضرورتیں پُوری ہوتیں، بے سہاروں کو سہارا ملتا، بے نواؤں کی فریاد سُنی جاتی، یتیموں اور بیواؤں کی

خیابانِ ہستی اُجڑا پڑا تھا۔ خزاں کی چیرہ دستیوں سے گلوں کی نکہت افشانیاں اور عنادل کی نغمہ ریزیوں کی یاد تک گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکی تھی۔ روشیں ویران تھیں اور آب جُوئیں خشک! جہاں کبھی سبزۂ نودمیدہ جنّت نگاہ ہُوا کرتا تھا، وہاں خاک اُڑ رہی تھی۔ یاس و قنوط کی ایک ہمہ گیر کیفیت طاری تھی کہ اچانک فاران کی چوٹیوں سے ایک گھنگھور گھٹا اُٹھی جس کا ہر قطرہ بہار آفریں اور جس کا ہر چھینٹا فردوس بداماں تھا۔ یہ گھٹا برسی اور خُوب دل کھول کر برسی یہاں تک کہ گلزارِ عالم میں پھر آثارِ حیات نمودار ہونے لگے۔ انسانیّت کے پژمُردہ چہرے پر پھر شباب و قوت کی سرمستیاں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ خودداری، عزّتِ نفس، شجاعت و ایثار کے افسردہ درختوں کی عُریاں شاخوں کو از سرِ نو خلعتِ برگ و بار عطا ہُوئی۔ قُمریوں نے پھر عفّتِ قلب و نظر کا نغمہ چھیڑا۔ توہمات و عقائدِ باطلہ کے قفس کی تیلیاں ایک ایک کر کے ٹُوٹیں۔ اور ہُمائے بشریّت کو توحید کی مقدس و مطہّر رفعتوں سے پھر دعوتِ پرواز آنے لگی۔ دُنیا والوں نے اس شوخ و شنگ اور خیر و برکات سے بھرپُور گھٹا کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پُکارا اور عالمِ بالا کے مکینوں نے اُسے "احمد" کہا۔

(ظہورِ قدسی ـــ پیر کرم شاہ الازہری)

اعانت ہوتی۔ یہ تھا مسلمانوں کی سب سے بڑی ماں کا گھر جس کا چشمۂ فیض ہر وقت رواں دواں تھا۔

حلیمہ سعدیہ، جس نے بچپن میں حضورؐ کو دودھ پلایا تھا، وہ ایک مرتبہ آپؐ کے پاس آئیں۔ اُس وقت آپ کی سیدہ خدیجہؓ سے شادی ہو چکی تھی۔ حلیمہ سعدیہ نے شکایت کی کہ قحط سالی نے اُنہیں بُری طرح تباہ و برباد کر دیا ہے اور اُن کے تمام مویشی ہلاک ہو چکے ہیں۔ آپؐ نے اُن کو چالیس بکریاں اور سامان سے لدا ہُوا ایک اونٹ مرحمت فرمایا۔

ابولہب کی ایک لونڈی کا نام ثوبیہ تھا۔ اُس نے بھی چند روز حضورؐ کو دُودھ پلایا تھا۔ آپؐ اُس سے ہمیشہ حُسنِ سلوک سے پیش آتے۔ سیدہ خدیجہؓ آپؐ سے شادی کے بعد اُن کی بڑی عزت و تکریم کرتیں۔ سیدہ نے بارہا کوشش کی کہ ثوبیہ کو ابولہب سے خرید کر آزاد کر دیں مگر ابولہب نہیں مانا؛ تاہم بعد میں اُس نے خود ہی اُسے آزاد کر دیا۔

اُمّ المومنین سیدہ طاہرہ خدیجہؓ نے اپنی حکیمانہ فراست اور دونوں خاندانوں کے متعلّقین کے ساتھ اخلاق و ایثار پر مبنی خوشگوار تعلقات کے ذریعے گھر میں ایسا پاکیزہ، دلآویز اور فرحت بخش ماحول پیدا کر دیا تھا کہ جو ایک بار اس سے وابستہ ہو گیا ہمیشہ کے لیے اس کا ہو کر رہ گیا۔

حضرت زیدؓ قبیلہ کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی عُمر آٹھ سال کی تھی کہ اُن کی والدہ اُنہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے میکے گئیں۔ وہاں اُن کے پڑاؤ پر قبیلے کے مخالف لوگوں نے ہلّہ بول دیا اور سامان کے ساتھ زیدؓ کو بھی پکڑ کر لے گئے اور عکّاظ کے میلے میں فروخت کر دیا۔ اُن کو خریدنے والے سیّدہ خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ وہ اُنہیں مکّے لے آئے اور اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جب سیدہ خدیجہؓ سے نکاح ہُوا تو آپؐ کو زید کے عادات و اطوار اتنے پسند آئے کہ آپؐ نے اُنہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش نصیب بچہ اُس شخص کی خدمت میں پہنچ گیا جو خیر الخلائق تھا اور جسے اللہ تعالےٰ نبی بنانے والا تھا۔ اُس وقت زیدؓ کی عمر پندرہ سال تھی۔

کچھ عرصے بعد اُن کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ اُن کا بچہ مکّے میں ہے۔ وہ تلاش کرتے ہُوئے آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی کہ ہم فدیہ دینے کو تیار ہیں۔ آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: "میں یہ معاملہ بچے کی مرضی پر چھوڑتا ہُوں۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہو تو بغیر کسی فدیے کے تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ اگر وہ میرے پاس رہنے پر رضامند ہے تو میں ایسا شخص نہیں کہ زبردستی ایسے آدمی کو نکال دُوں جو میرے ساتھ رہنا چاہتا ہو۔" اس پر اُنہوں نے کہا آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر بات کی ہے۔ آپؐ نے زیدؓ کو بُلا کر پُوچھا: "کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟" زیدؓ نے کہا: "ہاں! یہ میرا باپ ہے اور وہ میرا چچا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "اچھا، تم انہیں بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تم پُوری طرح آزاد ہو، چاہے ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہے میرے پاس رہو۔" اس پر زیدؓ نے عرض کی میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس نہیں رہنا چاہتا۔ یہ سُن کر اُن کے باپ اور چچا نے کہا: "اے زید! تُو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔" اپنے باپ اور چچا کی یہ باتیں سُن کر اُنہوں نے کہا: "میں نے ان کے اعلیٰ اوصاف دیکھے ہیں۔ ان کے جواب میں ان پر کسی اور شخص کو ترجیح نہیں دے سکتا اور نہ کسی اور کے پاس رہ سکتا ہُوں۔" زیدؓ کی باتیں سُن کر اُن کا باپ اور چچا اُن کو بخوشی آپؐ کے پاس چھوڑ جانے پر راضی ہو گئے۔

اس کے بعد آپؐ نے زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں اپنے ساتھ لے جا کر اعلان کیا: "اے گروہِ قریش! گواہ رہو! آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور مَیں اس سے۔" اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمّد کہنے لگے۔

جہاں حضرت زیدؓ کی اس ذہنی اور قلبی کیفیت پیدا کرنے میں حضورؐ کی پدرانہ عنایت و شفقت کا ہاتھ تھا وہاں اس میں سیدہ خدیجہؓ کی مادرانہ محبّت و الفت بھی برابر کی شامل تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عمر ابھی چار یا پانچ سال کی تھی کہ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں اپنی پرورش اور کفالت میں لے لیا۔ اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہُوئے ابنِ اسحٰق نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب مکّے اور اُس کے گرد و نواح میں قحط سالی اور گرانی کا دَور دَورہ تھا۔ آپؐ کو خیال آیا کہ میرے محسن و مربّی چچا ابوطالب کا کُنبہ بہت بڑا ہے اور مالی حالت نہایت کمزور، اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں اُن کا بوجھ ہلکا کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے؛ چنانچہ آپؐ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے اور فرمانے لگے: "تمہارے بھائی پہ بھاری بوجھ ہے۔ اُن کے ایک بیٹے کی ذمّے داری آپ قبول کر لیں اور ایک کی میں کر لیتا ہُوں۔"

حضرت عباسؓ، جو مالدار آدمی تھے، اس تجویز سے متّفق ہو گئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابوطالب کے پاس جا کر اپنا مدّعا بیان کیا۔ اس پر اُنہوں نے کہا: "عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو اور باقی جس کو چاہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" حضرت عباسؓ، جعفرؓ کو اپنے ساتھ لے گئے اور آنحضورؐ حضرت علیؓ کو اپنی کفالت میں لے آئے۔

حضرت علیؓ آنحضورؐ کے شفیق و مہربان چچا کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ عمر بھی اُن کی چار یا پانچ سال تھی۔ آپؐ کی اُن سے محبت و شفقت فطری بات تھی، لیکن سیدہ خدیجہؓ نے اُن کو جو ممتا اور پیار دیا اُس نے اُن کے قلب و روح پر اُس گھر کے مکینوں کی عظمت و تقدس کے وہ نقوش ثبت کیے جو اُن کی پُوری زندگی کا حسین ترین سرمایہ بن گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خانگی اور کاروباری ذمّے داریاں بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ پُورا معاشرہ آپؐ کی اخلاقی برتری اور آپؐ کے حُسنِ تدبر کا معترف تھا لیکن قدرت نے آپؐ کو جسمِ صحت مند اور ذہنِ ارجمند کے ساتھ دلِ دردمند بھی عطا فرمایا تھا۔ آپؐ اپنی قوم کی جہالت اور جاہلیت دیکھ کر کُڑھتے رہتے۔ آپؐ کے سامنے بے جان اور بے وقعت بُتوں کی پرستش ہوتی۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا دَور دَورہ تھا۔ معاشرے میں ظلم و فساد عام تھا۔ بے بس اور بے سہارا لوگ زورداروں کی زیادتیوں کی چکّی میں پس رہے تھے۔ بے حیائی، بے شرمی اور بداخلاقی ہر طرف پھیلی ہُوئی تھی۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ یہ پریشان کُن اور اندوہناک حالات آپؐ کی حسّاس طبیعت کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ثابت ہو رہے تھے۔ آپؐ کے غم و اندوہ اور فکر و پریشانی میں یہ بات ہر لمحہ مزید اضافہ کیے جا رہی تھی کہ آپؐ کو اصلاح کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس گہرے سوچ بچار نے آپؐ کی طبیعت کو خلوت گزینی کی طرف مائل کر دیا؛ چنانچہ آپؐ مکّے سے تین میل دور ایک غار میں تشریف لے جاتے اور وہاں مسلسل کئی کئی دن غور و خوض اور عبادت و مراقبے میں گزار دیتے۔

ایک وفادار اور غم گُسار بیوی کے لیے اپنے محترم شوہر کی طبیعت اور مزاج میں یہ تبدیلی سخت پریشانی اور تشویش کا موجب بن جاتی ہے۔ مختلف قسم کے اندیشے اور خطرات اُس کے قلبی سکون اور ذہنی توازن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں، مگر اُمّ المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، جو اپنے مایۂ ناز شوہر کے مزاج کی سلامتی، ذوق کی پاکیزگی اور طبیعت کی استواری سے بخوبی واقف تھیں، پریشان ہوتی ہیں نہ کسی تشویش کا اظہار کرتی ہیں اور پُوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اپنے خاوند کی دلجوئی، خدمت گزاری اور وفاشعاری کا فریضہ انجام دیے چلی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور چند روز وہاں گزارتے۔ جب سامان ختم ہو جاتا تو گھر تشریف لے جاتے۔ سیدہ خدیجہؓ پھر چند روز کا سامان مہیا کر دیتیں۔ اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

آخر کار رمضان عام الفیل ۴۱ کی ایک رات جب آپؐ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے اور آپؐ کی عمرِ مبارک چالیس برس اور چھ ماہ تھی تو انسانی تاریخ کا وہ اہم اور عظیم الشّان واقعہ پیش آیا جس نے تقدیرِ عالم کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ آپ پر پہلی وحی نازل ہُوئی۔

پہلی وحی کے نزول کی تفصیل، جو اُمّ المومنین حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن کر آپؐ کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے، وہ اس طرح ہے:

"ایک فرشتہ میرے سامنے آیا۔ اُس نے کہا: 'پڑھو'۔ میں نے کہا: 'میں تو پڑھا ہُوا نہیں'۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: 'پڑھو'۔ میں نے کہا: 'میں تو پڑھا ہُوا نہیں'۔ اُس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے کہا: 'پڑھو'۔ پھر میں نے کہا: 'میں پڑھا ہُوا نہیں'۔ اُس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی اور پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

"پڑھو! (اے نبی) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جمے ہُوئے خُون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

(سورہ علق آیت ۱ تا ۵)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس انوکھے تجربے اور واقعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عجیب کیفیّت طاری ہو گئی۔ آپؐ کانپتے اور لرزتے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے کہنے لگے: "مجھے اُڑھاؤ"۔ چنانچہ آپ کو کمبل اوڑھا دیا گیا۔ جب خوف و حیرت کی یہ کیفیت ذرا کم ہُوئی تو آپؐ نے فرمایا: "اے خدیجہؓ! مجھے یہ کیا ہو گیا ہے؟" اور پھر سارا واقعہ اُن کو سُنایا اور کہا: "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔"

اُمّ المومنین سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، جو ذہانت و فطانت اور فراست و معاملہ فہمی کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ، ذہنی رفعت اور رُوحانی شرف و عظمت سے بخوبی آگاہ تھیں، معاملے کی حقیقت فوراً سمجھ جاتی ہیں اور آپؐ کو تسلّی دیتے ہُوئے فرماتی ہیں:

"ہرگز نہیں! آپ خوش ہو جائیے۔ خُدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی رُسوا نہ کرے گا۔ آپؐ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر جاتی ہیں جو بُت پرستی چھوڑ کر عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ عربی اور عبرانی کے جیّد عالم تھے۔ انجیل کی کتابت کرتے تھے لیکن اُس وقت بہت ضعیف اور نابینا ہو چکے تھے۔

ورقہ بن نوفل نے سارا ماجرا سُن کر ابونعیم اصفہانی کی روایت کے مطابق کہا:

"یہ وہی عالمِ بالا سے وحی لانے والا فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس بھی وحی لے کر آیا تھا۔ کاش! میں آپؐ کے زمانۂ نبوّت میں قوی ہوتا۔ کاش! میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپ کو شہر سے نکالے گی۔"

یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" اس پر ورقہ نے کہا:

"ہاں! کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اُس سے دُشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔"

اس عظیم اور غیر معمولی تجربے سے آپؐ پر وہی کیفیت طاری ہُوئی جو لامحالہ ایسے مواقع پر کسی انسان پر طاری ہونی چاہیے۔ آپؐ کی یہ پریشانی، گھبراہٹ اور خلجان نتیجہ تھا اُن بے شمار سوالات اور خطرات کا جو آپؐ کے ذہنِ مبارک میں اُس وقت پیدا ہو رہے تھے اور تلاطم خیز موجوں کی طرح پے در پے اُٹھ رہے تھے۔ کیا واقعی میں نبی بنا دیا گیا ہُوں؟ کہیں مجھے سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اُٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں گا کہ میں تمہاری طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہُوں؟ لوگ میری یہ بات کیسے مان لیں گے؟ جس معاشرے میں آج تک عزّت و وقار سے رہا ہُوں اب اُس معاشرے کے لوگ میرا مذاق اُڑائیں گے، دیوانہ کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر کیسے لڑ سکوں گا؟

حضرت سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جو پندرہ سال سے ایک وفا شعار رفیقۂ حیات کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھیں

اور جن کی عمر اس وقت تقریباً ۵۵ سال تھی اور جو حضورؐ کی عادات، ذہنی کیفیات، قلبی واردات و احساسات اور سیرت کی بلندی و رفعت سے بخوبی واقف تھیں، غارِ حرا میں پیش آنے والے واقعات سُن کر فوراً یقین کر لیتی ہیں کہ آپؐ پر خُدا کا وہی فرشتہ وحی لے کر آیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا اور اُن کا یقین مزید مضبوط ہو جاتا ہے جب اُن کا چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بھی اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے۔

خدا کی رحمت اور تائید اپنے پیارے نبی کے شاملِ حال تھیں۔ خوف و حیرت کی بُحرانی کیفیت چند لمحوں بعد سکون و اطمینان اور عزم و ہمّت کی فکر انگیز اور ولولہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان ہی وہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ اور فساد کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور ہر شعبے اور ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت و رہنمائی سے آپؐ کے ذہن سے تمام بوجھ اُتر گیا۔ اور آپ کامل مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعے سے آپؐ نہ صرف عرب بلکہ پُوری نسلِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دُنیا مبتلا اور گرفتار ہے۔

تمام مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ جس خوش نصیب ہستی کو سب سے پہلے حضورؐ کی نبوّت کی تصدیق کرنے کی سعادت حاصل ہُوئی، وہ ہم تمام مسلمانوں کی باعظمت ماں سیّدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حق و راستی سے محبت آپ کی فطرتِ صالحہ کا جزوِ لاینفک تھی۔ یہ آپ کی بلند ہمّتی، عالی حوصلگی اور حق و انصاف کی خاطر ہر قسم کے خطرات کو برداشت کرنے کی جرأت کا برملا اعلان تھا۔ اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور ورقہ بن نوفل کی وضاحت کی بنا پر آپ کو پُوری طرح احساس تھا کہ اس راہ پر قدم رکھنا وادیٔ خارزار میں قدم رکھنے کے مترادف ہے اور توحید کی دعوت پر لبّیک کہنا پُورے جاہلی معاشرے کو دشمنی اور عداوت کی دعوت دینا ہے مگر اس ہوشمند عظیم خاتون نے جو پیکرِ مہر و وفا اور مجسمۂ صدق و صفا تھی، ایک ایسے انقلابی اور تاریخ ساز اقدام کا فیصلہ کر لیا جس پر قیامت

حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ اللہ کے فرمانبردار بندوں کے مُنہ کے نزدیک ہو کر اُن کی باتیں سُنو۔ اللہ کی طرف سے اُن پر اُمورِ صادقہ واضح اور منکشف ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ حق واضح اور روشن ہے، عاقل اور سمجھدار پر مخفی نہیں رہ سکتا۔

(حُجّیّتِ حدیث ـــــ مولانا محمدؒ ادریس کاندھلوی)

تک پُوری نسلِ انسانی صرف رشک ہی نہیں بلکہ فخر کرتی رہے گی۔ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اسی جرأت مندانہ اقدام نے طبقۂ نسواں کے عزّ و شرف میں وہ چار چاند لگا دیے جن کی نُورانی کرنیں اس طبقہ کی حرمت و وقار اور عزّت و احترام کو تاابد درخشندہ و تابندہ بنائے رکھّیں گی۔ اس مقدس و محترم رُوحانی ماں کا اس اُمّت کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں پر کتنا عظیم الشان احسان ہے جس کا کچھ بدلہ اسی صُورت میں ممکن ہے کہ وہ اُن کی پاک سیرت کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔

اُمّ المومنین سیّدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کے بعد سب سے پہلے ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہونے والوں میں سیّدنا ابوبکرؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے اسمائے گرامی تمام محدّثین و مؤرّخین کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ ان میں سے حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے تھا۔ حضرت علیؓ کی عمر قبولِ اسلام کے وقت صرف دس سال تھی۔ وہ عرصہ پانچ چھ سال سے اس گھر میں زیرِ تربیت تھے جس کے معاملات کی دیکھ بھال کی ذمّے داری سیّدہ خدیجہؓ کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت زیدؓ آٹھ سال کی عمر میں اس گھر کے افراد میں شریک ہُوئے اور پُورے بائیس سال تک اپنی مخدومہ کی نیک سیرت، حُسنِ سلوک اور شفقت کا مشاہدہ و تجربہ کرتے رہے۔ اب اُن کی

عمر ۴۰ سال تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھٹکی ہوئی انسانیّت کو ہدایت کی روشن اور منوّر راہ دکھانے کے اہم کام پر مامور ہوئے تو اس گھر کے ان ہر دو افراد یعنی حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ نے فوراً اس میں اللہ کے رسولؐ کی حمایت و اعانت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور اپنی زندگیاں توحید کی دعوت کو پھیلانے اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے وقف کر دیں۔

حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ جنہیں قسامِ ازل کی طرف سے شروع ہی سے طبیعت کی سلامتی و استواری اور فطرت کی ہمواری و پاکیزگی ودیعت ہوئی تھی، اُن کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاکیزہ کردار بھی تھا اور سیدہ خدیجہؓ کی ہوشمندی اور دانشمندی بھی۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ اُن کے آقا و مربّی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کی صداقت و دیانت اُن کے نزدیک ہر قسم کے شک و شُبہہ سے بالاتر تھی، یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے مجھے اپنا نبی مقرّر کیا ہے اور اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اُن کی محترمہ و مخدومہ سیّدہ خدیجہؓ آپؐ کے اس دعوے کی تصدیق کر رہی ہیں تو اُن کا یقین حق الیقین کی حد تک پہنچ گیا کیونکہ اُنھوں نے اپنی مخدومہ کو کبھی غلط بات کی تائید اور باطل موقف کی حمایت کرتے نہیں دیکھا تھا، نیز اُنہیں اپنی مخدومہ کی تجربہ کاری، مردم شناسی اور معاملہ فہمی جیسی خوبیوں پر مکمل اعتماد تھا۔ سیّدہ خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کا سابقون الاوّلون میں شامل ہونا اس گھر کی سُہانی فضا اور اس کے خوش گوار ماحول کی نشاندہی کے لیے کافی ہے جس میں خاتونِ خانہ خود سیّدہ موصوفہ تھیں۔

ایک گھر کے ماحول کی نوعیت کا انحصار خاتونِ خانہ کے طرزِ عمل پر ہے۔ ایک مرد کتنی ہی جاذب شخصیت اور پُرکشش سیرت کا حامل کیوں نہ ہو اگر اُسے ایک سلیقہ شعار، غم گُسار اور وفا شعار رفیقہ حیات کی رفاقت اور مخلصانہ اعانت حاصل نہ ہو تو اُس کی اکثر خوبیاں غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ میاں بیوی میں ہم آہنگی و یک رنگی اور باہمی مؤدّت اور ملاطفت کا فقدان گھر کو کردار سازی اور سیرت گری کی صلاحیتوں سے یکسر محروم کر دیتا ہے۔ گھر کی یہ ناسازگاری اور ناموافقت اس میں پرورش پانے والوں اور اس سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں شک و شُبہہ، بے اعتمادی و بے اعتباری اور بے ہمّتی و بے حوصلگی کی ایسی کیفیت راسخ کر دیتی ہے کہ اُن میں نہ تو اپنے بڑوں پر اعتبار کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے اور نہ کسی بلند اور ارفع کام کو انجام دینے کا حوصلہ اور ولولہ۔

کتنا پیارا تھا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مبارک اور مقدس گھر جس پر ہر وقت اللہ کی نعمتوں اور برکتوں کی بارش ہوتی تھی، جہاں ہر لمحہ انوار و تجلیاتِ الٰہی کی سُہانی سُہانی شعاعیں ضیا پاش رہتی تھیں۔ کیوں نہ ہو یہ گھر سیّدہ خدیجہؓ کا بھی گھر تھا جنھوں نے لُطف و کرم، داد و دہش، انسانی ہمدردی و خیر خواہی، حق پسندی و حق دوستی اور بے لوثی اور بے غرضی کی ایسی بے نظیر مثالیں قائم کیں جن کی بنا پر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ سیدہ محترمہ نے اپنی طبیعت و مزاج، اپنے ذوق و رُجحان اور اپنے اخلاق و عادات کو اپنے شوہر، جو اُن کا آقا و مولا بھی تھا، کی سیرت کے سانچے میں ڈھال کر اپنی شخصیت سے ہم رنگ بنا لیا تھا۔ اُن کی پسند کو اپنی پسند اور اُن کی ناپسند کو اپنی ناپسند قرار دینا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ سیّدہ خدیجہؓ کی شخصیت و سیرت کا یہی زرّیں پہلو ہے جس نے اُنہیں عزت و عظمت کے آسمان پر آفتاب نصف النّہار بنا دیا۔

طبری، امام احمد، ابن ماجہ اور طبرانی نے زیدؓ بن حارثہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ توحید کے اقرار اور بُتوں سے برأت کے بعد اسلامی شریعت میں جو چیز سب سے پہلے فرض کی گئی وہ نماز تھی۔ پہلی وحی کے نزول کے دوسرے روز حضرت جبرائیل حضورؐ کے پاس آئے۔ آپؐ کو وضو کا طریقہ سکھایا، پھر جبرائیل نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپؐ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کہا۔ پھر حضورؐ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ سُن کر خوشی کے مارے مدہوش ہو گئیں۔ آپؐ نے اُنہیں وضو کرایا اور حضرت جبرائیل کے طریقے کے مطابق اُنہیں اپنے ساتھ نماز پڑھائی۔

نماز کی ادائیگی کا یہ اسلامی طریقہ عبادت کے مروجہ طریقوں سے بالکل مختلف تھا، اس لیے آپؐ حضرت خدیجہؓ اور حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والے مسلمان ایسی خفیہ جگہ پر نماز پڑھتے رہے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی تھی۔ صورتِ حال کی وضاحت کے لیے حضرت

عفیف کندیؓ کا وہ بیان کافی ہے جسے حافظ عبد البرّ اور علامہ ابنِ طبری نے نقل کیا ہے:

"مَیں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک دفعہ مکّے آیا اور اپنے ایک دوست حضرت عبّاسؓ کے ہاں ٹھہرا۔ حج کے دن تھے۔ منٰی کے میدان کے قریب مَیں نے دیکھا کہ ایک شاندار اور باوقار مرد آیا اور وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک عورت آئی اور وضو کر کے اُس کے پیچھے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک لڑکا آیا جو ابھی نو عمر تھا۔ وہ پہلے شخص کے پہلو میں نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ ان تینوں نے نماز پڑھی اور چلے گئے۔ مَیں نے عبّاسؓ سے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکّہ میں انقلاب آنے والا ہے۔ عبّاسؓ نے کہا ہاں، تم جانتے ہو یہ تینوں کون ہیں۔ مَیں نے کہا نہیں۔ عباسؓ نے کہا وہ شاندار جوان میرا بھتیجا محمد بن عبد اللہ اور لڑکا ابو طالب کا بیٹا علی تھا۔ وہ عورت جس نے دونوں کے پیچھے نماز پڑھی وہ میرے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیوی خدیجہؓ بنت خویلد تھی۔ میرے بھتیجے کا دعویٰ ہے کہ اس کا دین الہامی ہے اور وہ ہر کام خدا کی ہدایت کے مطابق کرتا ہے لیکن ابھی تک ان تینوں کے سوا اس دین کا کوئی پیرو میرے علم میں نہیں۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دینِ حق کی دعوت اور اشاعت کا کام تدریج کے فطری اُصولوں کے مطابق بڑی سنجیدگی اور مستعدی سے شروع کر دیا۔ پہلے آپؐ نے ابتدا میں خُفیہ طور پر دعوت پھیلانے کا منصوبہ وضع کیا اور تین سال تک وہ انتہائی اعتماد کے قریبی دوستوں میں کام کرتے رہے۔ اس مہم میں اُمّ المومنین سیدہ خدیجہؓ کی پُرجوش اعانت اور باوقار رفاقت آپؐ کو برابر حاصل رہی؛ چنانچہ تین برس کی شبانہ روز محنت اور جِدّ و جہد کے نتیجے میں جن سعید الفطرت اور خوش قسمت انسانوں کو اصلاحِ انسانیّت کی اس عہد ساز تحریک کا ہراول دستہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی، سیرتِ سرورِ عالمؐ کے مصنف سید مودودیؒ کی تحقیق کے مطابق اُن کی تعداد ۱۳۳ تھی، ان میں سے ۲۷ کا تعلق طبقۂ نسواں سے تھا۔

ہم یہاں اُن عالی حوصلہ اور بلند ہمّت خواتین کے ناموں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں جنھوں نے اس ابتدائی دَور میں کاروانِ عزیمت و استقامت کے ہراول دستے میں شامل ہو کر سیدہ خدیجہؓ کی قلبی اور رُوحانی مسرتوں میں بے پناہ اضافہ کیا:

۱ اُمّ المومنین سیّدہ خدیجہؓ (ہراول دستے کی سرخیل)
۲ اسماءؓ بنتِ عُمَیس (جعفرؓ بن ابی طالب کی بیوی)
۳ صفیہؓ بنتِ عبد المطّلب (حضورؐ کی پھوپھی)
۴ اروٰیؓ بنتِ عبد المطّلب (حضورؐ کی پھوپھی)
۵ سہلہؓ بنتِ سُہیل (ابو حذیفہؓ کی بیوی)
۶ اروٰیؓ بنتِ کُریز (حضرت عثمانؓ کی والدہ)
۷ اُمیمہؓ بنتِ خَلف (خالدؓ بن سعید کی بیوی)
۸ اُمِّ حبیبہؓ بنتِ ابوسفیان (بعد میں اُمّ المومنین کے شرف سے بہرہ ور ہوئیں)
۹ اسماءؓ بنتِ ابوبکرؓ (حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی)
۱۰ اُمِّ رُومانؓ (حضرت عائشہؓ کی والدہ)
۱۱ صَعبہؓ بنتِ الحضرمی (حضرت طلحہؓ کی والدہ)
۱۲ شفاءؓ بنتِ عوف (حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کی والدہ)
۱۳ رَملہؓ بنتِ ابی عوف (مطّلبؓ بن ازہر کی بیوی)
۱۴ فاطمہؓ بنتِ خطّاب (حضرت عمرؓ کی بہن)
۱۵ لیلیٰؓ بنتِ ابی حَشمہ (حضرت عامرؓ کی بیوی)
۱۶ فاطمہؓ بنتِ مُجَلّل (حضرت حاطبؓ کی بیوی)
۱۷ اُمِّ سلمہؓ (ابو سلمہؓ کی بیوی، بعد میں اُمّ المومنین کے شرف سے بہرہ ور ہوئیں)
۱۸ اسماءؓ بنتِ سلامہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی عیّاشؓ بن ابی ربیعہ کی بیوی)
۱۹ اُمِّ کلثومؓ بنتِ سُہیل (ابو جندلؓ کی بہن)
۲۰ سَودہؓ بنت زمعہ (اپنے شوہر سکرانؓ کی وفات کے بعد اُمّ المومنین کے شرف سے فیض یاب ہوئیں۔)

۲۱ اُمِ ایمنؓ بنتِ ثعلبہ (حضورؐ کی دایہ)
۲۲ زُنیرہؓ رُومیہ (ایک آزاد کردہ لونڈی)
۲۳ حمامہؓ (حضرت بلالؓ کی والدہ)
۲۴ لبیبہؓ (مؤمّل کی لونڈی)
۲۵ اُمِ عُبیسؓ (بنی زہرہ کی لونڈی)
۲۶ سُمیہؓ (حضرت عمّار بن یاسر کی والدہ)
۲۷ فکیہہؓ بنتِ یسار (حطاب بن الحارث کی بیوی)

ان عظیم اور بلند مرتبہ خواتین کے علاوہ تحریکِ اسلامی کے اس ابتدائی دَور میں سیدہ خدیجہؓ کے قبیلہ بنی اسد کے مندرجہ ذیل اشخاص بھی سعادت اندوزِ ایمان ہُوئے۔

۱ زبیرؓ بن العوام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی۔)
۲ خالدؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)
۳ اسودؓ بن نوفل
۴ عمروؓ بن اُمیّہ

قبیلہ بنی اسد کے مذکورہ بالا جیالوں کا مشرف بہ اسلام ہونا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی شخصیت اپنے خاندان اور قبیلے میں نہایت قابلِ احترام اور لائقِ اعتماد تھی۔ اس دَور کے یہ نتائج اس امر پر گواہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی اور تبلیغی مساعی میں سیدہ خدیجہؓ کی ولولہ انگیز اور جان نثارانہ رفاقت و اعانت برابر شامل تھی۔

نبوت کے ابتدائی تین سال گزر جانے کے بعد حضورؐ کو اللہ کی طرف سے حکم نازل ہُوا:

"اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈراؤ۔"
(شعراء)

آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دعوت کا انتظام کرنے کے لیے کہا جس میں قبیلہ ہاشم کے سبھی مردوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ ابن اثیر اور بلاذری کی روایت کے مطابق اس میں ۴۵ افراد شریک ہُوئے۔ دعوت کا یہ سارا انتظام سیدہ خدیجہؓ کے مکان ہی پر ہُوا اور شرکا کی خاطر مدارات گوشت اور دُودھ سے کی گئی جو اُس دَور کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ خوراک تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"اے اولادِ عبدالمطّلب! اے عباس، اے صفیہ، اے فاطمہ! تم لوگ اپنے آپ کو جہنّم کی آگ سے بچاؤ کیونکہ مَیں اللہ کی پکڑ سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا، البتہ میرے مال میں سے تم جو چاہو مانگ سکتے ہو۔ مَیں وہ چیز لے کر آیا ہُوں جو دین اور دُنیا دونوں کے لیے کافی ہے۔ اس بھاری ذمّے داری اُٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟"

حضرت علیؓ نے اُٹھ کر کہا: "مَیں آشوبِ چشم کی تکلیف میں مبتلا ہُوں اور میری ٹانگیں پتلی ہیں اور مَیں سب سے کم عمر ہُوں؛ تاہم مَیں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

آپؐ کے چچا ابوطالب نے فرمایا:

"مَیں اپنا آبائی دین چھوڑنے کے لیے تیار نہیں مگر تمہیں جس کام کا حکم دیا گیا ہے، اُسے انجام دو۔ خدا کی قسم! جب تک میری جان میں جان ہے مَیں تمہاری اعانت اور حفاظت کرتا رہوں گا۔"

آپ کا ایک دوسرا چچا ابولہب بولا:

"اے محمد! مَیں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو اپنے خاندان والوں پر اس سے زیادہ سخت آفت لایا ہو جو تم لے آئے ہو۔ اگر تم اس پر قائم رہے جو تم کہہ رہے ہو تو تمہارے خاندان کے لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ تمہیں روکیں اور تمہارا ہاتھ پکڑیں اس سے پہلے کہ قریش کے دوسرے خاندان ٹوٹ پڑیں اور عرب اُن کی مدد کریں۔"

دعوتِ توحید کے خصوصی دَور سے عمومی دَور میں داخل ہونے کے پہلے ہی موقع پر اہلِ قریش کے اس دعوت کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آ گئے۔ ابولہب سردارانِ قریش اور رؤسائے مکّہ کے اُس بااثر اور صاحبِ طاقت جتھے کی نمائندگی کر رہا تھا جو خالص توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت کو اپنے آبائی مشرکانہ عقائد و رسوم پر ایک سخت کاری ضرب تصوّر کرتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس جاہلانہ نظام سے اُن کے جو سیاسی، تمدّنی، طبقاتی [illegible] مفادات وابستہ ہیں، اُن کی ساری عمارت زمین بوس [illegible] گی۔ اُس نے دعوتِ حق کا راستہ پُوری قوّت کے ساتھ [illegible] فیصلہ کر لیا تھا۔

[illegible] و باطل کی یہ کشمکش کچھ اس انداز سے شروع ہُوئی کہ [illegible] ظلم و جور اور جبر و تشدّد کی وہ لرزہ خیز مثالیں قائم ہوئیں [illegible] تاریخِ انسانی میں کم ہی ملیں گی اور دوسری طرف نشّۂ [illegible] متوالوں نے صبر و ضبطِ نفس، استقامت و عزیمت [illegible] اکاری و جاں سپاری کی وہ حیران کُن اور حوصلہ افزا داستانیں [illegible] صفحات پر رقم کیں جو ہر دَور کے بے بسوں، بے کسوں [illegible] نواؤں کو حوصلہ، قوّت اور زندگی عطا کرتی رہیں گی۔

[illegible] باطل پرستوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہادیٔ عالم اور [illegible] انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت پاکیزہ سیرت [illegible] شخصیت تھی۔ آپؐ نے مخالفین کے سامنے برملا [illegible]

"[illegible] نے تمہارے اندر اس سے پہلے زندگی کا ایک حصّہ [illegible] پھر تم عقل سے کیوں کام نہیں لیتے؟"

آپؐ نے اپنے دعوے میں اپنی جو زندگی پیش کی، اُس [illegible] کاروباری، تجارتی، معاشرتی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ [illegible] کی نجی، خاندانی اور خانگی مصروفیات اور معاملات [illegible] تھے۔ آپ کی خانگی اور گھریلو زندگی میں ذرا بھی ناہمواری [illegible] گھر کے معاملات میں ناسازگاری کی ذرا سی بھی رمق [illegible] کو مخالفین جن میں آپ کے قریب ترین رشتے دار اور [illegible] ترین پڑوسی بھی شامل تھے، برملا کہتے:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پُورے معاشرے، پُورے [illegible] عرب بلکہ پُوری انسانی دُنیا کی اصلاح و ہدایت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہو، پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ اگر تم اپنے گھر کے چند آدمیوں کی اصلاح بھی نہیں کر سکے تو پُوری دُنیا کی بھلائی اور فلاح کے لیے کیا کر پاؤ گے؟"

روایات اور سیرت و تاریخ کا پُورا ریکارڈ اس امر پر شاہد [illegible] کہ ذلیل سے ذلیل مخالف کو بھی مکّے میں آپؐ کی خانگی اور ازدواجی زندگی کے کسی پہلو سے متعلق کوئی بات کہنے کی جرأت نہ ہُوئی۔ یہ اُمّ المؤمنین سیدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بے مثل اخلاقی عظمت و برتری، امورِ خانہ داری میں بے پناہ مہارت اور تربیتِ اولاد کے سلسلے میں بے پایاں فراست و تدبّر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ دُنیا کی اس عظیم ترین اسلامی تحریک کے قافلہ سالاروں پر اس عالی مرتبت ماں کا یہ ناقابلِ فراموش احسان ہے کہ اُنھوں نے اپنے ایثار و قربانی، صدق و صفا، اطاعت و خدمت اور صبر و رضا کے طفیل اُنھیں ایک ایسا اسلحہ فراہم کر دیا جس کے سامنے مخالفوں اور دشمنوں کے اسلحہ جات کے تمام انبار خانے ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ مشرکانہ نظام کے سرپرستوں نے فدا کارانِ اسلام کی تعذیب اور ایذا رسانی کے لیے جور و ستم اور ظلم و تشدّد کی جو بھٹّی دہکائی تھی اُس کی حدّت اور شدّت روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ کمزوروں اور بے نواؤں کا تو ذکر ہی کیا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے بااثر اور باحیثیت اشخاص بھی مسلسل

ماموں الرّشید کا مسیحی طبیب بخت یشوع تھا۔ اُس نے ایک عالمِ دین سے پُوچھا:
"کیا قرآن میں طب کا بیان نہیں ہے؟"
اُنھوں نے جواب دیا:
"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ 'کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔' اور یہی نظریۂ طب کی اساس ہے۔"
بخت یشوع نے پُوچھا:
"تمہارے نبیؐ نے کوئی طبّی ہدایت نہیں دی؟"
اُنھوں نے جواب دیا:
"ہمارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ معدہ تمام بیماریوں کا مرکز ہے اور پرہیز تمام دواؤں کی دوا ہے۔"
بخت یشوع نے بے اختیار کہا:
"اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جالینوس کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔"

نشانۂ ظلم وستم بنتے رہے۔ حضرت خبّاب، حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت سُمیّہ، حضرت صُہیب، حضرت ابُو فکیہہ، حضرت لُبینہ، حضرت نبیرہ، حضرت تہدیہ اور حضرت اُمِ عُبیس جیسے غلاموں اور کنیزوں کو جس بیدردی اور بے رحمی سے مارا پیٹا جاتا اور اُنہیں تکلیف اور دُکھ پہنچانے کے جو نئے نئے طریقے ایجاد کیے جاتے اور اُن کے چیخنے، بلبلانے اور تڑپنے پر ظالم جس طرح فرطِ مسرّت سے قہقہے لگاتے اور رقص کرتے، اس دردناک منظر پر زمین بھی کانپ اُٹھتی ہوگی اور آسمان خون کے آنسو روتا ہوگا لیکن یہ بدبخت شقی انسان جن کے سینوں میں دل کے بجائے پتھر نے جگہ لے لی تھی، اپنی ان انسانیّت سوز حرکات پر نازاں وفرحاں تھے۔

مکّے میں جہاں خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، خدائے واحد کا نام لینا اور اُس کی عبادت کے لیے اپنی جبینِ نیاز کو سجدہ ریز کرنا سخت مشکل تھا تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اجازت سے ایمان و اسلام کے کچھ شیدائی حبشے کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ مہاجرین کے اس پہلے قافلے میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ ان عورتوں میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور سیّدہ خدیجہؓ کی صاحبزادی حضرت رقیّہؓ بھی بھی اپنے خاوند حضرت عثمانؓ کے ہمراہ تھیں۔

اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہؓ نے دعوتِ ایمانی کو سب سے پہلے قبول کر کے جو قابلِ تقلید روشن مثال قائم کی تھی اُن کی نسبی اور رُوحانی بیٹیوں نے اس دعوتِ ایمانی اور تحریکِ اسلامی کے ابتدائی دَور اور بعد کے ہر دَور میں اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہُوئے ثابت کر دیا کہ اللہ کے دین کی حمایت و نصرت کے معاملے میں وہ کسی طرح بھی مردوں سے پیچھے نہیں۔

دین و ایمان سے محبّت رکھنے والوں کا یہ قافلہ ماہ رجب عام الفیل ۴۵ یعنی بعثت کے پانچویں سال مکّے سے حبشے کی طرف روانہ ہُوا۔ خدا کی تائید سے یہ لوگ بخیریّت وہاں پہنچ گئے۔ قریش کو اللہ والوں کا یہ سکون و اطمینان کب گوارا تھا؛ چنانچہ اُن کو واپس لانے کی تدبیریں ہونے لگیں مگر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا اور قریش کے مشرکین کا جوشِ غضب اور بھڑک اُٹھا۔ خدائے بزرگ و برتر کا نام لینے والوں کے لیے مکّے کی زمین اور تنگ ہو گئی۔ آخر کار اپنے عقیدے اور دین کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے بلاکشانِ وفا کی ایک اور جماعت بعثت کے ابتدائی چھٹے سال میں اپنے گھر بار، کاروبار اور عزیز و اقارب چھوڑ کر حبشے کی طرف روانہ ہو گئی۔ قریش نے اس ہجرت کو روکنے کی پُوری کوشش کی۔ نکلنے والوں کو بہت تنگ کیا اور اُن کے راستے میں سخت مشکلات پیدا کیں لیکن ابن سعد کی روایت کے مطابق ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں حبشے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے والوں کے اس گروہ میں سیّدہ خدیجہؓ کے قبیلے بنی اسد کے بھی چار بلند ہمّت افراد شامل تھے۔

اس ہجرت سے مکّہ کے ہر گھر میں کہرام مچ گیا۔ قریش کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا چشم و چراغ ان جانے والوں میں شامل نہ ہو۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کی بہن اور کسی کا بھائی۔ سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہُوئے تھے۔ اس واقعے سے بعض لوگ تو حق دشمنی میں اور سخت ہو گئے اور بعض کے دلوں پر ایسا اثر ہُوا کہ آخر کار وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اہلِ قریش کی حمیّتِ جاہلیت اس قدر برافروختہ ہوئی کہ اُنہوں نے ایک دستاویز تیار کی جس میں خدا کی قسم کھا کر یہ عہد کیا گیا کہ جب تک بنی ہاشم اور بنی عبد المطّلب محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قتل کے لیے اُن کے حوالے نہیں کرتے، اُس وقت تک اُن سے میل جول، بیاہ شادی، لین دین اور بول چال کا کوئی تعلّق نہیں رکھا جائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز پر دستخط کر کے اس کی توثیق کی۔ موسیٰ بن عُقبہ کے بیان کے مطابق جب حضرت ابوطالب کو معلوم ہُوا کہ اہلِ قریش حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جان کے درپے ہیں تو آپ نے دونوں خاندانوں کے افراد جمع کیے اور اُن سے کہا کہ آپ سب

اہلِ شعب ابی طالب میں چلے جائیں اور آخر وقت تک محمّدؐ کی حفاظت کریں؛ چنانچہ ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو عبد المطّلب کے سارے مسلم اور غیر مسلم اشخاص گھاٹی میں جمع ہو گئے۔

قریش نے اپنی تیار کردہ متّفقہ دستاویز نہایت محفوظ طریقے سے حرم شریف میں رکھ دی اور حضورؐ کے ساتھیوں کا مقاطعہ یا بائیکاٹ پُوری شدّت سے شروع کر دیا۔ یہ ناکہ بندی اتنی کڑی تھی کہ کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کی کوئی چیز باہر سے گھاٹی میں نہ جا سکتی تھی۔ محاصرے کی اس بے پناہ سختی نے محصورین کے لیے نہایت پریشان کُن اور ہولناک حالات پیدا کر دیے۔ اس کا اندازہ حضرت سعد بن وقّاص رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جسے علامہ سہیلی نے 'روض الانف' میں درج کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ رات کو سُوکھا ہُوا چمڑہ ہاتھ آ گیا۔ مَیں نے اُسے پانی سے دھویا پھر آگ پر بُھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔"

ناکہ بندی کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ اگر باہر سے مکّے میں کوئی تجارتی قافلہ آتا تو قریش کے لوگ جلد جلد اُن کا تمام سامان خرید لیتے تاکہ محصورین میں سے کوئی چیز نہ خرید سکے۔

ابنِ سعد اور بیہقی کی روایات کے مطابق محصورین کی زبوں حالی اور بے چارگی یہاں تک پہنچ گئی کہ اُن کے بچے بُھوک سے روتے اور بلکتے اور اُن کے رونے اور چیخنے کی آوازیں شعب ابی طالب سے باہر بھی سُنائی دیتیں اور آس پاس کے پڑوسی بے چین اور مضطرب ہو جاتے لیکن کچھ سنگدل اور بدبخت ایسے بھی تھے جو ان معصوم بچّوں کی چیخ پکار سُن کر خوشی کا اظہار کرتے۔

تنگی و عُسرت، قید و بند اور فاقہ کشی کا یہ ہولناک دَور موسیٰ بن عُقبہ کے بیان کے مطابق تین سال جاری رہا——

اُمّ المومنین سیّدہ خدیجہؓ نے ابتلا و آزمائش کا یہ سخت ترین دَور بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ حق کی راہ میں آنے والی تمام تکلیفیں اور پریشانیاں خدا اور اُس کے رسولؐ کی خاطر خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ مکّے کی وہ خوشحال ترین خاتون جو معاشرے میں معزّز و محترم ہونے کی وجہ سے 'سیّدہ' کے نام سے مشہور تھی، اپنے رفیقِ زندگی کے ساتھ پیکرِ تسلیم و رضا بنی ہُوئی تھی اور اپنی فطری اور طبعی بلند حوصلگی سے گرفتارانِ مصیبت و اذیت کو دلاسا دینے اور اُن کا حوصلہ بلند کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

آخر کار مظلوموں کی حد سے بڑھی ہُوئی مظلومیّت اور معصوم بچّوں کی دلوں کو ہلا دینے والی بلبلاہٹ اپنا رنگ لا کر رہی۔ قریش کے وہ لوگ جن کے بنو ہاشم اور بنو عبد المطّلب سے رشتے داری کے تعلّقات تھے، اُن کی اس الم انگیز حالتِ زار پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ کچھ رحم دل اور انسان دوست افراد اس ظالمانہ معاہدے کو ختم کرنے کے بارے میں اپنی اپنی جگہ سوچنے لگے لیکن اظہار کی جراٴت نہ کر سکے۔ اس کارِ خیر میں سبقت کی سعادت ہشّام بن عمرو العامری کے حصّے میں آئی۔ اُس نے حضرت اُمّ سلمہ کے بھائی زہیر بن اُمیّہ، مُطعم بن عدی، بنو اسد کے سردار عاص بن ہاشم اور زمعہ بن الاسود کو اپنا ہمنوا بنایا اور اگلے روز یہ قریش کی مجلس میں گئے۔ زہیر بن اُمیّہؓ نے اہلِ مکّہ کو خطاب کرتے ہُوئے کہا:

"اے اہلِ مکّہ! کیا ہم کھائیں پیئیں اور کپڑے پہنیں جبکہ بنی ہاشم ہلاک ہو رہے ہیں۔ اُن سے کچھ خریدا جاتا ہے نہ اُن کے ہاتھ کچھ فروخت کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم! مَیں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک اس ظالمانہ مقاطعے کی دستاویز پھاڑ نہ دی جائے۔"

یہ سُن کر ابوجہل چیختے ہُوئے بولا "تم نے جھُوٹ کہا ہے، وہ ہرگز نہیں پھاڑی جائے گی۔" ابوجہل کی مخالفت میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ مجلس میں بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔

عین اُس وقت جب شعب ابی طالب سے باہر قریش کی مجلس میں مقاطعے کی یہ دستاویز زیرِ بحث تھی، ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ابن سعد، ابنِ ہشام اور بلاذری نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کی طرف سے اطّلاع دی گئی کہ بائیکاٹ کی دستاویز میں ظلم و ستم اور قطع رحمی کا جو مضمون تھا، اُسے دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کا ذکر اپنے چچا ابوطالب سے کیا۔ اُنھوں نے پُوچھا: "کیا تمہیں

اس کی خبر تمہارے خدا نے دی ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "ہاں!"

حضرت ابوطالب نے اس بات کا ذکر اپنے بھائیوں کے سامنے کیا۔ انہوں نے پوچھا: "آپ کا کیا خیال ہے؟" ابوطالب نے کہا: "خدا کی قسم! محمدؐ نے مجھ سے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کہی۔" ابوطالب نے حضورؐ سے دریافت کیا اب کیا کرنا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا: "چچا! آپ عمدہ لباس پہن کر سردارانِ قریش کے پاس جائیں اور اُن کو یہ بات بتائیں۔"

حضرت ابوطالب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اُس مجلس میں پہنچے جہاں قریش کے دانا و بینا اس دستاویز کے معاملے پر غور و خوض کر رہے تھے۔ ابوطالب کو آتے دیکھ کر اہلِ مجلس نے خوشی کا اظہار کیا اور آمد کی وجہ پوچھی۔ ابوطالب نے حاضرینِ مجلس کو خطاب کرتے ہُوئے کہا:

"میرے بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، مجھے خبر دی ہے کہ مقاطعے کی دستاویز میں جور و ستم اور قطع رحمی سے متعلق تمہاری تمام تحریر دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ اب تم وہ صحیفہ منگوا کر دیکھ لو۔ اگر میرے بھتیجے کا بیان غلط نکلا تو مَیں اُسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ پھر تمہیں اختیار ہے چاہے قتل کر دو اور چاہے زندہ رہنے دو لیکن اگر اُس کی بات سچ نکلی تو ہمارے ساتھ اس بدسلوکی سے باز آجاؤ۔"

ابوطالب کی یہ بات سُن کر حاضرینِ مجلس نے کہا آپ نے انصاف کی بات کہی ہے۔ دستاویز منگوا کر دیکھی گئی۔ وہی بات سچی نکلی جس کی خبر دی گئی تھی۔ اس پر قریش کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ندامت اور شرم سے اُن کی آنکھیں جُھک گئیں۔

یہ کہہ کر ابوطالب تو گھاٹی کی طرف لوٹ آئے۔ مجلس میں ابوجہل اور اُس جیسے ضدی آدمیوں پر ملامت کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور مقاطعے کے خاتمے کے حامی حضرات اسلحے سے لیس ہو کر شعب ابی طالب کی طرف گئے اور محصورین سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں جا کر آباد ہو جائیں۔ اس طرح ظلم و ستم اور جور و تعدی کا یہ تین سالہ طویل دور ختم ہُوا۔

محاصرہ شعبِ ابی طالب کے ختم ہونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو قدرے سکون کا سانس لینے کا موقع ملا لیکن اس کی مدت بڑی مختصر ثابت ہُوئی اور چند ہی روز میں پے در پے قلب و رُوح کو پگھلا دینے والے صدمات کا کوہِ گراں آپ پر ٹوٹ پڑا۔ یہ صدمات آپؐ کے شفیق مہربان اور جاں نثار چچا ابوطالب کی رحلت اور آپؐ کی غمگسار، وفا شعار اور آپؐ کے قدموں پر اپنی جان اور اپنا مال نثار کر دینے والی رفیقۂ حیات حضرت سیدہ خدیجہؓ کی وفاتِ حسرت آیات کی صُورت میں پیش آئے۔

مقاطعے کے خاتمے ہی پر اُمّ المؤمنین سیدہ خدیجہؓ کی صحت جواب دے گئی۔ آپ سخت بیمار ہُوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے علاج معالجے، خبر گیری اور دلجوئی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی مگر معیّن وقت آن پہنچا تھا۔ حکیم بن حزام کی روایت کے مطابق جسے علّامہ بلاذری نے نقل کیا ہے، اُمّتِ مسلمہ کی یہ شفیق و رحیم اور عظیم ماں داعئ اجل کو لبیک کہتے ہُوئے ۱۰ رمضان ۱۰ بعد بعثت کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

سیدہ خدیجہؓ جو فطری طور پر شرافت و نجابت اور پاکیزگی و طہارت کا مجسمہ تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۵ سالہ رفاقت نے اُن کی خوبیوں اور محاسن کو اتنا مزکّٰی و مصفّٰی کر دیا تھا کہ اُن کی روشن اور درخشندہ سیرت قیامت تک پُوری نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا مینارہ بن گئی۔

اُمّ المؤمنین سیدہ خدیجہؓ نے عمر بھر مہر و اخلاص، محبت و مروّت، پاک نفسی اور قوتِ ایمانی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرپُور حمایت کی۔ مشکلات و آلام کا جب ہجوم ہوتا تو یہ خدیجہؓ ہی تھیں جو آپؐ کو تسلّی دیتی رہتیں۔ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر اضطراب اور بے چینی کی کیفیت طاری ہوتی تو سیدہ خدیجہؓ اپنی محبت و خلوص میں ڈوبی ہُوئی باتوں سے آپؐ کا غم غلط کرتی رہتیں۔ مرحومہ کی شخصیت آپؐ

حکومتِ پاکستان

منسٹری آف فوڈ، ایگریکلچر اینڈ کوآپریٹوز، ایگریکلچرل ریسرچ ڈویژن، پی او بکس نمبر ۱۰۳۱، اسلام آباد

ڈاکٹر بورلاگ میڈل برائے زرعی تحقیق کا ایوارڈ

برائے ۱۹۸۶ء

۱۔ پاکستان میں زراعت کے شعبے میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے اطلاق کی حوصلہ افزائی کے لیے صدرِ پاکستان نے زرعی تحقیق کے شعبے میں غیر معمولی کارکردگی دینے کے لیے ہر سال ایک پاکستانی سائنسدان کو دیے جانے کی غرض سے "ڈاکٹر بورلاگ میڈل برائے زرعی تحقیق" نقد گرانٹ کے ساتھ رائج کیا ہے۔ ایوارڈ کی اہلیت کے مقصد کے لیے زرعی تحقیق میں فصلوں، لائیو سٹاک بشمول پولٹری، فشریز، فارسٹری، رینج مینجمنٹ، زرعی انجینئرنگ اور سوشل سائنسز بشمول زرعی معاشیات پر بنیادی اور اطلاقی تحقیق شامل ہے۔

۲۔ ۱۹۸۶ء کا میڈل دینے کے لیے غور و خوض کی غرض سے زرعی تحقیق کے شعبے میں غیر معمولی کارکردگی دکھانے اور نمایاں کارنامے انجام دینے والے محقق سائنس دان اُمیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ اُمیدواروں نے گہری سائنسی نظر کے ساتھ پاکستان میں زرعی ترقی کے لیے قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہو اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس اجتماعی کوشش میں شرکت کی ترغیب دی ہو۔ اُمیدواروں کی تحقیق سائنسی خصوصیات کی حامل ہو اور اس نے کسانوں کو سائنس اور نئی ٹیکنالوجی استعمال کرنے اور اپنانے کی طرف راغب کیا ہو۔ اُمیدواروں کے کارناموں کی تائید میں دستاویزات مطبوعات کی شکل میں ہمراہ ہوں۔

۳۔ درخواستیں ایگریکلچرل ریسرچ ڈویژن سے دستیاب مجوزہ پروفارمے پر اس طرح بھیجی جائیں کہ وہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء تک زیرِ دستخطی کو پہنچ جائیں۔

(محمد اسلم کیانی)
ڈپٹی سیکرٹری
فون: ۸۲۲۴۰۸

پی آئی ڈی (اسلام آباد) ۵۸/۲۲۲۷

پاکستان ریلویز

چیف کنٹرولر آف پرچیز پی آر۔ لاہور کو مندرجہ ذیل مشتہرہ اور ترمیم شدہ مُشتہرہ ٹنڈروں کے تحت کوٹیشنیں مطلوب ہیں۔

۱۔ مُشتہرہ ٹنڈر نمبر ۱۸/۰۰۶/۱۔۔۔۰/۲۔ ۸۶ (ایف او آر) قیمت ٹنڈر ۵۰/ رُوپے
COIR LOSEE : ۱ آئٹم
تواریخ فروخت ۸۶۔۱۱۔۱۷ تا ۸۶۔۱۲۔۸ مقررہ تاریخ ۸۶۔۱۲۔۹

۲۔ مشتہرہ ٹنڈر نمبر ۱۸/۹۸/۰۰/۰۰۔۔۔۰/۱۔ ۸۶ (ایف او آر) قیمت ٹنڈر ۳۵/ روپے
اے سی سی پسنجر AMENITY پیکٹس : ۱ آئٹم
تواریخ فروخت ۸۶۔۱۱۔۱۸ تا ۸۶۔۱۲۔۱۸ مقررہ تاریخ ۸۶۔۱۲۔۲۰

۳۔ مشتہرہ ٹنڈر نمبر ۱۷/۲۴/۰۰/۰۰۔۔۔۰/۳۔ ۸۵ (ایف او آر) قیمت ٹنڈر ۵۰/ روپے
ایس ایم اینگل ایس ایم پلیٹ و چینل : ۶ آئٹمیں۔
تواریخ فروخت ۸۶۔۱۱۔۱۸ تا ۸۶۔۱۲۔۱۸ مقررہ تاریخ : ۸۶۔۱۲۔۲۰

۴۔ مُشتہرہ ٹنڈر نمبر ۲۱/۲۷/۰۰/۰۳۔۔۔۰/۱۔ ۸۶ (ایف او آر) قیمت ٹنڈر ۲۵/ روپے
پیپر پرنٹنگ مختلف اقسام : ۲ آئٹمیں
تواریخ فروخت ۸۶۔۱۱۔۲۰ تا ۸۶۔۱۲۔۲۰ ۔ مقررہ تاریخ ۸۶۔۱۲۔۲۱

۵۔ مشتہرہ ٹنڈر نمبر ۱۲/۲۲/۰۰/۰۰۔۔۔۰/۲۔ ۸۶ (ایف او آر) قیمت ٹنڈر ۳۵/ رُوپے
ایسبیسٹاس پلیٹڈ پیکنگ ڈرائی : ۵ آئٹمیں
تواریخ فروخت ۸۶۔۱۱۔۲۰ تا ۸۶۔۱۲۔۲۰ مقررہ تاریخ ۸۶۔۱۲۔۲۱

۶۔ مشتہرہ ٹنڈر نمبر ۲۰/۴۷/۰۰/۰۴۔۔۔۰/۱۔ ۸۶ (سی اینڈ ایف) قیمت ٹنڈر ۴۰/ روپے
پرائمری بیٹری ایئر ڈیپولرائزنگ سیل : ۱ آئٹم
تواریخ فروخت : ۸۶۔۱۱۔۱۸ تا ۸۶۔۱۲۔۳۰ مقررہ تاریخ : ۸۶۔۱۲۔۳۱

۱۔ مشتہرہ/ ترمیم شدہ مشتہرہ ٹنڈر فارم دفتر چیف کنٹرولر آف پرچیز۔ پی آر۔ ہیڈ کوارٹرز آفس۔ شارع عبدالحمید بن بادیس لاہور/ ڈپٹی چیف کنٹرولر آف اسٹورز۔ پی آر۔ ریتی لائن کراچی کینٹ اور دفتر اسسٹنٹ کنٹرولر آف اسٹورز ڈیزل، پی آر راولپنڈی سے جملہ کام کے دنوں کی مجوزہ قیمت (ناقابلِ واپسی) کے نقد ادا کرنے پر حاصل کر سکتے ہیں۔ پیشکشیں صرف ٹنڈر فارموں پر قابلِ غور ہوں گی۔

کنور ایم اے قدیر خاں
چیف کنٹرولر آف پرچیز

پی آئی ڈی (لاہور) ۲۱۳۸

... لیے بہت کچھ تھی۔ سیدہ خدیجہؓ کی رفاقت اور قلبی تعلق اہم ... سے بڑے معاملات میں آپ کو ثابت قدم رکھتا جب ... صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے محبت و ایمان کے نور سے چمکتے ... چہرے پر نظر ڈالتے تو آپؐ کا دل شیر ہو جاتا۔ آخر کار ... اس و وفا کے پیکر اس رفیقۂ حیات نے آپ کو داغِ مفارقت ... دیا۔

گھر سے باہر حضرت ابوطالب کی حمایت و اعانت اور گھر میں سیدہ مرحومہ کی غم گسارانہ رفاقت سے محرومی کے بعد آپؐ کے دعوتی کاموں کی راہ میں کتنی شدید مشکلات اور ناقابلِ ... رکاوٹیں حائل ہوئیں، اس کا تصور دل کو لرزا دینے اور ... کو ماؤف کر دینے کے لیے کافی ہے۔ آپؐ اللہ کے رسول ... خدا کی حفاظت اور اس کی تائید آپؐ کے شاملِ حال ... اس لیے تحریکِ اسلامی کا یہ پُرعزیمت کارواں آگے ... بڑھتا رہا۔

❁

سیدہ خدیجہؓ کی سیرت کا سب سے نمایاں اور اہم پہلو آپ کی وہ صفت ہے جسے 'فنائیت' کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اللہ اور اُس کے محبوب رسولؐ کی محبت میں اپنی ذات پوری طرح فنا کر دی تھی۔ آپ مکّے کی سب سے زیادہ دولت مند اور باثروت خاتون تھیں لیکن شادی کے بعد آپ نے اپنی بے پناہ دولت اپنے عظیم ترین شوہر پر نچھاور کر دی۔

سیدہ خدیجہؓ کی زندگی کے آخری سات سال نہایت ناساعد حالات میں گزرے۔ کاروبار کو وسعت اور ترقی دینا تو دُور کی بات تھی، وہاں تو مخالفتوں اور مزاحمتوں کا طوفان اتنی شدت سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اس میں اپنا وجود ہی قائم رکھنا بھی سخت مشکل تھا۔

سیدہ موصوفہ نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی دولت بڑی فراخدلی سے صرف کی۔ اللہ کا دین قبول کرنے والوں کی اعانت و نُصرت کے لیے سیدہؓ کے خزانوں کے مُنہ ہر وقت کُھلے رہتے۔ اسی ایثار اور فراخدلانہ سخاوت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُن کی وفات کے بعد جب رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مکّہ کی ضد اور ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر توحید کا پیغامِ حق پہنچانے کے لیے طائف تشریف لے گئے تو آپؐ نے یہ طویل سفر اپنے خادم زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ پیدل طے کیا۔ آپؐ کی اقتصادی حالت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اس سفر کے لیے آپ کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔

❁

سیدہ خدیجہؓ کی اس پُرخلوص فنائیت اور فدائیت نے اُنہیں اللہ کے ہاں محبوبیت و مقبولیت کے نہایت ارفع مقام پر فائز کر دیا تھا۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے جس کا مضمون درج ذیل ہے :

"جبرئیل علیہ السّلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ خدیجہؓ ابھی ابھی ایک برتن میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر آپؐ کے پاس آئیں گی۔ آپؐ اُن سے ربّ العالمین کا سلام کہہ دیجیے اور میرا سلام بھی اُن کی خدمت میں پہنچا دیجیے۔ اُنہیں جنّت کے ایک ایسے محل کی بشارت بھی دیجیے جو خالص مروارید سے تیّار کیا ہوا ہوگا اور اُس میں کسی قسم کا رنج و الم نہ ہوگا۔"

❁

حضورؐ کے ساتھ شادی کے وقت سیدہؓ چالیس برس کی تھیں اور بیوہ تھیں لیکن اُن کی پسندیدہ شخصیت و سیرت، اُن کے وفادارانہ طرزِ عمل اور اُن کے دلنشین عادات و اطوار نے حضورؐ کے دل میں محبت و اُنسیت اور دلبستگی و وابستگی کا ایک ایسا لطیف اور گہرا نقش ثبت کر دیا تھا کہ آپؐ نے اُن کی موجودگی میں پُوری رُبع صدی تک کسی اور خاتون سے نکاح کا خیال تک نہ کیا، حالانکہ اُس وقت کے معاشرے میں یہ بات بیوی کے لیے وجہ شکایت تھی نہ اُس کے خاندان والوں کے لیے۔

سیدہؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی یاد اور اُن کی محبت کا یہ لافانی سلسلہ بدستور قائم رہا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد بڑی مدّت تک حضورؐ کا یہ معمول رہا کہ گھر سے باہر جانے سے پہلے آپؐ سیدہ مرحومہ کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کرتے۔ اسی طرح گھر میں تشریف لانے کے بعد بھی اُن کی تعریف اور تحسین فرماتے۔ اسی طرح ایک دن آپؐ نے سیدہؓ کا ذکر کیا اور اُن کی خُوب تعریف کی۔ اس پر مجھے رشک آیا اور میں نے کہا:

"یارسُول اللہ! وہ ایک بُڑھیا اور بیوہ خاتُون تھیں۔ خُدا نے اُن کے بعد اُن سے بہتر بیوی آپؐ کو عطا فرما دی۔"

یہ الفاظ سُن کر حضورؐ کا چہرۂ مُبارک غُصّے سے سُرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا:

"خُدا کی قسم! مُجھے خدیجہؓ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اُنہوں نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھُٹلایا۔ اُنہوں نے اپنا زر و مال مُجھ پر قربان کیا جب دُوسروں نے مجھے محروم رکھا۔ اللہ نے اُن کے بطن سے مجھے اولاد دی۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کی یہ کیفیت دیکھ کر میں ڈر گئی اور عرض کیا: "یارسُول اللہ! آئندہ میں خدیجہؓ کے مُتعلق کبھی ایسی ویسی بات نہیں کہوں گی۔"

سیّدہ خدیجہؓ کے ساتھ اسی والہانہ لگاؤ اور نسبت کی وجہ سے آپؐ اُن کے رشتے داروں اور اُن کی سہیلیوں کے ساتھ ہمیشہ حُسنِ سلوک سے پیش آتے؛ چنانچہ جب بھی قُربانی کرتے تو سب سے پہلے سیّدہؓ کی سہیلیوں کو گوشت بھجواتے اور بعد میں کسی اور کو دیتے۔

علّامہ عبدُالبرؒ نے 'الاستیعاب' میں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی بُوڑھی عورت حضُورؐ سے ملنے آئی۔ آپؐ نے حُسنِ اخلاق کے ساتھ بڑی نرمی سے پُوچھا: "تمہارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟"

جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے عرض کی "یہ بُڑھیا کون تھی؟"

آپؐ نے فرمایا: "یہ خدیجہؓ کی سہیلی حسانہ تھی جسے اُن سے محبّت تھی۔"

صحیح بُخاری کی ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "ایک مرتبہ سیّدہ خدیجہؓ کی بہن ہالہ بنتِ خویلد آئیں اور اُنہوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اُن کی آواز سُن کر تڑپ گئے اور فرمانے لگے: خدایا! یہ ہالہ ہوں؛ کیونکہ اُن کی آواز سیّدہ خدیجہؓ کی آواز سے مشابہہ محسُوس ہوتی تھی۔

ابنِ سعد نے اپنی طبقات میں بیان کیا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے داماد اُبُوالعاص بھی تھے۔ قیدیوں کے دُوسرے رشتہ داروں کی طرح حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے زرِ فدیہ بھیجا جس میں وہ ہار بھی تھا جو سیّدہ خدیجہؓ نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر جہیز میں دیا تھا۔

اس ہار کو دیکھ کر حضورؐ پر رقّت طاری ہو گئی اور آنکھیں اشکبار۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

"بہتر ہے زینبؓ کا قیدی فدیے کے بغیر ہی چھوڑ دیا جائے۔"

صحابۂ کرامؓ نے جو اپنے آقا و مولا کی ہر خواہش کا احترام اور اُن کی ہر ارشاد کی تعمیل کو باعثِ سعادت سمجھتے تھے، اُبُوالعاص کو کسی فدیے کے بغیر صرف اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ مکّے جا کر حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیجدیں گے۔

***

مومنوں کی ماں سیّدہ طاہرہ خدیجہؓ کے کردار کا ایک نمایاں جوہر اُن کی بلند ہمّتی اور عالی حوصلگی تھی، اُن کی سیرت کے اس بلند اور باوقار وصف نے اُن میں ہمّت و جُرأت اور عزیمت و استقامت کی بے پناہ قوّت اور ناقابلِ تسخیر طاقت پیدا کر دی تھی۔ آپ نے مصیبت و پریشانی اور ابتلا و آزمائش کے سخت سے سخت دور میں صبر و ثبات کا خُود بھی ثبوت دیا اور اپنے رفیقِ زندگی سرورِ کونین صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھی حوصلہ بڑھا کر حقِ رفاقت ادا کیا۔ اس کی شہادت جنابِ رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے سُنیے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے:

"میں جب کفّار سے کوئی بات سُنتا اور وہ مجھ کو ناگوار معلُوم ہوتی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ میری ڈھارس اس طرح بندھاتیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا ہو۔"

***

سیّدہ خدیجہؓ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اُن کی قوّتوں اور صلاحیتوں اور اُن کے اطوار و عادات میں حد درجہ اعتدال اور حسین توازن اپنے درجۂ کمال تک پہنچا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت اس حکیمانہ فراست و تدبّر سے کی کہ وہ پُوری اُمّت کی بیٹیوں کی طرف سے خراجِ عقیدت اور سلام ارادت کی مستحق بن گئیں۔

اپنی اولاد کے علاوہ اُن افراد کے ساتھ بھی شفقت و محبّت کا وہ سلوک روا رکھا جس سے سیّدہ خدیجہؓ کی ذات کا احترام اور اُن کے مسلک و مشن سے والہانہ لگاؤ اُن کی زندگی کا نصبُ العین بن گیا۔ سیّدنا حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور سیّدنا زیدؓ بن حارثہ سیّدہ موصوفہؓ کے زیرِ تربیت رہے۔ ان دونوں ہستیوں نے اسلام کی سربلندی میں وہ کارنامے انجام دیے جو اسلامی تاریخ کا ایک زرّیں باب بن گئے۔

سیّدہ خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے تین بیٹے تھے۔ ہالہ، طاہر اور ہند۔ یہ سیّدہؓ کے حُسنِ تربیت کا نتیجہ تھا کہ یہ تینوں بھائی حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر شرفِ صحابیت سے مشرّف ہُوئے۔ ہندؓ، جن کی اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ محبّت عشق و فریفتگی کی بلند ترین منزل پر پہنچ چکی تھی، نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ اُنہوں نے اپنی خُداداد صلاحیّتیں بڑے ہی سلیقے سے اللہ کے محبوب کی تعریف و توصیف میں استعمال کیں۔ ہندؓ کے بیان کردہ شمائلِ نبوی سیرت کا بہت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے فصاحت و بلاغت کی خوبیوں کے ساتھ محبّت و شیفتگی کے لطیف اور منوّر جذبات جھلکتے صاف نظر آتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں سوتیلے باپ کے ساتھ والہانہ فریفتگی اور وابستگی کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ ثمرہ تھا سیّدہؓ کی متوازن اور مؤثر شخصیت کا۔

تمام قدیم سیرت نگار مثلاً ابنِ اسحٰق، ابنِ ہشام، طبری ابنِ سعد، کلبی، ابنِ عبدالبرؒ اور علامہ ابنِ حزم اس امر پر متفق ہیں کہ سیّدہ خدیجہؓ کے بطن سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اولاد میں دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ قاسم۔ ۲۔ زینبؓ۔ ۳۔ رقیّہؓ۔ ۴۔ اُمّ کلثومؓ۔ ۵۔ فاطمہؓ ۶۔ عبداللہ۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کا بیان درج ذیل ہے:

"اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہو۔" (سُورہ احزاب آیت ۵۹)

قرآن پاک کی یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ حضورؐ کی ایک بیٹی نہیں بلکہ دو سے زیادہ تھیں، کیونکہ عربی زبان میں دو کے لیے تثنیہ کا صیغہ موجود ہے اور قرآن نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

قاسم اور عبداللہ عہدِ طفولیت ہی میں اپنے ماں باپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آپؐ کی بیٹیوں کے متعلق اجمالی طور پر اس امر کا مطالعہ کیا جائے گا کہ سیّدہؓ کی تعلیم و تربیت نے اُن کی فطری خوبیوں کو کس طرح سنوارا اور اُنہیں کس طرح جلا بخشی۔

حافظ ابنِ حجر کے بیان کے مطابق حضرت زینبؓ کی ولادت مکّے میں اُس وقت ہُوئی جب حضورؐ کی عمر مبارک ۳۰ سال تھی۔ عہدِ جاہلیت ہی میں اُن کی شادی اُن کے خالہ زاد اُبُوالعاص بن ربیع سے ہُوئی۔ آفتابِ نبوّت کے طلوع ہوتے ہی فوراً ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہُوئیں۔ اُبُوالعاص بدستور اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ اختلافِ دین کے باوجود دونوں میاں بیوی کی یگانگت اور محبّت مثالی تھی۔ جنگِ بدر کے بعد ان کے شوہر اُبُوالعاص نے حسبِ وعدہ اُن کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ جب اُن کے دیور کنانہ بن ربیع اُن کو

مدینہ کی طرف لے کر چلے تو کفار نے مزاحمت کی اور ایک بدبخت کے نیزے کی ضرب سے آپ اُونٹ سے گر پڑیں۔ سخت چوٹ آئی۔ وہ حاملہ تھیں اور حمل ساقط ہو گیا۔ اسی تکلیف کی حالت میں آپ اپنے پیارے باپ کے پاس مدینے پہنچیں۔ اسی موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"زینب میری بیٹیوں میں افضل ہے۔ میری وجہ سے اسے تکلیف پہنچی۔"

اُبوالعاص پر سیدہ زینبؓ کی جدائی نہایت شاق گزری۔ ہر وقت مغموم اور بے چین رہنے لگے۔ اُن کے دو اشعار کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:

"مجھے زینب یاد آئی تو مَیں نے کہا حرم کا ہر باشندہ خوش و خرّم اور سر سبز و شاداب رہے۔

زینب تو امین کی بیٹی ہے۔ اللہ اُسے جزا دے وہ تو نہایت ہی نیک اور پارسا ہے۔

اور ایک شوہر اپنی ایسی بیوی کی تعریف ہی کرے گا جو ایسے اعلیٰ اوصاف کی حامل ہو جنہیں میں خوب جانتا ہُوں۔"

اُبوالعاص ایک سلیم الفطرت اور کاروباری معاملات میں نہایت ہی سچے اور کھرے آدمی تھے۔ آخر کار محرّم ۷ھ میں مشرف بہ اسلام ہو کر بارگاہِ نبوی میں مدینہ منورہ پہنچے۔ حضوؐر نے پانچ سال کی مفارقت کے بعد سیدہ زینبؓ کو اُبوالعاص کے گھر بھیج دیا۔

ہجرت کے وقت جو جسمانی صدمہ سیدہؓ کو برداشت کرنا پڑا تھا، اُسی کے اثرات جان لیوا ثابت ہُوئے اور ۸ھ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

سیدہ زینبؓ کی پاکیزہ اور باحیا سیرت کے متعلق اُن کے شوہر کی شہادت سے بڑھ کر اور کونسی شہادت ہو سکتی ہے۔

سیدہ رقیہؓ کی پیدائش کے وقت حضوؐر کی عمر ۳۳ سال تھی۔ کم سنی ہی میں اُن کی شادی ابولہب کے بیٹے عُتبہ سے ہو گئی تھی۔ اعلانِ نبوّت کے بعد ابولہب نے حق دُشمنی میں مغلوب الغضب ہو کر اپنے بیٹے کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو طلاق دینے پر مجبور کیا؛ چنانچہ رُخصتی سے قبل ہی طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد آپ کی شادی سیدنا عثمانؓ بن عفانؓ سے ہُوئی۔ مکّے میں جب کفار کی ایذا رسانیاں انتہا کو پہنچ گئیں تو سیدنا عثمانؓ اپنی بیوی رقیہؓ کے ساتھ اُس قافلے میں شامل ہو گئے جو ہجرت کر کے حبشہ کی طرف جا رہا تھا۔ جب حضوؐر کو اس کی اطّلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا:

"حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت کی ہے۔"

خاصا عرصہ حبشہ میں قیام کے بعد حضرت عثمانؓ کو یہ خبر ملی کہ حضوؐر مدینے کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں تو وہ سیدہ رقیہؓ کے ساتھ مکّے ہوتے ہُوئے مدینے پہنچے۔

۲ھ میں سیدہ رقیہؓ کو چیچک نکلی اور اسی مرض میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ عین اُس وقت جب آپ کی قبر پر مٹّی ڈالی جا رہی تھی، حضرت زیدؓ بن حارثہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینے پہنچے۔

سیدہ رقیہؓ اور سیدنا عثمانؓ میں باہم بے حد محبت تھی۔ اُن کے تعلقات اتنے اچھے، خوش گوار اور مثالی تھے کہ اُن کے متعلق یہ بات ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی:

"رقیہؓ اور عثمانؓ سے بہتر میاں بیوی کسی انسان نے نہیں دیکھے۔"

سچ ہے کسی خاتون کی عظمت کا اندازہ اُس کی گھریلو زندگی ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔

سیدہ اُمِّ کلثومؓ بعثت سے تقریباً پانچ سال قبل مکّے میں پیدا ہُوئیں۔ چھوٹی عُمر میں اُن کا نکاح بھی ابولہب کے دوسرے بیٹے عُتیبہ سے ہُوا تھا لیکن رُخصتی سے پہلے ہی طلاق ہو گئی۔ جب ۲ھ میں سیدہ رقیہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمانؓ کو سخت صدمہ ہُوا۔ حضوؐر نے سیدہ اُمِّ کلثومؓ کی شادی اُن سے کر دی اور نکاح کے وقت سیدنا عثمانؓ سے فرمایا:

"خداوند تعالیٰ نے جبرئیل امین کے ذریعے مجھے حکم بھیجا ہے کہ اپنی بیٹی اُمِّ کلثوم کو اُسی حق مہر پر جو رقیہ کا تھا، تمہارے نکاح میں دے دُوں۔"

سیدہ اُمِّ کلثومؓ اس نکاح کے بعد چھ سال زندہ رہیں اور اُنھوں نے شعبان ۹ھ میں وفات پائی۔

حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ جس وقت سیدہؓ کی میّت قبر میں اُتاری گئی تو حضوؐر قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرأؓ کے سالِ ولادت کے متعلق روایات میں اختلاف ہے لیکن اکثر مؤرخین کے نزدیک "الاستیعاب" کی یہ روایت قابلِ قبول ہے کہ آپ بعثت سے ایک سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ شروع ہی سے نہایت ذہین و فطین اور سنجیدہ تھیں۔ آپ حضوؐر اور سیدہ خدیجہؓ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں، اس لیے سب سے زیادہ لاڈلی تھیں۔

غزوۂ بدر کے بعد ۲ھ میں آپ کی شادی سیدنا علیؓ سے ہُوئی۔ آپ کی سیرت و اخلاق اور عادات و خصائل کی عکّاسی کے لیے ذیل میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔ بُخاری، مسلم اور ترمذی میں ہے کہ ایک دن حضرت علیؓ نے ابنِ عبدالواحد سے فرمایا: "کیا تجھے مَیں فاطمہ بنتِ رسولؐ کی بات بتاؤں جو سارے کُنبے میں حضوؐر کو سب سے زیادہ پیاری تھیں؟"

ابنِ عبدالواحد نے کہا "ہاں!" حضرت علیؓ نے فرمایا:

"فاطمہ نے اتنی چکّی پیسی کہ ہاتھوں میں نشان پڑ گئے۔ پانی کے لیے مشک اُٹھائی کہ گردن پر نشانات آ گئے۔ گھر میں جھاڑو دی کہ سب کپڑے مَیلے ہو گئے۔ اُنھی دنوں حضوؐر کے پاس کچھ خادم آئے۔ مَیں نے فاطمہؓ سے کہا تم اپنے ابا جان کے پاس جاؤ اور ایک خادم مانگ کر لے آؤ۔ فاطمہؓ گئیں مگر کثرتِ ہجوم کے باعث مل نہ سکیں۔ اگلے روز حضوؐر خود تشریف لائے اور پُوچھا کیا ضرورت تھی۔ فاطمہؓ چُپ رہیں۔ مَیں نے مدّعا بیان کیا۔ اس پر نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ کو مخاطب کرتے ہُوئے فرمایا:

"اے فاطمہ! تقویٰ اختیار کر۔ اپنے رب کے فرائض ادا کر۔ اپنے گھر کا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کو اپنا دستور بنا اور جب رات کو بستر پر لیٹے تو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۴ بار الحمدللہ اور ۳۳ بار اللہ اکبر پڑھ۔ یہ عمل تیرے لیے خادم سے بہتر ہے۔"

یہ سُن کر حضرت فاطمہؓ نے فرمایا:

"مَیں اسی حال پر اللہ اور اُس کے رسول سے خوش ہُوں۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضوؐر نے فاطمہؓ کو خادمہ نہ دی۔

اس روایت سے جہاں حضرت علیؓ کے گھر کی معاشی بدحالی اور سیدہ فاطمہؓ کی زہد و ریاضت اور تسلیم و رضا کی راسخ کیفیت سامنے آتی ہے وہیں حضوؐر کی اپنے لیے اور اپنے اہل کے لیے دُنیا کے مال و دولت اور سامانِ آسائش سے بے نیازی کی حکمتِ عملی بہت واضح ہوتی ہے۔

سیدہ فاطمہؓ اپنے پیارے ابا جان کے وصال کے چھ ماہ بعد ہی سب سے پہلے اعلیٰ علیّین میں اُن سے جا ملیں۔ --

ایک دن حضرت شیخ علیؒ پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے اور اپنا خرقہ سینے میں مصروف تھے۔ خرقے کا ایک پلّہ آپ نے اپنی ران پر پھیلا رکھا تھا۔ اسی دوران میں لوگوں نے اُن سے کہا کہ خلیفہ ملاقات کے لیے آ رہا ہے۔

وہ اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہے۔ خلیفہ آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنی نشست کا انداز نہ بدلا۔ یہ دیکھ کر حاجب نے کہا: "یا شیخ اپنے پاؤں سمیٹ لیجیے۔" لیکن آپ نے اُس کی بات پر دھیان نہ دیا، اُس نے اپنی بات دُہرائی۔ آپ پھر بھی اُسی طرح بیٹھے رہے۔

کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ کر خلیفہ جانے لگا تو حضرت نے اپنے ایک ہاتھ میں حاجب اور دوسرے میں خلیفہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: "مَیں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لیے ہیں اس لیے مجھے روا ہے کہ اپنے پاؤں نہ سمیٹوں۔"

(ملفوظاتِ نظام الدّین اولیا ــــ بریگیڈیئر ڈاکٹر منظور احمد)

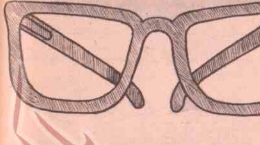

آنکھ

قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت

بچوں کو کون کون سے
امراضِ چشم لاحق ہو سکتے ہیں
اور ان کا علاج کیونکر ہو سکتا ہے؟
ان اہم سوالات کے جواب
ڈاکٹر محمد رمضان نے فراہم کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اَن گنت نعمتوں اور عنایات سے نوازا ہے مگر ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور اسی عدمِ احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم اللہ رب العزت کا شکرانہ تک ادا نہیں کرتے؛ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے "بیشک انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے۔"

لیکن جب قدرتِ خداوندی ہم سے کوئی نعمت چھین لیتی ہے یا وہ شروع ہی سے عطا نہیں ہوتی تو ہمیں اُس کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے اور پھر ہم خدا کے حضور اس گم گشتہ نعمت کی بازیابی کے لیے گڑگڑانے لگتے ہیں۔

نورِ بصارت بھی خالقِ کائنات کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی صحیح قدر و منزلت کا احساس اُنھی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو شروع ہی سے اس نعمت سے محروم ہیں یا پھر بعد میں کسی وجہ سے نابینا پن کا شکار ہو گئے ہیں۔ ہم روزانہ کتنے ہی ایسے لوگوں سے ملتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر تو ہمارے سامنے دستِ سوال دراز کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اُن کی قسمت اور ہیئت کذائی پر افسوس اور اظہارِ ہمدردی کر کے اور کبھی کبھار اُنھیں کچھ خیرات دے کر دوبارہ اپنی دُنیا میں مگن ہو جاتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ ان بیچاروں کے اس حالت تک پہنچنے کی وجہ کیا ہے اور ہم اُن کی بینائی بچانے کے لیے کیا اقدامات کر رہے ہیں۔ یہ تو خیر پُورے معاشرے کا مسئلہ ہے، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم اکثر اپنی آنکھوں کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتے۔ اپنی، اپنے بچوں یا عزیزوں کی نظر خراب ہو جائے یا آنکھوں میں کوئی تکلیف ہو جائے تو بسا اوقات تعلیم یافتہ اور باشعور اور کھاتے پیتے لوگ تک اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ یُوں ہماری معمولی سی غفلت سے ہمارے بچے یا قریبی عزیز بینائی جیسی نعمتِ عظمیٰ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں کتنے ہی لوگ کسی معجزے کی تلاش میں خانقاہوں، پیروں فقیروں اور عطائیوں کے چکر میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتے رہتے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق وطنِ عزیز میں ہر سال تقریباً تیس ہزار سے زیادہ افراد بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا بروقت اور صحیح علاج کیا جائے تو نابینا پن کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے اُنھیں بچایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا نابینا پن قابلِ علاج PREVENTABLE BLINDNESS کہلاتا ہے۔

ہمارے ہاں تعلیمِ صحت کا فقدان ہے اور عام لوگوں میں آنکھوں کی حفاظت کا شعور بہت کم ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے

کہ بصارت سے محرومی فقط بڑھاپے میں لاحق ہوتی ہے؛ حالانکہ پیدائش کے پہلے ہی دن یہ انمول شے ہماری معمولی سی غفلت سے ہمیشہ کے لیے چھن سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے بچوں کی آنکھوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ماؤں سے گزارش ہے کہ وہ درج ذیل باتیں ضرور پیشِ نگاہ رکھیں:

۱ پیدائش کے بعد فوراً دیکھیے کہ بچے کی آنکھ کی پُتلی سفید تو نہیں، اُس کی آنکھوں سے رطوبت تو نہیں بہتی۔ آنکھیں سُرخ تو نہیں۔ پُوری آنکھ یا آنکھ کا سیاہ حصہ یعنی قرنیہ عام بچوں کی نسبت بڑا تو نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بھی بات ہو تو فوراً کسی ماہرِ امراضِ چشم یا آنکھوں کے اسپتال سے رجوع کیجیے۔

۲ اگر خدانخواستہ آپ کے خاندان میں بچوں کو پیدائشی سفید یا کالا موتیے کی تکلیف ہوتی رہی ہے تو اپنے بچے کی پیدائش کے بعد جلد از جلد اُسے آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھائیے۔

۳ بچے کی آنکھ میں ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر کوئی دوا نہ ڈالیے۔

بڑے بچوں کے سلسلے میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھیے:

۱ بچہ مدھم روشنی میں نہ پڑھے یا کتاب پر بہت زیادہ جھک کر نہ پڑھے۔ کتاب اور آنکھوں کے درمیان تقریباً چودہ انچ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ روشنی آنکھوں پر نہیں بلکہ کتاب پر پڑنی چاہیے۔

۲ بچے کو تیز روشنی یا سورج گرہن کی طرف نہ دیکھنے دیجیے۔ اس سے بینائی کو شدید نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔

۳ چلتی گاڑی یا بس وغیرہ میں اور جھولا جھولتے ہوئے پڑھنے سے منع کیجیے۔

۴ خیال رکھیں کہ آپ کا بچہ باقاعدگی سے صاف پانی کے ساتھ ہاتھ منہ اور آنکھیں ضرور دھوئے۔ نیز اُسے کسی دوسرے کا تولیہ یا رومال استعمال نہ کرنے دیا جائے۔

۵ خدانخواستہ اگر بچے کی آنکھ میں گرد و غبار، اُڑتا ہوا کیڑا پتنگا یا کوئی اور چیز پڑ جائے تو اُسے آنکھ مَلنے نہ دی جائے۔ وہ چیز آنکھ سے پانی بہنے پر خود بخود نکل جائے گی ورنہ ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

۶ اگر بچہ بہت قریب سے پڑھتا ہے یا اُسے دُور کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتیں تو فوراً آنکھوں کے ڈاکٹر یا اسپتال سے اُس کی نظر کا معاینہ کروائیے۔

۷ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بچے کو عینک ضرور پہنائیے۔ اس معاملے میں غفلت یا لاڈ پیار بچے کی نشوونما نیز بصارت پر بُرے اور مستقل اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

۸ بازار سے عینک خرید کر بچے کو نہ دیجیے بلکہ پہلے کسی مستند ڈاکٹر سے نظر کی عینک کا نمبر لینا بہت ضروری ہے۔ غلط نمبر والی عینک فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

۹ اگر آپ کا بچہ آنکھوں کے ٹیڑھے پن SQUINT کا شکار ہے تو اسے نظرانداز نہ کیجیے۔ یہ نہ سوچیے کہ بڑا ہو کر خود بخود ٹھیک ہو جائے گا بلکہ جتنا جلد ممکن ہو آنکھوں کے ماہر سے مشورہ کیجیے۔

۱۰ اگر بچے کی آنکھیں دُکھنے لگیں تو فوراً امراضِ چشم کے معالج سے مشورہ کیجیے۔ آپ کی معمولی سی غفلت یا غلط علاج سے بینائی ضائع ہو سکتی ہے۔

۱۱ بچے کو تیز اور نوکدار اشیا مثلاً چاقو، چھُری، بلیڈ، قینچی وغیرہ سے کھیلنے نہ دیجیے۔ آنکھ کو معمولی سی چوٹ بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر چوٹ لگ جائے تو اپنے طور پر یا کسی عام آدمی کے مشورے سے کوئی دوا استعمال نہ کیجیے بلکہ فوراً اسپتال یا آنکھوں کے ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

۱۲ ممکن ہے آپ کا بچہ رات کو یا اندھیرے میں کم نظری کی شکایت کرتا ہو۔ یہ ایک پیدائشی مرض بھی ہے اور وٹامن اے کی کمی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بچے کی مناسب خوراک کا خاص خیال رکھیے۔

والدین کے بعد بچوں کی دوسری تربیت گاہ مدرسہ ہے جہاں اساتذہ کرام پر اُن کی تعلیم و تربیت، عادات و اطوار اور اُن کی رُوحانی اور جسمانی صحت کا خیال رکھنے کی ذمّے داری عاید ہوتی ہے۔ اُن سے گزارش ہے کہ وہ درجِ ذیل اُمور کا خیال رکھیں:

۱ بچہ کتاب آنکھوں کے بالکل قریب کر کے پڑھے، بار بار آنکھیں مَلے یا جھپکے یا بہت زیادہ حسّاس ہو تو اُس کے والدین کو آگاہ کر دیجیے تاکہ وہ مناسب علاج کروا سکیں۔

۲ اگر کسی بچے کی آنکھوں سے رطوبت خارج ہوتی ہو تو اُس

کی بیماری دوسروں کو بھی لگ سکتی ہے، اس لیے اُسے اتنے عرصے تک اسکول آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

تیس سال سے زیادہ عمر کے خواتین و حضرات میں کالا موتیا ایک اہم بیماری ہے جو اندھے پن کا عام سبب ہے۔ اس کی مختلف وجوہات اور علامات ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک خطرناک مرض ہے جو اندر ہی اندر انسان کی بینائی ختم کرتا رہتا ہے اور جب پتہ چلتا ہے تو نظر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اور پھر اس مرحلے پر علاج بھی ممکن نہیں رہتا۔ یہ بیماری انسان کی مرکزی نظر Central Vision پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لیے عام آدمی اور بسا اوقات معالج حضرات بھی اس کی تشخیص کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور پھر اچانک ہی آدمی بصارت سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں درجِ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے:

۱ کیا آپ کے خاندان میں کسی آدمی کو یہ مرض پہلے ہو چکا ہے۔ اس صورت میں آپ اپنی آنکھوں کا معاینہ ضرور کرائیے۔ نیز معالج کو اس حقیقت سے آگاہ بھی کیجیے۔

۲ اگر آپ لکھنے پڑھنے کے لیے نظر کا چشمہ استعمال کرتے ہیں اور اس کا نمبر جلدی جلدی تبدیل کروانا پڑتا ہے تو آپ کالا موتیا کے مریض ہو سکتے ہیں۔

۳ آپ کو اگر روشنی کے رنگ دار دائرے نظر آتے ہوں، خصوصاً اس وقت جب آپ تھک چکے ہوں یا کسی وجہ سے پریشان ہوں تو ماہرِ چشم سے رجوع کیجیے۔

۴ شروع میں یہ بیماری بظاہر بینائی پر اثر انداز نہیں ہوتی لیکن خاموشی سے مریض کی وسعتِ نگاہ کو محدود کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ صرف اپنے سامنے کی چیزیں دیکھ سکتا ہے اور ارد گرد کی نظر بالکل ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ آدمی ایک ٹیوب یا نالی میں سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی حالت میں یہ مرض بالکل لاعلاج ہوتا ہے۔

اگر مندرجہ بالا کسی بھی امر کے متعلق آپ کو شک ہو تو آنکھوں کے ڈاکٹر یا اسپتال سے ضرور رجوع کیجیے۔ ڈاکٹر آپ کی پتلیاں پھیلا کر آنکھ کا اندرونی معاینہ بھی کرے گا۔ نیز آپ کی وسعتِ نظر اور کئی اور پہلو ٹیسٹ کرنے کے بعد آپ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر سکے گا۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کی آنکھوں کو کوئی بھی حادثاتی یا دوسری بیماری لاحق ہو جائے تو نیم حکیموں، عطائیوں اور عام ڈاکٹروں کے بجائے ماہرِ امراضِ چشم سے مشورہ کیجیے۔ آج کل ہر چھوٹے بڑے شہر میں آنکھوں کے ڈاکٹر موجود ہیں۔ بسا اوقات دوسرے لوگ مریضوں کو STEROIDS قطرے لکھ دیتے ہیں اور پھر مریض اپنے طور پر یا اُن کے کہنے پر انھیں طویل عرصے تک استعمال کرتا رہتا ہے اور یہی چیز کالا موتیا جیسے لاعلاج اور موذی مرض کا باعث بن جاتی ہے۔ میں نے کئی نوجوان مریضوں کی بینائی ان قطروں کے مسلسل استعمال سے ختم ہوتے دیکھی ہے، اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ حتی الوسع اپنی آنکھوں کا مُعاینہ اور علاج امراضِ چشم کے ڈاکٹر سے کروائیے۔ ■

مجھے اس حقیقت کا پُورا علم ہے کہ ہمارے خلاف بے پناہ پروپیگنڈہ جاری ہے اور مُسلم انڈیا کی غلط نمائندگی کر کے مسلمانوں کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ آزادی کی تڑپ ہمارے دلوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ہم بھی برطانوی تسلط سے نجات کے مُتمنّی ہیں مگر ہم اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتے کہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں دھکیل دیے جائیں۔ ہم ایک آزاد اور خود مختار پاکستان چاہتے ہیں۔ اور اپنے ہمسایہ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہیں۔

(قائدِ اعظمؒ ——— ۱۳ر دسمبر ۴۶ء کو امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی کو انٹرویو)

اُس شاطر انسان کا تحیر خیز فسانہ
جسے خود
اپنی قسمت کا حال بتانا پڑا۔

نجومی

آر کے نرائن

ترجمہ: فضل قادر

ٹاؤن ہال پارک کے پاس جو املی کا درخت تھا، وہ روزانہ باقاعدگی سے ۱۲ بجے اُس کے نیچے پہنچ کر اپنا تھیلا کھولتا اور اپنے کاروبار سے متعلق اشیا قرینے سے سجا دیتا جس میں درجن بھر کوڑیاں، ایک چوکور کپڑے کا ٹکڑا جس پر ایک ناقابلِ فہم رُوحانی چارٹ بنا ہُوا تھا ــــ نیز ایک نوٹ بک اور ایک بنڈل میں اُوپر سے نیچے لکھی گئی عجیب وغریب تحریروں کے ٹھپے شامل تھے۔

نجومی کے ماتھے پر سیندور اور ہلدی کا قشقہ لگا ہوتا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پُرکشش چمک تھی جو گاہکوں کو مسلسل تاڑتے رہنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ سیدھے سادے گاہک اس چمک میں گیان کی روشنی دیکھتے اور انہیں اس سے ایک قسم کا سکون وسرور حاصل ہوتا۔ آنکھوں کی یہ چمک موقع محل سے گھٹتی بڑھتی رہتی۔ اُس کی آنکھیں اُس کے قشقہ زدہ ماتھے اور گھنیری بڑی بڑی مونچھوں کے درمیان اس طرح روشن رہتیں کہ ایک خاموش طبع بُردبار آدمی بھی مسحور ہو جاتا۔ زعفرانی رنگ کی پگڑی اُس کی شخصیت کے فسوں کو انتہا تک پہنچا دیتی۔ لوگ نجومی کی طرف کشاں کشاں اس طرح کھنچے آتے جیسے گل داؤدی یا چمپا کے پھولوں پر شہد کی مکھیاں منڈلاتی ہیں۔

یہ جگہ جہاں وہ بیٹھتا تھا، بڑی موزوں تھی یہاں پارک میں آنے والوں کی ٹولیاں صبح سے شام تک گھومتی پھرتیں اور طرح طرح کے کاروباریوں کا رنگا رنگ جمگھٹ لگا رہتا۔ اُن میں دوائیں بیچنے والے، چوری کا انگر کھنگر اور دھات کا سامان بیچنے والے، جادُو کا تماشہ دکھانے والے نیلامیے اور سستے کپڑوں کے سوداگر، غرض ہر قسم کے پیشے اور دُکانداری کے لوگ ہوتے جن کی آوازوں سے ایسا شور وشغب اُٹھتا کہ یُوں معلوم ہوتا پُورا شہر ان کی طرف کھنچ آئے گا۔

نجومی کے ساتھ ایک تلی مونگ پھلی بیچنے والا بیٹھتا تھا۔ اُس نے مختلف تلی ہُوئی اشیا کو طرح طرح کے نام دے رکھے تھے جیسے دلّی کے بادام، راجہ پسند وغیرہ وغیرہ۔ اس بھیڑ کا ایک بڑا حصّہ نجومی کے اردگرد منڈلاتا رہتا۔ وہ اپنا کاروبار

مونگ پھلی کے ڈھیر پر جلنے والے ڈیوٹ کی روشنی میں کیا کرتا۔ اس جگہ کی آدمی کشش صرف اس وجہ سے تھی کہ یہاں میونسپلٹی کی طرف سے اردگرد بجلی کی روشنیاں نہیں تھیں۔ اس کا پس منظر وپیش منظر دُکانداروں کی اپنی روشنیوں سے جگمگاتا رہتا۔ کسی دُکاندار نے سسکتے سانس بھرتے گیس کے ہنڈوں سے روشنی کر رکھی تھی، کسی نے پرانے سائیکل لیمپوں سے اور کسی نے بڑی سی مشعل جلا کر۔ نجومی کی طرح دو ایک دُکاندار ایسے بھی تھے جو دوسروں کی روشنی میں اپنا کاروبار کرتے۔ یہ چمکتی ڈُوبتی روشنیاں، جو عجب بہار دکھاتیں، نجومی کے لیے بہت سُودمند تھیں۔ اُس نے اکھاڑے میں اُترنے سے پہلے کبھی نجومی بننے کا نہیں سوچا تھا۔ دوسروں کی زندگیوں میں کیا ہونے والا ہے، اُسے اس بات کا گیان نہیں تھا جس طرح وہ خود اپنی زندگی کے آئندہ لمحوں میں پیش آنے والے مسائل سے نابلد تھا۔ ستاروں کی گردش سے وہ ایسا ہی ناآشنا تھا جیسے اُس کے معصوم گاہک۔ اس لاعلمی کے باوجود وہ ایسی باتیں کہتا جو اُس کے گاہکوں اور ہر کسی کو پسند آتیں۔ اُس کا کام مطالعے، تجربے اور قیاس آرائی کے سہارے چل رہا تھا؛ تاہم یہ کام اُتنی ہی محنت کا طالب تھا جتنی کسی دیانتدار آدمی کو اپنے پیشے میں درکار ہوتی ہے۔ دن ختم ہونے پر جو یافت گھر لے جاتا وہ اُس کا واجب حق معلوم ہوتی تھی۔

اُس نے گاؤں کسی سوچے سمجھے منصوبے یا خیال کے بغیر اچانک ہی چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ وہاں رہ جاتا تو شاید وہی کام کرتا ہوتا جو اُس کے باپ دادا کرتے چلے آئے تھے۔ یعنی کھیتی کسانی کی بوائی جتائی اور شادی۔ پھر اپنے کھیت کھلیان کے درمیان فصل کی طرح پکتا، بُوڑھا ہو جاتا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اُسے گاؤں کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر چھوڑنا پڑ گیا۔ اُسے چین نہ آیا جب تک وہ گاؤں سے کئی سو میل دُور نکل نہ گیا۔ ایک دیہاتی کے لیے یہ بہت بڑی دُوری تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا اُس کے اور اُس کے گاؤں کے درمیان ایک ناپیدا کنار سمندر حائل ہو گیا ہے۔

نجومی نے پیشہ ورانہ انداز میں انسانی مسائل اور دُکھوں جھمیلوں کا تجزیہ کر رکھا تھا۔ لمبے تجربے نے اُس کی آنک پرکھ کی قوت بڑھا دی تھی۔ پانچ منٹ میں وہ پتہ لگا لیتا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں سے ہر سوال کے تین پیسے بطور فیس لیتا اور اپنا مُنہ نہ کھولتا جب تک سامنے بیٹھا سائل دس منٹ تک بول نہ چکا ہو۔ اس طرح اُسے درجن بھر سوالوں کے جواب دینے کے لیے خاصا مواد میسّر آ جاتا۔

جب وہ کسی گاہک کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتا: "جتنی محنت تم کرتے ہو، اُس کا پُورا صلہ تمہیں نہیں ملتا۔" تو دس میں سے نو افراد کو اُس کی ٹھوس رائے سے اتّفاق کرتے ہی بنتی یا پھر جب وہ کہتا: "کیا تمہارے خاندان میں کوئی ایسی عورت ہے جو تم سے کد رکھتی ہو؟" تو بیشتر افراد کو اس کا اقرار کرنا پڑتا۔ پھر وہ گاہک کے کردار کا تجزیہ کرتا: "تمہاری زیادہ تر بدنصیبیاں تمہارے مزاج کے باعث ہیں۔ اور تم اپنے مزاج کا بھی کیا کر سکتے ہو جب تمہارا ستارہ ہی زحل ہو۔ تمہارا دل بہت اچھا ہے لیکن تمہارا خارجی وجود بھونڈا ہے۔" یہ باتیں گاہکوں کے دل کو لگتیں۔ بھلا کون تھا جو اپنے اندرون کے اچھا ہونے کا سُن کر خوش نہ ہوتا ہو؟

مونگ پھلی بیچنے والے نے اپنا ڈیوٹ پھونک مار کر بجھایا اور گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ نجومی کے لیے یہ گویا سگنل تھا کاروبار بند کرنے کا کیونکہ مونگ پھلی والے کے پیچھے وہ اپنا دھندا اندھیرے میں نہیں کر سکتا تھا؛ البتہ اس کی جگہ دُور کی ایک سبز روشنی پڑتی تھی جس سے بوقتِ ضرورت کام نکالا جا سکتا تھا۔

نجومی نے جب اپنی کوڑیاں اور دیگر سامان تھیلے میں ڈالا، عین اُس وقت ایک آدمی سامنے آ کھڑا ہُوا۔ اُس نے ایک نئے گاہک کی نوید سمجھ کر کہا: "یار! بہت پریشان دکھائی پڑ رہے ہو۔ تمہارے لیے مناسب ہو گا کہ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھ سے باتیں کرو۔" دوسری طرف سے ایک مُبہم بُڑبڑاہٹ بلند ہُوئی۔ نجومی نے اُس پر ڈورے ڈالے تو اُس آدمی نے اپنی

ہتھیلی اُس کی ناک کے نیچے یہ کہتے ہُوئے گھسیٹر دی: "تم خود کو بڑا نجومی سمجھتے ہو تو لو دیکھو۔"

اُسے ایک چیلنج گردانتے ہُوئے نجومی نے اُس آدمی کی ہتھیلی بسز روشنی کی پڑتی دھار کی طرف موڑی اور کہا: "تمہاری طبیعت ......"

اُس شخص نے غصّے سے کہا: "چھوڑو اِسے، کوئی کام کی بات بتاؤ۔"

نجومی خجل ہو کر بولا: "مَیں ایک سوال کے تین پیسے لیتا ہُوں۔ تین پیسوں میں تمہیں جو کچھ ملے گا، وہ اُن سے کہیں زیادہ تمہارے لیے مفید ہو گا۔"

یہ سُن کر اُس شخص نے اپنی ہتھیلی کھینچ لی اور ایک آنہ اُس کی طرف اُچھالتے ہُوئے کہا: "مجھے تم سے کچھ سوال کرنے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم بھنگل گا نٹھتے ہو تو تمہیں یہ ایک آنہ بیاج کے ساتھ لَوٹانا ہو گا۔"

نجومی نے کہا: "اگر میرے جواب تمہیں مطمئن کر دیں تو کیا تم مجھے پانچ روپے دو گے؟ نہیں؟ ــــ اچھا، تو پھر مجھے آٹھ آنے تو دو گے۔"

"اچھا، ٹھیک ہے مگر شرط یہ ہے کہ اگر بات اُس کے برعکس ہُوئی تو تم مجھے اکنّی کے بجائے دوئنی واپس کرو گے۔"

کچھ بحث و تمحیص کے بعد یہ معاہدہ طے پا گیا۔ نجومی نے ایک دُعا پڑھی۔ اُس شخص نے بیڑی سُلگائی۔ ماچس کی روشنی میں نجومی نے اُس شخص کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی پھر کاروں کا شور، تانگے والوں کی چلتے گھوڑوں کو گالیاں اور مجمع کی آوازیں بلند ہُوئیں اور تاریکی کی چادر پارک پر تن گئی۔ نجومی سخت پریشان ہو گیا۔ اُس نے نئے گاہک کی اکنّی اُس کی طرف واپس پھینکتے ہُوئے کہا: "لو یہ رکھو۔ مجھے اس قسم کے چیلنج قبول کرنے کی عادت نہیں۔ ویسے اب دیر بھی بہت ہو گئی ہے۔"

اُس نے اپنا بوریا بستر باندھنے کی تیاری شروع کی تو اجنبی نے مُٹھی ہَوا میں لہراتے ہُوئے کہا: "تم اب یہاں سے جا نہیں سکتے۔ تم نے مجھے راہ چلتے گھسیٹا تھا۔"

نجومی کانپ گیا۔ اُس نے تھکی ہُوئی مہین سی آواز میں کہا: "آج چھوڑ دو۔ کل تم سے بات کروں گا۔"

اجنبی نے اپنی ہتھیلی اُس کی ناک کے نیچے گھسیٹرتے ہُوئے کہا: "چیلنج تو چیلنج ہے ــــ چلو بتاؤ میری قسمت۔"

نجومی کھنکارتے ہُوئے بولا: "اچھا، تو یہ ایک عورت کا ..."

ابھی وہ اسی قدر کہہ پایا تھا کہ اجنبی چیخا: "بند کرو لغویات! مجھے یہ بتاؤ کیا اُس کا کھوج پا سکوں گا جسے ڈھونڈ رہا ہُوں۔ اس کا جواب دو، تب ہی یہاں سے جا سکو گے ورنہ مَیں تمہارے سارے ٹکے چھین لوں گا۔"

نجومی نے کچھ منتر سا پڑھا اور کہا: "جو مَیں کہوں اگر وہ سچ نکلے تو مجھے ایک روپیہ تو دو ہی گے نا۔ دیکھو، اگر تم نے نہیں دیا تو مَیں لب کشائی نہیں کروں گا۔ پھر تمہارا جو جی چاہے کر لینا۔"

خاصی ردّ و کد کے بعد معاملہ طے ہو گیا تو نجومی نے کہا: "تمہیں مُردہ سمجھ لیا گیا تھا ــــ بتاؤ یہ سچ ہے نا ــــ؟"

"اچھا، کچھ اور بتاؤ نا۔" اجنبی نے بے صبرے پن سے کہا۔

"ایک مرتبہ تمہیں چاقو بھی مارا گیا تھا۔ ٹھیک ہے بھلے آدمی؟"

اجنبی نے اپنا سینہ برہنہ کر کے زخم کا نشان دکھایا اور بولا: "اچھا، اور کچھ بتاؤ۔"

"ہاں، تو پھر تمہیں ایک کنویں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ وہ سمجھا تم مر گئے ہو۔"

"ہاں ہاں، اگر ایک راہ گیر کنویں میں نہ جھانکتا تو مَیں مر ہی گیا ہوتا۔" پھر اُس نے گھونسا تان کر کہا: "بتاؤ کیا مَیں اُس کا کھوج لگا سکوں گا؟"

"وہ تو تمہیں اب اگلی ہی دُنیا میں مل سکے گا۔ کوئی چار ماہ ہُوئے، ایک دُور دراز گاؤں میں وہ فوت ہو چکا ہے۔ اب تم اُسے کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

اجنبی یہ سُن کر آہیں بھرنے لگا۔ نجومی نے بات جاری رکھتے ہُوئے کہا: "گرو نائیک!"

اجنبی ایک دم چونک پڑا: "ارے! تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

"ایسے ہی جیسے اور تمام باتیں جانتا ہُوں۔ اچھا گرو نائیک! اب میری ہر بات سُنو۔ تمہارا گاؤں یہاں سے اُتر کی طرف دو دن کے رستے پر ہے۔ جلدی سے پہلی گاڑی پکڑو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ مَیں پھر تمہارے گرد خطرے منڈلاتے دیکھ رہا ہُوں۔" اُس نے مقدس سیندور کی ایک چٹکی کھیسے سے نکالی اور اُسے اجنبی کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا: "اسے اپنے ماتھے پر مل لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ کبھی دکھن دِشا میں سفر نہ کرو تو تم سو برس تک زندہ رہ سکتے ہو۔"

"گھر سے دُور اب کیوں جاؤں گا؟ مَیں تو کبھی کبھار اُسے ڈھونڈنے اور اُس کا گلا گھونٹنے کی خاطر نکل پڑتا تھا۔" اُس نے حسرت سے بڑبڑاتے ہُوئے کہا۔ "وہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مجھے یقین ہے اُسے اپنے کیے کا پھل بھوگنا پڑا ہے۔"

"ارے! وہ تو ریل کے نیچے آ گیا ہے۔" نجومی نے انکشاف کیا۔

اجنبی یہ سُن کر مُسکرا اُٹھا۔

ہری بتّی بُجھ جانے سے وہ ساری جگہ سُنسان ہو گئی۔ اجنبی شخص نجومی کو مُٹھی بھر پیسے دینے کے بعد رات کی تاریکی میں کہیں چل دیا۔

آدھی رات کے لگ بھگ نجومی گھر پہنچا۔ بیوی باہر دروازے پر کھڑی اُس کی راہ تک رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اُس نے کڑی جواب طلبی شروع کر دی: "اتنی رات گئے تک تم کہاں تھے؟" نجومی نے ریزگاری اُس کی مُٹھی میں ٹھونستے ہُوئے کہا: "ایک آدمی نے یہ سارا پیسہ دیا ہے۔"

اُس کی بیوی نے ریزگاری گِنتے ہُوئے کہا: "ساڑھے بارہ آنے!" وہ خوشی سے کِھلی جا رہی تھی۔ "کل مَیں کچھ گڑ اور ناریل خرید سکوں گی۔ کتنے ہی دن سے مُنّا مٹھائی کے لیے ضد کر رہا ہے۔ مَیں اُس کے لیے عمدہ سی کوئی چیز بنا دوں گی۔"

"اوہ! اُس سُؤر نے مجھے ہاتھ دکھا دیا نا۔ اُس نے مجھ سے ایک روپے کا وعدہ کیا تھا اور دیے ساڑھے بارہ آنے۔"

نجومی کی بیوی نے اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "تم پریشان سے دکھائی پڑتے ہو۔ بات کیا ہے؟"

"پہلے کچھ کھا پی تو لوں، پھر بتا بھی دوں گا۔"

کھانا کھانے کے بعد پرالی پر بیٹھتے ہُوئے اُس نے کہا: "تمہیں علم نہیں آج میرے کاندھوں سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ یہ ایک آدمی کے قتل کا بوجھ تھا۔ میرا خیال تھا میری ضرب سے وہ مر گیا تھا مگر نہیں وہ تو زندہ ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ مَیں اسی لیے تو اپنے گاؤں سے بھاگ آیا تھا اور یہاں تم سے شادی کر لی تھی۔"

"اچھا! تو کیا تم نے کسی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟" اُس کی بیوی نے جذبات سے ہانپتے ہُوئے پُوچھا۔

"ہاں، یہ اُس وقت کی بات ہے جب مَیں ایک سر پھرا چھوکرا تھا۔ ہم اکٹھے مل بیٹھ کر شراب پیتے، جوا کھیلتے اور آپس میں دھینگا مُشتی بھی کر لیتے تھے۔ چلو چھوڑو، اب ایسی باتوں کا سوچنا کیا!" دوسرے ہی لمحے جماہی لیتے ہُوئے اُس نے کہا: "اب سونے کا وقت ہو گیا۔" اور پھر پرالی پر مزے سے پاؤں پسار کر پڑ گیا۔

لسانی تعصبات کو فتنہ بنا کر اس میں مرنے والے اگر شہید ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں شہادت کا مفہوم ہی نہیں معلوم ــــ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں یہ جدّ و جہد تعمیری ہے؟ ذرا اپنے ضمیر سے پُوچھو۔ ایک مُلک کی وحدت و سالمیّت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اَلمیہ ہو سکتا ہے کہ اُس کی زبان ایک نہ ہو۔

(سلمیٰ اعوان کے ناول "تنہا" سے اقتباس)

زمستان

آئندہ کے لیے موضوع "رفتار" ہے۔ اس موضوع پر اپنے پسندیدہ ایک یا دو اشعار ۲۰ دسمبر تک بھجوا دیجیے۔ اشعار کے ساتھ شاعر کا نام ضرور تحریر کیجیے۔ اس سے اگلے ماہ کے لیے موضوع "شبنم" ہے، اس موضوع پر اشعار ۲۰ جنوری تک بھجوائے جا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

○ رشید عامر، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

تیرے نغموں میں اثر اندوہ و حرماں کا نہیں
سال میں تیرے گزر فصلِ زمستاں کا نہیں
(سُرور جہاں آبادی)

○ نویدالاسلام عثمان غنی، منصورہ، لاہور

اے شامِ زمستاں کی الم ریز ہواؤ
پیغام کوئی صبحِ بہاراں کا بھی لاؤ
(یزدانی جالندھری)

○ لیاقت علی قیصر، چک ۲۹۱ گ ب نزد جانہ

خدا نے موسموں کو اک تنوّع سے کیا پیدا
زمستاں گر نہ ہوتا رنگ کھلتا کیسے گرما کا
(محسن فارانی)

○ رفیع الدین ذکی قریشی، گل زیب کالونی، لاہور

بے رنگ سے پتّوں پہ ہیں شبنم کے کچھ آنسو
آ دیکھ زمستاں کا گلستاں کو رُلانا!!
(ذکی قریشی)

○ عمران خالد، ماڈل ٹاؤن، لاہور

نہ پتّے، نہ غنچے، نہ پھول اور سبزہ
گلستاں گلستاں ہے رقصِ زمستاں
(یزدانی جالندھری)

پہچان میں آتی نہیں تصویرِ گلستاں
یہ فصلِ زمستاں نے عجب رنگ بھرا ہے
(زہیر کنجاہی)

○ محمد امین لون، کالا گوجراں، جہلم

○ مہر نسیم، لاہور

○ ملک ظفر اقبال اسعد، انگہ وادیٔ سون

○ ریحانہ کوثر، راشدہ سعیدہ، منصورہ، لاہور

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی
(علامہ اقبالؔ)

○ سمیحہ وقار، اقبال ٹاؤن، لاہور

احساس کی نرمی ہے نہ جذبات کی گرمی
بے درد کا دل فصلِ زمستاں کی طرح ہے
(خدیجۃ الاسماء)

○ غلام صابر، چک ۱۰۵/ ٹی ڈی اے، لیّہ

گلستاں کے بدلتے رنگ سہہ اے طائرِ ناداں
تمنّا پھول کی بے سُود ہے فصلِ زمستاں میں
(محسن فارانی)

○ محمد سلیم۔ رائیونڈ

اِس نے تو جلا ڈالے بہاروں کے لبادے
یہ برف تھی یا آگ زمستاں کی ہوا میں
(رشید جہاں گیلانی)

○ عبدالنّاصر، کمالیہ

نہ کرب آمیز نغمے کس لیے ہوں عندلیبوں کے
گلستاں کی قبائیں نوچ پھینکی ہیں زمستاں نے
(عنایت)

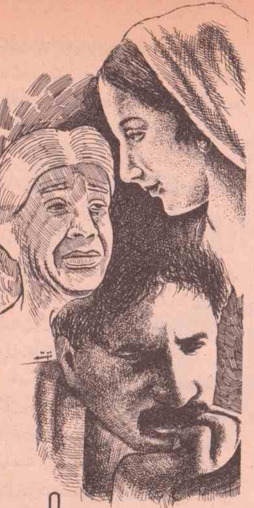

سچا رشتہ

رشتوں کے سراب سے اُبھرنے والی وفا شعاریوں کی انوکھی داستان۔

نگہت فردوس آفندی

شام کا وقت تھا۔ حسبِ معمول پُورے گھر میں سنّاٹا چھایا ہُوا تھا۔ صحن کے بیچ میں بچھی چارپائی پر لیٹا کمالؔ آسمان پر نظریں جمائے ہُوئے تھا۔ تین چار رنگارنگ پتنگیں اُڑ رہی تھیں۔ کئی کبوتر دائرے کی شکل میں اوپر سے نیچے غوطے لگا رہے تھے۔ وہ خاموش لیٹا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر قبل سکینہ اُس کو سہارا دیے کمرے سے باہر لائی تھی اور پھر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی اُس کا وضو کرایا تھا۔ فالج کی وجہ سے اُس کا ایک پیر بالکل بیکار ہو گیا تھا اور ایک ہاتھ بھی ٹھیک طرح کام نہیں کرتا تھا۔

عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ یونہی لیٹا آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ خدا جانے کن گزرے لمحوں کا حساب کر رہا تھا۔ چڑیوں کا جھُنڈ اُس کے اُوپر سے گزر رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے دو چڑیاں پیچھے رہ گئیں اور جھُنڈ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ کمالؔ تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر سکینہ بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ اُس کا سفید بالوں والا سَر جھُکا ہُوا تھا۔ اور جھرّیوں بھرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھنے لگا۔

اُس نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا تو کتنے سارے لوگ ہمسفر بن کر ساتھ چلے تھے لیکن اپنی اپنی منزل پر پہنچ کر سب نے راستے بدل لیے اور پھر یہی وہ ایک ہستی تھی جو دورانِ سفر نجانے کس راستے سے اچانک نکل کر اُس کے ساتھ ہو لی اور زندگی کی پیچ در پیچ راہوں پر اب تک اُس کا ساتھ دیے جا رہی ہے۔

کمالؔ سوچ رہا تھا۔ سکینہ جب اس گھر میں آئی تھی تو اُس کے یہی سفید بال ساون کی گھٹاؤں جیسے کالے اور چمکیلے تھے۔ گلاب کے پھُولوں کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ تھی وہ۔ پھر اچانک ہی سفید بالوں کے بجائے سیاہ چمکیلے بالوں والی نوخیز سی لڑکی نے لے لی اور کمال کا ذہن چالیس برس پہلے ماضی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اُس نے شادی سے پہلے اپنی ہونے والی دُلہن دیکھی نہیں تھی۔ بس ماں نے جس کے ساتھ اُس کی زندگی کی ڈور باندھنی چاہی، اُس نے کسی پس و پیش کے بغیر ہامی بھر لی۔ شادی کی رات اُس

نے پہلی بار اپنی شریکِ حیات کو دیکھا کومل کومل سی نوخیز لڑکی دُلہن کے رُوپ میں اُس کے سامنے تھی۔ تب کمال کے گوشۂ دل میں چھپے نرم اور لطیف جذبے جاگ اُٹھے تھے۔ سکینہ کو پاکر وہ مسرور سا ہوگیا۔

سکینہ عورتوں کے بیچ میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی رہتی اور کمال اُس کی ایک جھلک دیکھنے کو بیقرار سا پھرتا۔ کئی دن یونہی ہنگاموں میں گزر گئے۔ جب سب مہمان رُخصت ہُوئے تو اُس نے سُکھ کا سانس لیا مگر اس کے ساتھ ہی ابا نے اُس کی چھٹیاں ختم ہونے کا اعلان کر دیا کیونکہ اُس کی غیر موجودگی سے کاروبار پر خاصا اثر پڑ رہا تھا۔ کمال بُجھ سا گیا۔ ابھی تو اُس نے اپنی دُلہن سے اچھی طرح باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ اُس کی مجال نہ تھی کہ والدین کے حکم کی سرتابی کرتا، لہٰذا کام پر جاتے ہی بنی۔

اماں روز صُبح سویرے اُس کے کمرے کا دروازہ پیٹ کر آواز لگاتیں: "کمال! سویرا ہوگیا، اب اُٹھ جاؤ" اور وہ آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھتا۔ رات کے وقت واپس آتا تو سکینہ باورچی خانے میں مصروف ہوتی۔ کمال اماں کو سلام کرنے کی غرض سے اُن کے کمرے میں جا بیٹھتا اور وہ دُنیا جہان کے موضوع چھیڑ کر اُسے باتوں میں اُلجھائے رکھتیں۔ رات کا کھانا بھی اماں اُس کے لیے اپنے کمرے ہی میں منگوا لیتیں اور کھانے اور باتوں سے فرصت پاکر وہ اپنے کمرے میں پہنچتا تو سارے دن کی تھکی ہاری سکینہ سو چکی ہوتی۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے سامنے سکینہ سے بات کرنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ دو ایک بار اُس نے سب کی موجودگی میں اُس سے بات کرنی چاہی تو اماں کی نظریں اُسے گھورتی محسوس ہُوئیں جن کی تاب نہ لا کر وہ وہیں دبک جاتا۔

ایک مرتبہ ابا نے کسی کام کے سلسلے میں اُسے دہلی بھیجا۔ وہاں بازار میں گھومتے پھرتے اُس کی نظر بڑے بڑے خوبصورت آویزوں پر پڑی اور فوراً ہی اُس کے ذہن میں سکینہ کا چہرہ گھوم گیا۔ "سکینہ کو یہ خوبصورت آویزے کتنے سجیں گے!" یہ سوچتے ہُوئے اُس نے فوراً ہی وہ خرید لیے۔

پہلی بار کمال نے سکینہ کو ایک تحفہ پیش کیا تو اُس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی۔ جھٹ اُس نے کانوں میں پہنے اور خوشی خوشی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ہر زاویے سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ اُسی وقت باہر برآمدے میں اماں اور شاہدہ کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"ہمارے لیے تو بھائی آج تک ایک دھیلے کی بھی چیز نہیں لائے!" شاہدہ روتے ہُوئے کہہ رہی تھی۔

"بہنوں کے لیے تو کبھی کچھ لانا نصیب ہُوا نہیں، بیوی کے لیے جھٹ آویزے آ گئے!" اماں کی آواز میں طنز اور غصے کی آمیزش تھی۔

کمال گھبرا سا گیا۔ اور پھر اُس نے مردوں کا وہی وعدہ جو کبھی وفا نہیں ہوتا، سکینہ سے کیا:

"ہم تمہارے لیے اور لا دیں گے۔" یہ کہتے ہُوئے اُس نے ہاتھ پھیلا دیے اور سکینہ نے بُجھے دل سے اُتار کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

اور پھر کمال کا کھوکھلا وعدہ کبھی وفا نہ ہو سکا۔ ماں بہنوں کے ڈر سے اُس نے کبھی سکینہ کے لیے کوئی چیز لینے کا سوچا تک نہیں۔

سکینہ کو دیکھ کر اُس کے دل میں جو جذبے پیدا ہُوئے تھے وہ دھیرے دھیرے سوتے جا رہے تھے۔ اُس نے اُسے اہمیت دینی بالکل ہی چھوڑ دی تھی اور دوبارہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی دُنیا میں کھو گیا تھا۔ سکینہ بھی اُس کے رویے کی وجہ سے بُجھی بُجھی رہنے لگی تھی، الگ تھلگ، خاموش سی وہ کام کاج میں مصروف رہتی۔ اماں اُس کے کاموں میں سو سو کیڑے نکالتیں، نندیں مذاق اُڑاتیں۔ ابا اکثر جھڑک دیتے اور دیور بیسیوں چھوٹے موٹے کام اُس سے کرواتے رہتے۔ سکینہ چُپ چاپ سب کچھ برداشت کرتی۔ ایک لفظ بھی تو شکایت کا زبان پر نہ لاتی۔ شکوہ کرتی بھی تو کس سے؟ جس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر اس گھر میں آئی تھی، وہ تو اپنی دُنیا میں مگن تھا۔ اُس نے کبھی اس کی دلجوئی یا اپنے گھر والوں کی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ تو بس خاموش تماشائی تھا اس گھر میں۔

جس مرد کی خاطر عورت اپنے پُرانے رشتے ناطے توڑ کر اجنبی لوگوں اور نئے گھر میں آتی ہے، اگر وہی بے رُخی سے پیش آئے تو عورت کے دل پر کیا بیتتی ہو گی؟ کمال کو اس بات کا کبھی احساس ہی نہیں ہُوا۔ اُس کی نظر میں سکینہ جذبات سے عاری ایک بیکار سی ہستی تھی جسے وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کے لیے اس گھر میں لایا تھا۔ کئی بار اُس نے بیوی کی آنکھوں میں مچلتے سوالات محسوس کیے لیکن کبھی پُوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

✦

اُس رات وہ گھر واپس آیا تو اماں کا پارہ چڑھا ہُوا دیکھا۔

"تم بھی کان کھول کر سُن لو۔ آج سے سکینہ کا میکے جانا بند ہے۔" اماں نے غصّے بھری آواز میں کہا۔

"کیوں؟ کیا بات ہو گئی۔" وہ حیران ہو کر بولا۔

"اس کے باپ نے جمال کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے سکینہ کی ماں کا کہنا ہے کہ ہم نے ایک بیٹی دے کر دیکھ لیا۔" اماں نے جلے بھُنے لہجے میں بتایا۔

"لیکن اس میں سکینہ کا کیا قصور ہے؟" کمال بولا۔

"شرم نہیں آتی، ماں کے سامنے بیوی کی طرفداری کرتے ہُوئے؟" اماں نے غصّے سے آنکھیں نکالیں تو کمال دبک گیا۔

ایک رات سکینہ نے اُس کا سر دباتے ہُوئے کہا: "آج مَیں پڑوس میں میلاد شریف میں گئی تھی۔ وہاں امّی کے پڑوس کی ایک عورت بھی آئی تھی۔ اُس سے پتہ چلا کہ امّی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بس ہر وقت مجھے یاد کرتی رہتی ہیں۔" سکینہ آس بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہوں!" کمال نے ٹالنا چاہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو . . . ."

"سکینہ! تمہیں معلوم ہے کہ مَیں امّی کا کوئی حکم نہیں ٹال سکتا۔" کمال اُس کی بات کاٹتے ہُوئے تُرش لہجے میں بولا اور پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ خاصی دیر تک اُسے بیوی کی دبی دبی سسکیاں سُنائی دیتی رہیں لیکن اُسے اُس کے جذبات کی پروا کب تھی۔

ایک رات وہ گھر آیا تو ایک ہنگامہ سا مچا ہُوا تھا۔ ابا آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ بہنوں کے مُنہ سُوجے ہُوئے تھے۔ صحن میں چکر کاٹتی اماں آگ بگولا ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہو گئی؟" کمال نے پُوچھا۔

"بہت سر چڑھا رکھا ہے تم نے اپنی لاڈلی بیوی کو۔ اماں باپ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تمہارے نزدیک۔ بس تمہارے لیے سب کچھ وہی ہے۔ ہم تو کچھ نہیں لگتے تمہارے۔" اماں چنگھاڑ رہی تھیں۔

"نہیں اماں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مَیں تو آپ سب ہی کا کہا مانتا ہُوں۔" کمال گڑبڑا سا گیا۔

"ہو آئیں تمہاری بیگم صاحبہ اپنے میکے۔ میری بات تو دو کوڑی کی کر دی۔" اماں نے اُسے گھُورتے ہُوئے کہا۔

"لیکن وہ کیسے گئی؟" کمال نے حیرانی ظاہر کی۔

"اپنی دوا لینے کے بہانے گھر سے گئی تھی۔ وہ تو جمال نے اُسے اپنے ابا کے محلّے سے نکلتے دیکھ لیا ورنہ ہمیں تو کانوں کان خبر نہ ہوتی!" اماں چراغ پا ہو کر بولیں۔

"اُس کی یہ مجال!" کمال بڑبڑاتے ہُوئے تیر کی طرح اپنے کمرے میں پہنچا۔

سکینہ سہمی بیٹھی تھی۔ "میری امّی کی طبیعت بہت خراب ہے۔" کمال کو دیکھ کر وہ منمنائی۔

"امّی کی بچّی!" کمال نے آگے بڑھ کر دو تین زنّاٹے دار تھپڑ اُس کے مُنہ پر دے مارے۔ "اتنی جراُت ہو گئی تجھے! سب کے سامنے ذلیل کروا دیا مجھے کمینی عورت نے۔" کمال غصّے میں پیر پٹختا باہر چلا گیا اور سکینہ پلنگ پر اوندھے مُنہ گر کر سسکنے لگی۔

دو روز بعد صُبح ہی صُبح سکینہ کی ماں کے انتقال کی خبر آگئی۔ اماں نے کمال کو اس شرط پر جانے دیا کہ وہ سرِ شام ہی سکینہ کو لے کر واپس آجائے گا۔ ماں کی میّت سے لپٹ کر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر دیر تک روتی رہی اور شام کو سُوجی ہُوئی آنکھیں لیے چُپ چاپ کمال کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔

✦

ڈھیر سارے دن یُونہی گزر گئے۔ سکینہ ایک بچّی کی ماں بن گئی۔ بچّی کی پیدائش پر سب لوگ بہت خوش ہُوئے۔ سارا دن ننھی مہناز دادی اور پھپھیوں کی گود میں رہتی اور سکینہ باورچی خانے میں جُتی رہتی۔ نجانے کیوں اماں اُسے بچّی کے زیادہ قریب نہ آنے دیتیں۔ کئی بار سکینہ نے کمال سے دبے لفظوں میں شکایت بھی کی۔

"وہ سب تم سے زیادہ خیال رکھتے ہیں بچّی کا۔" کمال اُلٹا اُسے ہی جھڑک دیتا۔

مہناز کے بعد سلیم اُس کی گود میں آگیا، اور وہ سلیم کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ خاصے دن یُونہی بیت گئے۔ ابا کے بائیں طرف فالج کا حملہ ہُوا اور اُن کا آدھا حصّہ مفلوج ہو گیا۔ اُن دنوں بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ چلچلاتی دوپہر میں کمال کا حلق سُوکھ گیا تو وہ پانی پینے کی غرض سے برآمدے میں آیا۔ وہاں انتہائی تپش میں بیٹھی سکینہ ہاون دستے کے اندر کچھ کُوٹ رہی تھی۔

"کیا کُوٹ رہی ہو اس وقت؟" کمال نے پُوچھا۔

"ابا کی دوائیں۔" سکینہ نے جواب دیا۔

کمال کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اُس نے سکینہ کی طرف دیکھا۔

"وہ میرے بھی تو ابا ہیں نا۔" سکینہ اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔

"جس عورت کے جذبات اور احساسات کو اُس نے اور اُس کے گھر والوں نے بُری طرح روند ڈالا تھا، وہ کتنا صاف اور سچا دل رکھتی ہے۔ کمال کو اُس روز پہلی بار احساس ہُوا۔

سکینہ اور تمام گھر والوں کی تیمارداری کسی کام نہ آسکی اور ایک صُبح گھر کے بزرگ ترین فرد نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ ابا کی موت سے کمال کو اپنے اندر خلا سا محسوس ہونے لگا۔ کاروبار کا سارا بوجھ اُس کے شانوں پر آپڑا۔

ابھی وہ پُوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مسلمانانِ ہند نے اپنا الگ ملک حاصل کر لیا اور اُن سب نے پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے باپ نے ساتھ چھوڑا تھا اور اب وہ مٹی جس میں اُس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں دفن تھیں اور جہاں اُس کا بچپن ہنستے کھیلتے گزرا تھا، پرائی ہو گئی تھی۔ بلوائیوں نے اُن کا سارا قیمتی سامان لُوٹ لیا۔ بڑی مشکلوں سے وہ صرف ضروری کاغذات بچا پایا۔ لُٹے ہُوئے قافلے کے ہمراہ وہ پاک سرزمین کی پناہ میں چلے آئے۔

یہاں آتے ہی اُس نے کلیم کے کاغذات داخل کر دیے اور کچھ ہی عرصے بعد اُسے بھارت میں چھوڑے ہُوئے اپنے کاروبار کا صلہ مل گیا۔ اب پھر نئے سرے سے اُنہوں نے گھر بسانا شروع کیا۔ پھر شاہدہ اور خالدہ کے رشتے آگئے اور اُنہیں رُخصت کرتے وقت کمال سوچ رہا تھا: "کیا سب رشتے ناتے عارضی ہوتے ہیں۔ ایک ہی ڈگر پر چلنے والے مسافر تھوڑی دُور ساتھ چلنے کے بعد اپنے اپنے راستے جدا کرتے چلے جاتے ہیں۔"

دونوں بیٹیوں کو رُخصت کرنے کے بعد اماں، جمال کی دلہن لے آئیں۔ کمال کے چمن میں اور کئی پھُولوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جمال کی دُلہن کچھ دن تو اُن کے ساتھ رہی اور پھر اُس نے ناک بھُوں چڑھانی شروع کر دی۔ جلد ہی جمال نے علیحدہ گھر میں رہنے اور باپ کے کاروبار میں سے اپنا حصّہ لینے کا مطالبہ کر دیا۔ کمال گھبرا گیا۔ ابھی پُوری طرح کاروبار جما بھی نہیں تھا۔ اپنا خُون اتنی جلد سفید ہو جائے گا، محبت کرنے والا بھائی یُوں ایک دم آنکھیں پھیر لے گا، کمال کو ہرگز اُمید نہیں تھی۔ وہ تو جمال کو اپنا ایک بازو سمجھتا تھا، اُس کی خاطر تو اُس نے بہت کچھ کیا تھا لیکن اب وہی بھائی بیچ منجدھار کے اُس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو رہا تھا۔ کمال کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

"خاندان کو بکھرنے سے بچانے اور دلوں کو نفرتوں کی آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمال کو اُس کا حصّہ دے دیا جائے۔" سکینہ نے سمجھایا۔

اور کمال جو عورتوں کو ناقص العقل سمجھتا تھا اور بیویوں کی اُس کے نزدیک بھرے سے کوئی وقعت نہیں تھی، نجانے کیسے یہ بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ جمال کو حصّہ دے کر بیٹھا ہی تھا کہ سُسرال والوں کے مجبور کرنے پر خالدہ اور شاہدہ باپ

کی جائیداد میں سے اپنا اپنا حصّہ وصول کرنے آ گئیں۔

"بہنوں کا حصّہ بھی دے دو ورنہ اُن کے گھر اُجڑ سکتے ہیں۔" سکینہ نے ایک بار پھر سمجھایا۔

کمال نے یہ کام بھی کر ڈالا اور پھر اپنے حصّے سے از سرِ نو کاروبار جمانے کی جدوجہد کرنے لگا۔

✦

موسم آتے جاتے رہے۔ رُتیں بدلتی رہیں۔ وقت کا پہیّہ تیزی سے گھومتا رہا۔ بہت سارے سال یادوں کے نقوش دلوں پر ثبت کرتے گزر گئے۔ اماں کے انتقال کو کئی برس بیت چکے تھے۔ اب کمال بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس کے پانچوں بچے جوان ہو گئے تھے۔ اُس کے آشیانے میں پرورش پانے والے، بال و پر نکل آنے پر، اب اُڑنے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔

سب سے پہلے بڑے بیٹے سلیم نے رختِ سفر باندھا۔ ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لینے وہ امریکہ پہنچا اور پھر وہاں کی بھول بھلیوں میں گُم ہو گیا۔ ممتاز اور کشور شادی ہو جانے پر اس گھر سے رُخصت ہو چکی تھیں۔ نعیم مشترکہ خاندان کا قائل نہیں تھا اس لیے اُس نے شادی سے پہلے ہی اپنا گھر الگ بنا لیا اور اُس کی دُلہن رُخصت ہو کر سیدھی وہیں چلی گئی۔ سب سے چھوٹے بیٹے ندیم نے کچھ عرصے ماں باپ کی تنہائی کا خیال رکھا لیکن جلد ہی مستقبل بنانے کی فکر میں بال بچوں سمیت وہ بھی پردیس میں آباد ہو گیا۔

قافلہ جا چکا تھا اور میرِ کارواں لق و دق صحرا میں اکیلا گُم صُم کھڑا تھا۔ اُس نے مُڑ کر اپنے برابر دیکھا اور اُس کا دل اطمینان سے بھر گیا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کی شریکِ حیات تھی۔ وہی شریکِ حیات جو اچانک ہی کسی موڑ سے نکل کر شریکِ سفر ہو گئی تھی اور زندگی کی کٹھن راہوں پر قدم بہ قدم آج بھی ساتھ دے رہی تھی۔

یہ عورت ذات بھی کیا چیز ہے۔ ایک بار جس کا ہاتھ تھام لے آخری سانس تک ساتھ نہیں چھوڑتی۔" سوچتے سوچتے کمال کا ذہن ماضی کی وادیوں سے نکل کر حال میں لوٹ آیا۔ سکینہ چاولوں کی ٹرے لیے باورچی خانے میں جا چکی تھی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ "واہ ری وفا کی پتلی، سب رشتوں نے ساتھ چھوڑ دیا لیکن تُو ابھی تک اپنا وعدہ نبھائے جا رہی ہے۔" یہ سوچتے ہُوئے کمال نے نماز کی نیّت باندھ لی۔ نماز سے فارغ ہُوا تو سکینہ بھی وہیں آ بیٹھی۔

"کھانا لے آؤں۔" اُس نے پُوچھا۔

"بھُوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔" وہ بولا۔

اُسی وقت نعیم آ گیا۔

"بیٹا! اکیلے آئے ہو۔ دُلہن کہاں ہے؟" سکینہ نے پُوچھا۔

"اب وہ نہیں آئے گی۔ مَیں اُسے اُس کے میکے چھوڑ آیا ہُوں۔" نعیم کے لہجے میں تلخی تھی۔

"کیوں؟" کمال نے حیرت ظاہر کی۔

"اُکتا گیا تھا مَیں اُس کی باتوں سے۔" نعیم نے بیزاری سے کہا۔

"عورت کی قدر کیا کرو بیٹا۔ اُس کی وفا پر بھروسہ کرو۔ دُکھ سُکھ کی ساتھی ہوتی ہے یہ عورت ذات۔ ایک نہ ایک دن تمام رشتے ناتے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ اپنی عورت جو ہوتی ہے کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مرد اور عورت کا رشتہ ہی سب سے سچا رشتہ ہوتا ہے۔ عورت بیوی کے رُوپ میں بہت عظیم ہوتی ہے بیٹا!" کمال شفقت سے نعیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سمجھا رہا تھا۔

چالیس برس میں پہلی مرتبہ اُس کے خاوند نے اُس کی محنتوں اور اُس کی قربانیوں کا اقرار کیا تھا۔ برسوں کی ریاضت کام آ گئی تھی۔ سکینہ کا سر فخر سے تن گیا۔

"جاؤ بیٹا! ابھی جا کر دُلہن کو لے آؤ۔" کمال نے کہا۔

اور سکینہ مسکراتی آنکھوں سے نعیم کو جاتا دیکھنے لگی۔

جس علم سے دل میں رقت، سوز اور تابانی پیدا نہ ہو، اُس کا مطالعہ بیکار ہے۔ (ابنِ جوزیؒ)

ہٹلر کا فرار

پہلی بار سنسنی خیز انکشاف

کیا ہٹلر نے خودکشی کی ...؟ کیا اُس کی لاش واقعی جلادی گئی ...؟ نہیں ... وہ ایک ڈرامہ تھا۔ تاریخ کا ایک پُراسرار ڈرامہ ہٹلر کیسے مرا، پہلی بار انکشاف ہوتا ہے۔

فیوہرر ہٹلر کا بلاوا دونوں کے دلوں میں خوف اور وہشت پیدا کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہٹلر کے محفوظ خفیہ تہ خانے "بنکر" کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے تھے۔

"کیا تم جانتے ہو کیپٹن! تمہیں کیوں طلب کیا گیا ہے؟" گسٹاپو کے جنرل شملر نے پوچھا۔

"نہیں، جناب! میں خود حیران ہوں کہ میں ایک معمولی سا افسر ہوں۔ مجھے فیوہرر نے بھلا کس لیے یاد فرمایا ہے۔"

گسٹاپو کے جنرل شملر نے کیپٹن اشمون کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

۱۹۴۵ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کی گیارہ تاریخ تھی۔ ساری دُنیا جان چکی تھی کہ ہٹلر کے جرمنی کا خاتمہ قریب ہے۔ ایک ایک محاذ پر ایک ایک مشن پر جرمن فوجوں کو شکست ہو رہی تھی۔ مزاحمتی لڑائی کے خلاف اُن کے قدم

اُکھڑنے لگے تھے۔ اتحادی فوجوں نے گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ آخری شکست جرمنی اور ہٹلر کا مقدر بن چکی تھی...

اے۔ ڈی۔ سی نے اندر آکر اطلاع دی:

"فیوہرر تشریف لا رہے ہیں۔"

جنرل شملر اور کیپٹن اشمون کے لیے یہ اطلاع بھی حیران کُن تھی۔ فیوہرر خود اس کمرے میں تشریف لا رہے تھے۔ وہ مستعد اور چاق چوبند ہو کر کھڑے ہو گئے۔

ہٹلر کمرے کے اندر داخل ہُوا۔

"ہیل ہٹلر!"

"ہیل ہٹلر!"

گسٹاپو کے دونوں افسروں نے بازو اُوپر اُٹھا کر مخصوص نازی انداز سے سلام کیا۔ فیوہرر کا چہرہ بہت زرد دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنا رعشہ زدہ ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ اے، ڈی سی سلام کر کے چلا گیا...

"جنرل، کیپٹن... ہٹلر نے کہنا شروع کیا۔ "جرمنی ناقابلِ تسخیر ہے اگر اسے نقصان پہنچ رہا ہے تو یہ ایسا نقصان نہیں جو اسے تباہی سے ہمکنار کر سکے۔ ہم اپنی قوت پھر جمع کریں گے۔ میرا ناقابلِ تسخیر ذہن فتح نہیں کیا جا سکتا۔ مَیں جرمنی ہُوں۔ جرمنی کی رُوح ہُوں۔ میری رُوح زندہ رہی تو جرمنی اس عارضی شکست کے بعد بھی سر بلند ہو گا اور اقوامِ عالم پر حکمرانی کرے گا۔"

"ایسا ہی ہو گا' فیوہرر!"

"آپ ناقابلِ شکست ہیں فیوہرر! ناقابلِ تسخیر..."

"سات ماہ ہُوئے جنرل، جب تم نے مجھے ایک رپورٹ پیش کی تھی میرے ایک ہمشکل شخص کے بارے میں۔"

"فیوہرر! مجھے یاد ہے۔ اُس آدمی کو کیپٹن اشمون نے دیکھا تھا۔"

"مَیں نے اُس کے بارے میں کچھ احکام جاری کیے تھے۔" ہٹلر نے کہا۔

"فیوہرر! اُن احکام پر عمل ہو رہا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ مَیں جب چاہوں آپ اُسے ... سامنے پیش کر سکتے ہیں۔"

"حسب الحکم اُسے آپ کی خدمت میں پیش کیا ..."

"آج رات اُسے یہاں ہونا چاہیے۔ ٹھیک دو ..."

"حکم کی تعمیل ہو گی، فیوہرر!"

مَیں گارڈز کو حکم دے دوں گا کہ تمہارے ساتھ جو ... آئے، اُسے اندر آنے دیا جائے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے ... یہاں کس انداز سے اندر لایا جائے گا۔"

"مَیں سمجھ گیا، فیوہرر!"

"آپ دونوں اس راز کے امین ہیں۔ کسی کو اس ... اس منصوبے کے بارے میں کچھ علم نہیں ہونا چاہیے۔" ... نے سینوں پر ہاتھ رکھے اور پھر مخصوص نازی سلیوٹ کیا ... اسی لمحے اے۔ ڈی سی پھر کمرے میں داخل ہُوا اور ... اُن دونوں کو باہر لے گیا...

❋

سات ماہ پہلے کی وہ شام گسٹاپو کے کیپٹن ... کو یاد آنے لگی۔

وہ گشت پر تھا کہ اُس نے برلن کے ایک ... پسماندہ اور گندے علاقے کے ایک شراب خانے ... ایک شخص دیکھا۔ شراب خانہ شراب کی بُو اور تمبا... دُھویں سے بوجھل ہو رہا تھا۔ روشنیاں دُھندآلو... کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ ایسے میں مُشتبہ اور ... لوگوں کی تلاش میں کیپٹن اشمون نے شراب خا... میں بیٹھے ہُوئے تمام لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینا شروع ...

ایک چہرے پر اُس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔

یہ ایک صفاچٹ چہرے والا شخص تھا۔ ... شراب نوشی سے اُس کا چہرہ سُوجا اور پھُولا ہُوا تھا ... نتھنے تک سُوج رہے تھے۔ اس کے باوجود ... اگر ... کے چہرے پر مخصوص قسم کی مُونچھیں ہوتیں اور اُس کے ... چھوٹے کر کے خاص انداز میں سیٹ کر دیے جاتے تو ...

کیپٹن اشمون نے آگے بڑھ کر اُس آدمی کو اُٹھنے کا ... کیا... نگاہوں ہی نگاہوں میں کیپٹن اشمون نے اس کا قد بھی ماپ لیا۔ اُتنا ہی قد تھا... بس جسم ذرا فربہ ... مسلسل شراب نوشی کا نتیجہ...

"میرے ساتھ چلو..."

"میرا قصور؟" وہ منمنایا۔ اُس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"کوئی قصور نہیں۔ بس تم ایک دلچسپ آدمی دکھائی دیتے ہو۔ ہم تمہاری تواضع کریں گے۔"

کیپٹن اشمون نے گسٹاپو کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے سے پہلے اس شخص کے بارے میں تمام بُنیادی معلومات حاصل کر لیں۔ جب وہ شخص جنرل شملر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ بھی اُسے دیکھ کر بے حد چونکا اور حیران ہُوا۔ حیرت کی ... سے نکلا تو گڑبڑا گیا... بوکھلاہٹ دُور ہُوئی تو اس نے کیپٹن اشمون سے کہا:

"اسے دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔ باہر سے دروازہ ... کر... کوئی اندر نہ جانے پائے۔ تم جلدی سے میرے پاس آؤ کیپٹن! اس آدمی کو یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں جناب! مَیں بہت احتیاط اور راز داری سے اسے یہاں لایا ہُوں۔"

"تم نے بہت اچھا کام کیا۔ اسے تم جلدی سے محفوظ اور رازدارانہ طریقے سے خُفیہ گھر لے جاؤ... اور جب تک میری طرف سے کوئی حکم نہ ملے تم اس کے پاس رہو گے۔ یہ ... کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گا؟"

"نہیں جناب! اسے تو بس شراب چاہیے۔"

جنرل شملر کا دُرشت چہرہ کچھ نرم پڑا اور وہ مُسکرایا۔

"اس کا انتظام بھی کر دیا جائے گا، تم جا سکتے ہو۔"

کیپٹن اشمون نے بند کالے شیشوں والی کار میں اس اجنبی کو سوار کیا۔ راستے میں رُک کر اُس کے لیے شراب ... لی اور پھر برلن کے ایک مضافاتی حصّے میں چلا گیا۔ وہ ایک سیف ہاؤس تھا۔ محفوظ اور خُفیہ گھر جہاں ضرورت کے وقت خاص لوگوں کو ہی رکھا جاتا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ یہاں دو ایسے ملازم تھے جو بالکل گونگے تھے۔

وہ جس شخص کو اپنے ساتھ لایا تھا اُسے کوئی پریشانی لاحق نہ تھی۔ سجے سجائے کمرے میں آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر وہ انتہائی مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ شراب کی رنگا رنگ بوتلیں اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھا رہی تھیں۔ کیپٹن اشمون نے دن رات وہیں بسر کی۔ صُبح کو آنکھ کھُلی تو اجنبی کو بے سُدھ سوتا ہُوا پایا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ جنرل شملر آیا۔ اُس کے ساتھ جو شخص تھا اُسے اشمون نے بھی پہچان لیا۔ ہاتھ ملایا تو اُسے یُوں لگا جیسے اُس کی برسوں کی خواہش اچانک پُوری ہو گئی ہو۔ وہ نازی فلسفے کا سب سے بڑا شارح اور مفکّر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر جوہان... اُسے یہ شہرت بھی حاصل تھی کہ ہٹلر کی شخصیّت کو جیسا وہ جانتا ہے دوسرا کوئی شخص نہیں جانتا۔

"وہ کہاں ہے؟" جنرل شملر نے پُوچھا

"دوسرے کمرے میں نشے میں دُھت سو رہا ہے۔"

"مَیں اُسے دیکھنا چاہوں گا۔" ڈاکٹر جوہان نے کہا۔

کیپٹن اشمون اُنہیں اُس کمرے میں لے گیا جہاں وہ اجنبی بے سُدھ سو رہا تھا۔ ڈاکٹر جوہان نے کہا:

"آپ لوگ دوسرے کمرے میں چلے جائیں مَیں اسے جگاؤں گا نہیں، دیکھتا رہوں گا۔" یہ جملہ اُس نے سرگوشی میں کہا تھا۔

گسٹاپو کا جنرل اور کیپٹن دونوں خاموشی سے کمرے میں چلے گئے۔

جنرل شملر کا چہرہ بہت سنجیدہ اور گمبھیر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی آواز دبی دبی اور بوجھل تھی۔

"اس شخص کے بارے میں ہمارے پاس پُوری معلومات ہونی چاہییں۔ یہ ذمّے داری ہمیں سونپی گئی ہے۔"

ڈاکٹر جوہان ہر روز چھ گھنٹوں کے لیے یہاں آیا کریں

اُردو ڈائجسٹ لاہور

سالنامہ ۸۷ء افغانستان نمبر

* نئے انداز کی زندہ حقیقتیں، نئے اسلوب کی سچّی داستانیں۔
* پاکستان کی سالمیت سے گہرا تعلّق رکھنے والے واقعات۔
* تاریخ کا رُخ موڑنے والی حکایاتِ خُونچکاں۔
* اپنوں کی سرفروشیاں، غیروں کی ریشہ دوانیاں۔
* قدم قدم پر پیمانِ وفا کی خُوں رنگ کہانیاں۔
* کوہساروں میں انسانی عظمت کے دلکشا ڈرامے۔

افغانستان میں جنگِ آزادی کی مکمّل دستاویز

افغانستان نمبر

اپریل ۸۷ء میں شائع ہو رہا ہے

جہادِ افغانستان کے ساتھ وابستہ اداروں اور شخصیتوں سے تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

(ادارۂ اُردو ڈائجسٹ)

گے۔ کل سے یہ سلسلہ شروع ہو گا۔ تم ان چھ گھنٹوں میں اس شخص کے ماضی، شجرۂ نسب اور ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے رپورٹ دو گے۔ ہمیں توقّع رکھنی چاہیے کہ یہ شخص کسی غیر کی نگاہوں میں ابھی تک نہیں آیا ہو گا۔ فیوہرر کو اس شخص کے بارے میں مَیں نے خود رپورٹ پیش کی تھی۔ اُن کا ردِّ عمل بہت شدید تھا۔ ڈاکٹر جوہان کو اسی لیے فی الفور یہاں بھیج کر خصوصی ذمّے داری سونپی گئی ہے۔ کیپٹن! فیوہرر اس شخص سے ایک ایسا کام لینا چاہتے ہیں جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ جرمنی کی تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے۔ وقت آنے پر تمہیں اس راز سے آگاہ کر دیا جائے گا، تاہم تمہاری ذہانت سے توقّع ہے کہ تم نے کچھ نہ کچھ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ یہ شخص کس منصوبے کی تکمیل کر سکتا ہے — مکمّل رازداری اس اہم اور خفیہ ترین منصوبے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ پانچویں شخص کو بھی اس کے وجود کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ فیوہرر، ڈاکٹر جوہان، کیپٹن اشمون اور ایک جنرل شملر۔"

تھوڑے سے وقفے کے بعد جنرل شملر نے کہا:

"تم تصوّر نہیں کر سکتے کہ فیوہرر جلد ہی تمہیں کس اعزاز اور اکرام سے نوازنے والے ہیں۔"

کیپٹن اشمون نے مخصوص نازی سلیوٹ کیا...

وہ اس منصوبے کی اہمیّت کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتا تھا۔

❁

کسی بدبخت اور تباہ حال شخص کی یکدم لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئے... کچھ ایسا ہی انقلاب اُس اجنبی کی زندگی میں آیا تھا جسے کیپٹن اشمون نے ایک شراب خانے سے اُٹھا کر اس آرام دہ محفوظ گھر تک پہنچا دیا تھا۔ بچپن میں جب اُس نے آنکھ کھولی تھی تو اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے دو کمروں والے فلیٹ میں پایا تھا۔ گندہ غلیظ فلیٹ۔ ایک عجیب و غریب عورت جو اُسے کبھی تھپکاتی پیار کرتی، کبھی وہ روتا تو اسے پیٹتی۔ ہوش سنبھالا تو اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک حرامی بچّہ ہے۔ وہ اسکول سے بھاگ آتا۔ پڑھنے میں اُس کا جی لگتا ہی نہ تھا۔ گیارہ بارہ برس کا تھا کہ اُس کی ماں نے اُس کی حرکتوں سے تنگ آ کر اُسے گھر سے نکال دیا۔ دو ایک برس وہ بے گھر بچّوں کے سرکاری ادارے میں رہا جہاں اُس نے ہر قانون اور قاعدے کی خلاف ورزی کی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں وہ عادی شرابی اور اُچکّا بن چکا تھا۔ جب کسی واردات میں کامیاب نہ ہوتا تو جزوقتی کام کر لیتا۔ جہاں کام کرتا وہاں سے کچھ چوری کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی معاف کر دیا جاتا اور کبھی چھوٹے موٹے جُرم کی بنا پر سزا پاتا۔ وہ کئی بار سزا بھگت چُکا تھا۔ اُس کا کوئی گھر نہ تھا۔ کپڑے پھٹنے لگتے تو وہ لنڈے سے کوئی سستا سا جوڑا خرید لیتا۔ وہ ایک متوکّل شخص تھا۔ جو ملتا اُس کی شراب پی لیتا — شراب خانوں کے اندر، فٹ پاتھوں پر، باغوں اور پارکوں میں پُلوں کے نیچے اُس کی راتیں گزرتیں۔

اُس کی زندگی کی ایک ہی آرزو تھی کہ کچھ کیے بغیر، ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اُسے شراب مل جائے اور کوئی ایسی جگہ جس کی چھت کے نیچے وہ پیسہ خرچ کیے بغیر رات کاٹ سکے۔

یُوں وہ اپنی عمر کا بڑا حصّہ گزار چکا تھا اور اب قسمت یکدم اُس پر مہربان ہو گئی تھی۔

خاموش اور مؤدّب ملازم اُس کے ہر حکم کی تعمیل بجا لاتے۔ اُس کے لیے عمدہ لباس تیّار کیے گئے۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار قیمتی پھل اور لذیذ کھانے کھائے۔ نہانے کے لیے شاندار غُسل خانہ آرام دہ صاف سُتھرا بستر، فرنیچر اور مہربان چھت۔ اور پھر جونہی شام ہوتی اُسے عمدہ، قیمتی اور شاندار شرابیں مہیّا کی جاتیں۔

اُس پر دو پابندیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دن کے وقت شراب نہ پیے۔ دوسرے اُسے جو کچھ سکھایا جائے، وہ پُوری توجّہ سے سیکھے اور اُس پر عمل کرے۔ اُسے جو کچھ سکھایا جا رہا تھا، وہ اُس کے لیے بہت دلچسپ اور مضحکہ خیز

تھا۔ایک اچھا خاصا معقول آدمی اُسے یہ سکھاتا تھا کہ اُسے چلنا، بیٹھنا اور بولنا کس طرح ہے۔

اور حیران کُن بات یہ کہ اُس کے ہونٹوں کے اُوپر مُونچھیں اُگ رہی تھیں۔ اُسے خاص قسم کی مُونچھیں رکھنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، اُسے کیا فرق پڑتا تھا، البتہ وہ کبھی کبھی یہ ضرور سوچتا کہ اُسے یہ سب کچھ کیوں سکھایا جا رہا ہے اور یہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سالہاسال کی شراب نوشی نے اُسے کسی ایک بات پر زیادہ دیر تک غور کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنا اصلی نام، اپنی اصلی شخصیّت اور آداب و اطوار، میلانات اور سرشت آہستہ آہستہ بھُلاتا جا رہا ہے اور دُنیا کا ایک ذہین ترین انسان اُس کے ذہن کو صاف کر کے اُس پر کسی دوسرے شخص کا نقش اُبھار رہا ہے۔ وہ اُسے ایڈولف کہہ کر پُکارتے، حالانکہ اُس کا نام کچھ اور تھا لیکن چند ہفتوں میں وہ اپنے آپ کو واقعی ایڈولف سمجھنے لگا۔

وہ بہت مسرور اور مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ ٹھیک وقت پر ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا، لباس کی تبدیلی... اخبار کا مطالعہ... بعض ضروری کتابوں کا مطالعہ۔ وہ بہت بدلتا جا رہا تھا لیکن بہت بدلے جانے کے ساتھ ساتھ وہ بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا۔ اُسے ایک ذمّے دار آدمی بنانے کے لیے بھی ڈاکٹر جوہان نے بہت کوشش کی تھی۔ نازی فلسفہ اُسے گھول کر پلایا جا رہا تھا۔ برتر جرمن نسل اور عظیم تر جرمنی اور سب سے عظیم فیوہرر ہٹلر...

کیپٹن اشمون نے پھر ایک معرکہ مار لیا تھا۔

فیوہرر ہٹلر کے ہم شکل کی زندگی کے تمام حالات اور واقعات کا سراغ لگا لیا تھا اور اپنی رپورٹ جنرل شملر کے سامنے پیش کر دی تھی۔ رپورٹ کے مطالعے کے بعد جنرل شملر نے ایک سوال پُوچھا:

"اس شخص کو جس نظر سے ہم دیکھتے ہیں، اس کے اندر ہم نے جو مشابہت ڈھونڈی ہے کیا اس نظر سے ایسی مشابہت کسی دوسرے کو بھی نظر آتی ہے؟"

"نہیں، جناب! اُس نے اپنی زندگی غلاظت اور گندگی میں گزاری۔ اُس کے خدوخال کبھی کسی کو واضح طور پر دکھائی نہیں دیے۔ پھر چہرے پر مخصوص انداز کی مُونچھوں کا نہ ہونا اور پھر بالوں کی بناوٹ کا تضاد بھی اپنی جگہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ اتنی کم حیثیّت کا آدمی ہے کہ کسی کو اس طرح سے اُس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا جناب! وہ اُن لوگوں میں سے ایک ہے جن کی طرف دوسرے لوگ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

"مجھے تمہاری رپورٹ اور تمہاری رائے پر پُورا اعتماد ہے، کیپٹن! فیوہرر تمہیں خاص انعام کا حقدار قرار دے چکے ہیں۔"

کیپٹن اشمون نے نازی سلیوٹ کیا اور پھر آہستہ سے کہا:

"جنرل! ایک ایسی حقیقت بھی معلوم ہُوئی ہے جسے مَیں نے اس رپورٹ میں شامل نہیں کیا۔ آپ سے مشورے کے بعد ہی... سر، میرا مطلب ہے آپ ہی اس کا فیصلہ کریں گے کہ یہ بات فیوہرر تک پہنچنی چاہیے یا نہیں۔"

"کون سی بات؟" جنرل شملر کے لہجے میں تجسّس پنہاں تھا۔

"سر! مَیں سرٹیفکیٹ بھی لے آیا ہُوں۔ اس شخص کی ماں..." وہ رُکا پھر ہمّت کر کے بولا۔ "یہودن تھی۔"

جنرل شملر ایک بار یُوں کُرسی سے اُچھلا جیسے بچھّو نے ڈنک مارا ہو۔ پھر تیزی سے بولا:

"دکھاؤ وہ سرٹیفکیٹ۔"

کیپٹن اشمون نے سرٹیفکیٹ جنرل کے سامنے رکھ دیا۔

جنرل کی آنکھیں سکڑیں، پھیلیں اور پھر وہ آہستگی سے بولا:

"غضب ہوگیا۔ فیوہرر یہودی کا نام سُننا پسند نہیں کرتا۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ اُس کے ہم شکل انسان کی رگوں میں یہودی خون دوڑ رہا ہے۔"

کیپٹن اشمون سر جُھکائے دُزدیدہ نظروں سے جنرل شملر کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جنرل شملر بار بار میز پر مُکّے رہا تھا۔ پھر وہ یکدم بول اُٹھا:

"کیا وہ شخص جانتا ہے کہ اُس کی ماں یہودن تھی؟"

اس سے پہلے کہ کیپٹن اشمون کوئی جواب دیتا وہ خود ہی کہنے لگا: "وہ کیسے جانتا ہوگا۔ اگر کبھی جانتا ہی ہوگا تو ڈاکٹر جوہان اُس کے ذہن سے یہ بات نکال چکا ہوگا۔ کیپٹن! تم اپنی یہ اطّلاع — یہ راز اپنے تک ہی رکھّو گے۔ اس رپورٹ میں اسے شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ راز فیوہرر سے بھی چُھپائیں گے۔"

"جیسا حکم ہو جناب!"

"تمہارے لیے یہ بات بہت فخر اور اعزاز کی ہوگی کہ میں تمہارے ہاتھ کی لکّھی ہُوئی یہ اوریجنل رپورٹ ہی آج فیوہرر کے حضور پیش کروں گا۔"

کیپٹن اشمون نے بڑے جوش سے سلیوٹ کیا۔

❁

چھ ماہ بیت گئے... دو سو کے لگ بھگ دن۔ کیپٹن اشمون اور جنرل شملر دونوں اُس کمرے میں بیٹھے تھے جہاں جرمنی کا آمر ہٹلر کُرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا... ڈاکٹر جوہان بھی وہاں موجود تھا۔ جوہان نے جنرل شملر اور کیپٹن اشمون پر اِک نگاہ ڈالی اور مستحکم آواز میں کہا:

"آپ اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ گئے ہوں گے۔"

ڈاکٹر جوہان کا مخاطب ہٹلر تھا۔

"ہم اپنی زندگی کا مقصد پا چکے ہیں۔ ہم فیوہرر ہٹلر ہیں... جرمنی کے لیے سب کچھ قربان کر دینا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ ہم اسی لیے پیدا ہُوئے ہیں۔ آپ ہمیں یہ فرض بار بار یاد نہ دلائیں۔"

ڈاکٹر جوہان نے جنرل اور کیپٹن کو اشارہ کیا۔ تینوں نے 'ہیل ہٹلر' کے نعرے لگا کر نازی سلیوٹ کیے اور کمرے سے نکل آئے۔

دوسرے کمرے میں جا کر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر جوہان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"تم نے دیکھا... مَیں نے کیا کر دکھایا ہے... تم نے مجھے ایک بے جان ناتراشیدہ پتّھر دیا تھا بےحس، ہوش و حواس سے عاری ——— چوبیس گھنٹے نشے میں دُھت رہنے والا موری کا کیڑا، مَیں نے اُسے فیوہرر ہٹلر ثانی بنا دیا۔ یہ ہے علم کا کمال، مَیں چاہتا تو اُسے ہٹلر بھی بنا سکتا تھا اور وہ یقین کر لیتا کہ وہی ہٹلر ہے۔ مَیں نے اس طرح سے اُس کی برین واشنگ کی ہے کہ جہاں وہ اپنے آپ کو فیوہرر ہٹلر کا ہم شکل سمجھتا ہے ——— وہاں یہ بھی دل میں راسخ کر چکا ہے کہ اُسے وقت آنے پر فیوہرر کا کردار ادا کرنا ہے۔ وہ فیوہرر اور جرمنی کے لیے سب کچھ کرے گا..."

جنرل شملر اور کیپٹن اشمون نے ڈاکٹر جوہان کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

❁

ہٹلر کے خُفیہ تہ خانے کے اندر جب اُس شخص کو لایا گیا تو اُس کے اوورکوٹ کے کالروں نے اُس کا چہرہ بڑی حد تک چُھپا رکھّا تھا۔ سر پر فیلٹ تھی جس نے ما ڈھانپ رکھّا تھا۔ سکیورٹی کے افسروں کو فیوہرر کا حکم مل چکا تھا کہ کیپٹن اشمون اور جنرل شملر کے ساتھ آنے والے کو بِلا روک ٹوک، تلاشی لیے بغیر فوراً اُس کے پاس پہنچا دیا جائے۔

ہٹلر کا اے ڈی سی اُن کا منتظر تھا۔ وہ تیزی سے اُنہیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں روشنی خاصی مدھم تھی۔ ماحول بے حد پُراسرار ہو چُکا تھا۔ اے ڈی سی نے کیپٹن اشمون اور جنرل شملر کو اشارہ کیا... وہ دونوں اُس کے ساتھ اُٹھ کر چلے گئے۔ اُس کمرے میں وہ شخص اکیلا ہی بیٹھا رہ گیا...

آہستہ سے دروازہ کُھلا۔ جرمنی کا آمر ہٹلر اندر داخل ہوا۔

نیم تاریکی میں بیٹھے شخص نے اُٹھ کر ہٹلر کا استقبال کیا۔

"اپنا چہرہ دکھاؤ۔" ہٹلر نے کہا۔

اُس شخص نے اپنا چہرہ عیاں کر دیا۔ ہٹلر کے لیے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ کی کپکپاہٹ اور لرزش پر قابو پانا مشکل ہوگیا...

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے... نظریں جمائے، حیرت زدہ۔

ہٹلر نے آنکھیں جھپکائیں اور دل میں کہا۔ وہ مَیں ہُوں۔ وہ میرے جیسا ہے۔ وہ بالکل مَیں ہُوں تو پھر مَیں کون ہُوں...

وہ جو ہٹلر کا ہم شکل تھا، سوچ رہا تھا کہ مَیں ایڈولف ہٹلر ہُوں۔ مَیں ہُوں ہٹلر جسے جرمنی کے لیے قربان ہونا ہے۔ یہ کون ہے... اگر یہ ایڈولف ہٹلر ہے تو پھر مَیں کون ہُوں...

ہٹلر نے پھر آنکھیں جھپکائیں اور بہ سُرعت کمرے سے نکل گیا...

اے ڈی سی آگے بڑھا تو ہٹلر نے کہا:

"کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دو۔ اندر کوئی نہیں جائے گا جب تک مَیں نہ کہوں۔"

اے ڈی سی نے سلیوٹ کیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا...

❁

دوسرے کمرے میں جنرل شملر، کیپٹن اشمون اور ڈاکٹر جوہان ہٹلر کو آتے دیکھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

"حیران کُن، ناقابلِ یقین... آنکھوں کو یقین نہیں آتا لیکن حقیقت جُھٹلائی نہیں جا سکتی..." وہ تینوں سر جُھکائے کھڑے رہے۔

ایک گھنٹے تک ہٹلر جوش سے لیکن دبے دبے

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا

پاکستان کے دُشمن اب مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر اس مملکت میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اِن کوششوں نے اب صُوبہ پرستی کو ہوا دینے کی صُورت اختیار کی ہے۔ جب تک آپ اپنی مُلکی سیاست سے اس زہر کو نکال نہیں دیتے، اُس وقت تک آپ خود کو ایک قوم میں نہیں ڈھال سکتے اور نہ ویسا جوش اور ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔ (ڈھاکہ — ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

لہجے میں بولتا رہا۔ ایک حیران کُن منصوبہ، جس کا ایک ایک لفظ ناقابلِ یقین تھا لیکن قابلِ عمل... ہٹلر نے آخر میں کہا:

"آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جرمنی کا مستقبل اب آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کی خاموشی اور مکمّل راز داری ہمارے مستقبل کی ضامن ہے۔"

❁

جب کیپٹن اشمون اور جنرل شملر ہٹلر کے بنگلے سے باہر نکلے تو وہ دُنیا کے سب سے بڑے نازک اور خوفناک راز کے امین تھے۔ اُن کے دل بھی اس راز سے بوجھل تھے اور اُن کے بھاری اوورکوٹوں کی جیبیں بھی بوجھل تھیں جن میں وہ قیمتی ہیرے رکھّے تھے جو اُنہیں رُخصت کرتے وقت ہٹلر نے دیے تھے۔

❁

ڈاکٹر جوہان بنکر سے باہر نہیں گیا۔ اُس خُفیہ بنکر میں کئی کمرے اور اُن میں مہینوں کے لیے خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت کا ذخیرہ تھا۔ اُسے ایک خاصا بڑا کمرہ ملا تھا۔ جس میں ہٹلر کے ہم شکل کو بھی ٹھہرایا گیا تھا۔

ڈاکٹر جوہان کبھی کبھار اپنے کمرے سے باہر نکل کر بنکر میں مقیم اعلیٰ نازی حکّام وزرا اور جرنیلوں کی مجلس میں کچھ وقت گزار لیتا لیکن وہ شخص کبھی اُس کمرے سے باہر نہیں آیا۔ کسی کو اُس کی موجودگی کا علم نہیں ہُوا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک دوسرا ہٹلر بھی وہاں موجود ہے... کسی کو اُس کے وجود کا کبھی علم نہ ہوا۔ ہٹلر کا آخری منصوبہ سو فی صد کامیاب رہا تھا۔

❁

اور پھر آخری رات آگئی...

ڈاکٹر جوہان عامل تھا اور ہٹلر کا ہم شکل... اُس کا معمول...

"اب جرمنی پر قربان ہونے کا وقت آگیا ہے۔"

"مَیں تیار ہُوں۔"

"تم جانتے ہو کہ تم ایسا عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہو جسے دُنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

"مَیں جانتا ہُوں۔ مَیں آخری بار شراب پینا چاہتا ہُوں..."

❁

فیوہرر ہٹلر ایوا براؤن سے شادی بھی کر چکا تھا اور اپنی آخری وصیّت بھی مکمّل کر چکا تھا۔ ایوا براؤن کو بتا چکا تھا کہ اب اُنہیں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا ہے۔ آخری وقت آچکا ہے۔ اتّحادی فوجیں بنکر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھیں۔ عظیم جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ ایوا براؤن ذہنی طور پر اپنی زندگی ختم کرنے کے لیے پُوری طرح تیّار ہو چکی تھی۔

"ڈارلنگ! مَیں ابھی آیا..."

یہ کہہ کر ہٹلر اپنے رعشہ زدہ بازُو کو دبائے کمرے کے باتھ رُوم میں چلا گیا...

باتھ رُوم کا خُفیہ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور پلک جھپکنے میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر جوہان نے وہاں موجود ہٹلر کے ہم شکل کو اشارہ کیا۔ وہ اُٹھا... لیکن چلتے چلتے رُک گیا... اصلی فیوہرر ہٹلر اور اُس کے ہم شکل نے ایک دوسرے کو چند ثانیوں کے لیے آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ہٹلر کا ہم شکل وہی لباس پہنے ہُوئے تھا جیسا اُس وقت ہٹلر نے پہن رکھا تھا۔

ہٹلر کا ہم شکل دروازہ کھول کر باہر نکلا... ڈاکٹر جوہان اُس کے پیچھے تھا...... اُس نے باتھ رُوم کا خُفیہ دروازہ کھولا۔ ہٹلر کا ہم شکل اندر داخل ہُوا اور خُفیہ راستہ بند ہو گیا۔ چند منٹوں کے اندر نقلی ہٹلر ایوا براؤن کے پاس کھڑا تھا...

نقلی ہٹلر جُھکا... اُس نے اپنے ٹھنڈے ہونٹوں سے ایوا براؤن کی ٹھنڈی پیشانی کو چُھوا... ایوا براؤن نے زہر مُنہ میں رکھ لیا...

نقلی ہٹلر صوفے پر بیٹھا اور پستول کی نالی اپنی کنپٹی سے لگا کر اُس نے دل میں کہا:

"مَیں اڈولف ہٹلر ہُوں اور جرمنی کے مستقبل کے لیے قربان ہو رہا ہُوں۔"

گولی چلی...

اس کمرے سے باہر ہال نما کمرے میں بیٹھے ہُوئے نازی جرنیلوں اور اعلیٰ جرمن حکّام نے ایک دوسرے کے چہروں کی طرف وحشت انگیز نگاہوں سے دیکھا...

چند منٹ بعد وہ سب جان چکے تھے کہ ہٹلر نے خودکُشی کر لی ہے...

ہٹلر کی وصیّت پر عمل کرنے میں پُوری عجلت سے کام لیا گیا۔

اُس کی لاش بنکر کے باہر لے جائی گئی اور ہٹلر کی وصیّت کے مطابق اُسے آگ لگا دی گئی...

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جس شخص کی لاش جلائی گئی تھی وہ ایڈولف ہٹلر نہیں تھا، ایک گمنام شخص تھا جس کی شکل ہٹلر سے ملتی تھی اور جسے گسٹاپو کے کیپٹن اشموَن نے دریافت کیا تھا

❁

ہٹلر کا ہم شکل جس وقت ایوا براؤن کا ماتھا آخری بار چھو رہا تھا، ڈاکٹر جوہان اُس کمرے میں داخل ہُوا۔ ہٹلر لباس تبدیل کر رہا تھا...

ڈاکٹر جوہان مُنہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔

"فیوہرر، وقت..."

اسی لمحے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہٹلر کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ ڈاکٹر جوہان نے آہستہ سے کہا:

"— 'ڈی' کا وقت..."

ہٹلر نے کچھ جواب نہ دیا اور لباس بدلنے لگا۔ جب وہ لباس بدل چکا تو میز پر رکھّا ہُوا ایک بیگ کھول کر ڈاکٹر جوہان نے اُس میں سے کچھ چیزیں نکالیں اور ہٹلر کے چہرے کے قریب آگیا۔ چند منٹوں میں فیوہرر ہٹلر کا چہرہ یکسر اجنبی اور مختلف ہو چکا تھا۔ کوئی اندازہ تک نہ لگا سکتا تھا کہ یہی جرمنی کا آمر ایڈولف ہٹلر ہے۔ ان چند منٹوں میں ہٹلر کی آنکھوں کے سامنے سے اُس کا سارا ماضی کسی فلم کی طرح گزر گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا: "مَیں عظیم ترین ہُوں۔ ابھی جرمنی زندہ ہے۔ میری طرح..."

بنکر کے خُفیہ راستے سے وہ باہر نکلے۔ دُور دُور سے بموں اور گولیوں کی آوازیں قریب تر آتی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر جوہان اور ہٹلر سایے اور تاریکی میں چلتے بنکر کے بیرونی حصّے سے گزرتے اُس کے عقب میں پہنچے۔ وہ تیز تیز چلنے لگے۔ درختوں کے نیچے ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ ایک سایہ آگے بڑھا... اُس نے سامنے آکر پُورے احترام سے لیکن دبے لہجے میں "ہیل ہٹلر" کہہ کر سلیوٹ کیا۔ اُس کی آواز نسوانی تھی...

ہٹلر اور ڈاکٹر جوہان تیزی سے جہاز میں سوار ہُوئے اور انجن گڑگڑانے لگے۔ توپوں، بموں اور گولیوں کی آوازیں جہاز کے انجنوں کی آواز دب کر رہ گئی۔ جہاز حرکت میں آیا اور پھر درختوں کے سایے سے نکل کر ہنگامی رن وے پر چلتا ہُوا فضا میں اُونچا اُڑنے لگا...

بنکر کے باہر ہٹلر کی لاش کو اُسی لمحے آگ دکھائی گئی اور شُعلے لپکنے لگے۔

ایک ہٹلر کی لاش کو شُعلے چاٹ رہے تھے۔ دوسرا اور اصلی ہٹلر ہوا کے دوش پر اُڑتا ہُوا دُور — بہت دُور جا رہا تھا...

❁

یہ لمحے اُس خاتون ہوا باز کی زندگی کے سب سے قیمتی اور قابلِ فخر لمحے تھے۔ وہ نوجوان نازی تنظیم کی پُرجوش رُکن تھی۔ اُس کی عمر چوبیس برس تھی۔ اُس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ہٹلر کا مدّاح پایا۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ ایسے کارہائے نمایاں انجام دے کہ فیوہرر ہٹلر اُس کا رہنما، اُس کا آئیڈیل اُسے شرفِ ملاقات بخشے اور شاباش دے — آگشتا نے اپنے لیے مشکل ترین پیشے کا انتخاب کیا اور پھر چند برسوں میں اُس نے جرمنی کی نمایاں ترین ہوا باز خاتون کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ دوسری جنگِ عظیم کے عروج کے دنوں میں اُس نے کئی خطرناک معرکے انجام دیے۔ جاسوسی کی مُہمّوں پر وہ روانہ کی گئی اور کامیاب لَوٹی۔ وہ ہلکے جہاز کو اُڑانے میں ایسی مہارت حاصل کر چکی تھی کہ اُس کی شاندار کامرانیوں کی وجہ سے ہٹلر نے اُسے ملاقات کی دعوت دی۔

جب وہ اپنے آئیڈیل، اپنے فیوہرر کے حضور پیش ہوئی تو اتنی جذباتی ہو گئی کہ اُس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ہٹلر نے اُس سے ہاتھ ملایا تو اُس کا پُورا وجود لرزنے لگا تھا۔ اور پھر یکدم اُسے زبان مل گئی...

"مَیں فیوہرر پر اپنی جان نچھاور کرنا چاہتی ہُوں۔"

ہٹلر نے یہ جُملہ ہمیشہ یاد رکھّا اور دو دن پہلے اُسے خاص اور خُفیہ پیغام کے ذریعے اُس نے بنکر بُلوا کر اُس سے

ملاقات کی۔ چند جملوں میں ہٹلر نے اُسے سب کچھ بتادیا۔

"مَیں اسی دن کے انتظار میں جی رہی تھی کہ اپنے فیوہرر کی خدمت بجالاؤں۔"

اب وہ جہاز اُڑائے چلی جارہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا مشن کتنا اہم ہے۔ اُس کی یہ پرواز دُنیا کی سب سے اہم، پُراسرار اور خطرناک پرواز تھی۔ وہ جانتی تھی جرمنی کا مستقبل اب اُس کے ہاتھوں میں ہے۔ اُس کی معمولی سی غلطی جرمنی کو تباہ کر سکتی تھی۔

وہ ایمان کی حد تک سمجھتی تھی کہ جرمنی اتحادیوں کے قبضے میں جانے کے باوجود ــــ ایک بار پھر شکست کا بدلہ چکائے گا کیونکہ جرمنی نے شکست کھائی ہے ہٹلر نے نہیں۔ ہٹلر اُس کا فیوہرر زندہ ہے۔۔۔"

صُبح کے اُجالے پھیلنے سے پہلے اُسے محفوظ آسمان تک پہنچنا تھا۔ چاروں طرف دُشمن۔ اتحادیوں کے جہازوں کا خطرہ تھا۔ کسی بھی لمحے یہ چھوٹا سا جہاز اُن کا نشانہ بن سکتا تھا۔ جنگلوں اور پہاڑیوں کے درمیان چُھپے ہُوئے خُفیہ چھوٹے سے اڈّے کی طرف جب جہاز نے رُخ کیا تو دن کے اُجالے چاروں طرف پھیل چُکے تھے۔ آگشٹا نے بڑی کامیابی سے جہاز درختوں اور پہاڑیوں کے درمیان گھِرے ہُوئے چھوٹے سے ہوائی اڈّے پر اُتار دیا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تمتمارہا تھا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے رُخسار آنسوؤں سے تر ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر جوہان نے گرد و پیش پر اک نظر ڈالی۔

آگشٹا اور جہاز کا نیوی گیٹر دونوں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ بدلے ہُوئے رُوپ میں ہٹلر اُن کی طرف بڑھا۔ اُس نے دونوں سے ہاتھ ملائے پھر آگشٹا کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہُوئے کہا:

"آج تم میرا وہ چہرہ دیکھ رہے ہو جو میرا اصلی چہرہ نہیں۔ لیکن مَیں فیوہرر ہٹلر ہُوں جرمنی کا نجات دہندہ۔ میری واپسی یقینی ہے اور جب مَیں لوٹوں گا تو اپنے اصلی چہرے کے ساتھ۔ تم نے جو خدمت انجام دی ہے اُسے جرمنی کبھی نہ بھول سکے گا۔ یاد رکھو۔۔۔ یہ راز اُس وقت تک افشا نہ ہوگا جب تک مَیں واپس نہیں آتا۔۔۔"

آگشٹا اور اُس کے ساتھی نے خالص نازی انداز میں اپنے فیوہرر کو سلیوٹ کیا اور ہٹلر نے ڈاکٹر جوہان کی طرف دیکھا۔۔۔ ڈاکٹر جوہان نے قدم بڑھائے اور ہٹلر اُس کے پیچھے چل دیا۔۔۔ اُنھوں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ لیکن جب تک ہٹلر درختوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا اُس وقت تک آگشٹا اور اُس کا ساتھی وہیں کھڑے رہے۔

اُس روز جب برلن کی فتح مکمّل ہوگئی اور جرمنی کے زوال پر مُہر ثبت ہوگئی، اُس روز سہ پہر کے وقت اتّحادی طیاروں نے ایک چھوٹا جہاز مار گرایا۔ جہاز کی پائلٹ خاتون تھی ــــ اتّحادی انٹیلی جنس کے افسروں نے چند گھنٹوں میں لاش کی شناخت کرلی۔ یہ جرمنی کی مشہور خاتون ہوا باز آگشٹا تھی۔۔۔ یہ کہاں سے آئی تھی۔ ایسے جان لیوا لمحوں میں وہ جہاز کیوں اُڑا رہی تھی۔

اس سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا کیونکہ اُس کا ساتھی بھی مر چُکا تھا۔

آگشٹا کے مُردہ چہرے پر کِھلی ہُوئی مُسکراہٹ کو اتّحادی فوجوں کے انٹیلی جنس افسر مُدّتوں فراموش نہ کر سکے۔ اُس کی مُسکراہٹ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم اور سب سے نازک مشن مکمّل کرنے کے بعد موت کی وادی میں گئی ہے۔

اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مُسکراہٹ تھی۔

❁

میرا نام ڈاکٹر جوہان گنشٹالٹ ہے لیکن دُنیا کے اَن گنت لوگ مجھے ڈاکٹر جوہان کے نام ہی سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کو ختم ہُوئے تیس برس ہو چُکے ہیں اور اس وقت میری عمر ۸۳ برس ہو چکی ہے۔ مَیں بہت بُوڑھا، بہت کمزور اور بہت بیمار ہُوں۔ مَیں

ان لوگوں میں سے نہیں جو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں اور اپنا لکھوا کر آئے ہوں۔ مَیں جانتا ہُوں کہ مَیں اب چند روز کا مہمان ہُوں۔

یہ ایک چھوٹا ہسپانوی گاؤں ہے جس کے چاروں طرف صحرا پھیلا ہُوا ہے۔ اس صحرا میں جب یہ گاؤں دکھائی دیتا ہے جو چاروں طرف سے بے برگ و گیاہ چٹیل سُرخ پہاڑیوں میں گِھرا ہُوا ہے تو دیکھنے والا حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ جدھر نگاہ ڈالو، اُدھر صحرا ہی صحرا ہے۔ وہاں یہ سُرخ پہاڑیاں کہاں سے اُگ آئیں، لیکن یہ قدرت کا کارخانہ ہے اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ جہاں چاہے ویرانے کو بستی میں تبدیل کر سکتا ہے۔

مَیں اس گاؤں تک ایک بہت لمبا ناقابلِ دُشوار، سوہانِ روح بھرا سفر طے کر کے آیا ہُوں۔ اس گاؤں میں رہتے ہوئے مجھے بائیس برس ہو چکے ہیں۔ یہ بستی جسے مَیں گاؤں ہی کہوں گا، اس کی آبادی پانچ درجن گھروں اور تین ساڑھے تین سو افراد پر مشتمل ہے۔ جانے یہ گاؤں کب سے آباد ہے۔ دُنیا سے الگ تھلگ، ہنگاموں اور شہروں کی رونقوں سے دُور اس گاؤں میں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اُنھیں بس یہ معلوم ہے کہ مَیں گاؤں کے مکھیا پیڈرو کا ایک دوست ہُوں جو پہلے کسی بڑے شہر میں رہتا تھا اور اب یہاں اس لیے آباد ہو گیا ہے کہ یہاں وہ اپنا بُڑھاپا، سکون اور شہر کے ہنگاموں سے دُور بسر کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ مجھے فرنانڈو کے نام سے جانتے ہیں اور احترام سے 'بُوڑھا فرنانڈو' کہہ کر پکارتے ہیں۔

وہ نہیں جانتے کہ مَیں ڈاکٹر جوہان ہُوں جس نے برلن میں جنم لیا تھا اور اپنے زمانے کا بہت بڑا فلسفی، نفسیات دان اور نازی تھا۔ وہ فیوہرر ہٹلر کا دستِ راست، مشیر اور اُس کی زندگی کے آخری ایّام کا ساتھی اور راز دار تھا۔

اس چھوٹے سے ہسپانوی گاؤں کے باشندوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ مَیں وہی ڈاکٹر جوہان ہُوں جس کی تلاش میں یہودیوں اور اسرائیلی جاسوسوں نے پُوری دُنیا کھوند ڈالی ہے

ارشادِ قائدؒ

مَیں آپ کو صاف طور پر بتا دُوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردُو ہوگی اور صرف اُردُو۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ پاکستان کا دُشمن ہے۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔

(ڈھاکہ۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

اور میرا سُراغ لگانے اور اتہ پتہ بتانے والے کو دُنیا کی کئی حکومتیں لاکھوں ڈالر انعام دینے کا اعلان کر چکی ہیں تو یہ بظاہر سیدھے سادے لوگ جو مجھے احتراماً بوڑھا فرنانڈو کہہ کر میرے سامنے سر جُھکاتے ہیں، یہ مجھے بیچ کھائیں اور میری بوٹی بوٹی کر دیں۔۔۔

کاغذ کے سینے پر ٹیڑھے ترچھے ناہموار الفاظ کے ذریعے یہ انکشاف کرتے ہُوئے مَیں خوفزدہ نہیں، کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ چند روز کا مہمان ہُوں اور یہ کاغذات میری موت کے بعد پڑھے جائیں گے اور تب نہ کوئی مجھے بیچ سکے گا نہ کوئی سزا دے سکے گا۔ یہ ضرور جانتا ہُوں کہ ان انکشافات سے زلزلہ آئے گا۔ ایسا زلزلہ جو پُوری دُنیا کو مُدّتوں لرزاتا رہے گا۔

دُنیا کے بہت سے لوگ ایک عرصے تک پُورے تیقّن سے یہ کہتے رہے کہ ہٹلر زندہ ہے اور وہ ایک دن نمودار ہو گا اور پھر جرمنی پر قابض ہو جائے گا۔ ہٹلر پُوری دُنیا کے لیے ایک عفریت اور آسیب بن چکا ہے۔ آج بھی دُنیا اس تصوّر سے کانپ جاتی ہے کہ وہ کہیں چُھپا ہُوا دُنیا کو تباہ کرنے اور اپنی آمریّت کے تسلّط کے لیے منصوبے بنا رہا ہے۔۔۔

مَیں دُنیا کو بتا دینا چاہتا ہُوں کہ ہٹلر مر چکا ہے۔ وہ زندہ نہیں۔ وہ کہیں چُھپا ہُوا دُنیا کو ایک بار پھر خوفناک

جنگ میں جھونک دینے کے منصوبے نہیں بنا رہا۔ اُس کی ہڈیاں تک گل سڑ چکی ہیں۔

لیکن مَیں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہُوں . . . کہ وہ ہٹلر جو برلن میں خُفیہ بنکر کے باہر جلایا گیا اور جس نے خودکشی کی، وہ اصلی ہٹلر نہیں تھا۔ اصلی ہٹلر . . . مائی فیوہرر تو وہاں سے زندہ بچ کر نکل آیا تھا . . . اور مَیں اُس کے ساتھ تھا . . . اور مَیں نے اصلی فیوہرر ہٹلر کو مرتے ہُوئے دیکھا۔

اور اپنی موت سے پہلے مَیں دُنیا کو بتا دینا چاہتا ہُوں کہ وہ کیسے مرا۔ جب مَیں چند سطریں لکھ لیتا ہُوں تو میری اُنگلیاں تھک جاتی ہیں۔ میری اُنگلیوں میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ قلم کو پُوری طرح اپنی گرفت میں لے سکیں۔ اُنگلیوں کے جوڑ شدّت سے درد کرتے ہیں اور اُنگلیاں سُوج جاتی ہیں۔ مَیں رُک کر اُنھیں سہلاتا ہُوں اور پھر لکھنے لگتا ہُوں کیونکہ مجھے موت کے فرشتے کے پَروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دے رہی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ سانس کی ڈوری کاٹ دے۔ مَیں یہ تحریر مکمل کر لینا چاہتا ہُوں، اس لیے میں تمام تفصیلات سے احتراز کروں گا . . . !

وہ بہادر ہوا باز خاتون اگنشا ہمیں پہاڑوں اور جنگلوں میں گھری ہُوئی وادی میں بحفاظت پہنچانے میں کامیاب ہوگئی۔ اب ہمارا سفر ایک خاص مقام تک پیدل اور اس سے آگے کشتی میں طے ہونا باقی تھا۔ مَیں اور ہٹلر دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ ہٹلر کا چہرہ ایک بڑی گنجان ڈاڑھی کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں کی رنگت بھی تبدیل کر دی تھی اور سر پر بالوں کی ایسی وِگ جما دی تھی کہ کوئی شخص اُسے اس حُلیے میں پہچان نہیں سکتا تھا۔ اُس وقت وہ ایک کمزور انسان کی طرح ایک تھیلا کندھے پر لٹکائے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اُس تھیلے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں، پانی، کچھ بوتلیں اور تھیلے کی خُفیہ تہ میں چند بہت قیمتی ہیرے محفوظ کیے گئے تھے۔ ایک تھیلا میرے کندھوں سے بھی لٹکا ہُوا تھا۔ اس تھیلے میں چند کپڑے، چند بھیس بدلنے والی چیزیں اور محلول اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔

اس کے علاوہ اُس تھیلے کی خُفیہ تہ میں کچھ بہت قیمتی ہیرے موجود تھے۔ میری طرح ہٹلر کے پاس بھی ایک پستول تھا اور ہم دونوں کے پاس انتہائی مُہلک زہر کے دو کیپسول بھی تھے۔ یہ وہ زہر تھا جو آزمُودہ تھا اور اُسے زبان پر رکھنے کے ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر انسان مر جاتا ہے۔

یہ دونوں تھیلے چند روز پہلے تیار کیے گئے تھے۔

میری جیب میں ایک نقشہ اور ایک قطب نما بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں دُور اُفتادہ ساحلی علاقے تک پہنچنے کے لیے کم از کم پچاس کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ فیوہرر ہٹلر نے مجھے کہا تھا:

"ہمیں یہ فاصلہ دو روز میں طے کرنا ہوگا۔"

"آپ اتنا فاصلہ پیدل طے نہیں کر سکیں گے۔"

"ہم دن میں دس بارہ کلومیٹر چلیں گے، پھر سستائیں گے، سوئیں گے اور رات کو زیادہ فاصلہ طے کریں گے۔ ڈاکٹر! ہم یہ فاصلہ دو روز میں طے کر کے ہی اپنی پہلی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔"

راستہ پُرپیچ، پہاڑی تھا اور درختوں میں گھرا ہُوا تھا۔ ہٹلر بہت پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے ہونٹ بھنچے تھے، گویا وہ اپنے اصل جذبات چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں اُس کے قریب رہا تھا اور اب تو مَیں اُس کے بے حد قریب آ چکا تھا۔ اس کے باوجود اُس کی دہشت اب بھی میرے دل میں موجود تھی۔ آخر وہ معمولی انسان نہیں تھا۔ اب بھی جرمنی کا مستقبل اُس کی زندگی کے ساتھ ایک عجیب انداز سے وابستہ تھا۔

بمشکل پانچ یا چھ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہُوا ہوگا کہ ہٹلر نے کہا:

"ڈاکٹر! پانی . . ."

وہ چاہتا تو اپنے تھیلے سے بھی پانی کی بوتل نکال کر پیاس بُجھا سکتا تھا لیکن اُس نے مجھے حکم دیا تھا۔ مَیں نے رُک کر اپنے

اردو ڈائجسٹ

سالانہ بدلِ اشتراک برائے غیر ممالک

مشرقِ اوسط

○ متحدہ عرب امارات ○ عمان ○ بحرین ○ قطر ○ ایران ○ عراق
○ سعودی عرب ○ کویت ○ شام ○ ترکی ——— ۲۸۰/- روپے

جنوب مشرقی ایشیا

○ بنگلہ دیش ○ تھائی لینڈ ○ چین ○ جاپان ○ کوریا ——— ۳۴۰/- روپے
○ بھارت ○ برما ○ سنگاپور ○ فلپائن ○ سری لنکا ○ مالدیپ ——— ۳[illegible]/- روپے
○ انڈونیشیا ○ ملائشیا ——— ۳۲۵ روپے

یورپ

○ برطانیہ ○ مغربی جرمنی ○ ڈنمارک ○ ناروے ○ فرانس ○ آسٹریا ○ اٹلی
○ سپین ○ سویڈن ○ ہالینڈ ○ بلجیم ○ یونان ○ یوگوسلاویہ ——— ۳۸۰/- روپے

افریقہ

○ زمبابوے ○ زیمبیا ○ الجزائر ○ نائیجیریا ○ جنوبی افریقہ ○ تنزانیہ ○ کینیا
○ تیونس ○ سوڈان ○ مصر ○ یوگنڈا ○ گنی ——— ۳۶۰/- روپے

آسٹریلیا

○ آسٹریلیا ○ نیوزی لینڈ ——— ۴۵۰/- روپے

امریکہ

○ ریاستہائے متحدہ امریکہ ○ کینیڈا ○ ارجنٹائن ○ جمیکا ○ میکسیکو ○ پانامہ ——— ۴۵۰/- روپے

نوٹ: ہر شمارہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کیا جائے گا۔ اس دوران جو بھی خصوصی نمبر شائع ہوں گے اُن کی علیحدہ قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔
بدل اشتراک کا بینک ڈرافٹ بنام اُردو ڈائجسٹ لاہور کے کسی بھی بنک کی معرفت ہونا چاہیے۔

مینجر اُردو ڈائجسٹ

پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۰ لاہور نمبر ۲۵ (پاکستان)

تھیلے سے پانی کی بوتل نکالی اور اُس کی خدمت میں پیش کر دی۔

"پہلے دو گھونٹ تم پی لو۔" اُس نے عجیب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پانی کے دو گھونٹ پی کر بوتل اُس کی طرف آگے کر دی۔ وہ مجھے دیکھتا رہا، جب تین چار منٹ یونہی گزر گئے تو اُس نے بوتل سے چند گھونٹ پانی پینے کے بعد کہا:

"تشکریہ ڈاکٹر!"

اوہ میرے خدا! وہ کتنا شکی، کتنا وہمی اور کتنا کینہ تھا۔ اسے شبہ تھا کہ پانی میں کہیں زہر ملا ہوا نہ ہو، اس لیے اُس نے پہلے مجھے پانی پینے کے لیے کہا تھا۔

آدھ کلومیٹر چلنے کے بعد وہ رُکا اور بولا:

"ڈاکٹر! اب ہم آرام کریں گے۔"

اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا گیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ایک درخت کے نیچے اُس نے پتے جمع کیے اور پھر اُس کے تنے سے کمر لگا کر اس طرح بیٹھا کہ دونوں ٹانگیں پھیلا دیں۔ میں اُس کے سامنے والے درخت کے ساتھ بیٹھنے ہی والا تھا کہ وہ کہنے لگا:

"ڈاکٹر! تم جھنڈ کے باہر ڈیرہ جماؤ گے اور جانے سے پہلے یہ تھیلا میرے پاس رکھتے جاؤ۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے تھیلا کندھے سے اُتارا، اُس کے پاس رکھا اور جھنڈ سے باہر نکل کر ایک درخت کے ساتھ بیٹھ گیا۔

وہ انسانی سطح پر کتنا خود غرض اور گھٹیا تھا، اس کا بھرپور اندازہ مجھے چند گھنٹوں ہی میں ہو گیا تھا۔

میں نے ایسے خیالات دل سے نکال دیے اور سوچنے لگا کہ ہم کس طرح اپنی پہلی منزل تک پہنچیں گے اور پھر ہٹلر اپنے آپ کو کس طرح مجتمع کر کے ایک بار پھر دُنیا کو چونکا دے گا۔

ایسے ہی خیالوں میں ڈوبا میں اُونگھنے لگا اور پھر اُونگھتے اُونگھتے سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ جھٹپٹے کا سماں ہو رہا تھا۔ میں نے وقت دیکھا سوا چار بج رہے تھے۔ میں کوئی دو اڑھائی گھنٹے سویا رہا تھا۔ چونکہ یہاں گھنے درخت تھے، اس لیے یوں لگتا تھا جیسے شام ہو گئی ہو۔ میں جلدی سے درختوں کے جھنڈ کے اندر داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہٹلر گہری نیند سو رہا ہے۔

اُس وقت اُس کے چہرے پر وہ خشونت دکھائی نہیں دے رہی تھی جو اُس کی آنکھوں کا خاصا بن چکی تھی۔

میں نے اُسے نہیں جگایا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کئی مہینوں سے کم خوابی کا شکار رہا ہے۔ اَن گنت سوچوں اور پریشانیوں نے اُس کی نیندیں اُڑا دی تھیں وہی ہٹلر جو ناروے اور فرانس کی فتح پر بے اختیار رقص کرنے لگا تھا، اُس کا یہ ناچ بہت مختصر ثابت ہوا تھا۔ اب وہ ایک غریب الوطن اور گمنام انسان تھا جو اپنا اصلی چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ اُسے نیند کی ضرورت تھی۔ خدا جانے اب بھی اُس کے ذہن میں کیسے کیسے خوفناک طوفان کلبلا رہے ہوں۔

میں نے پیاس محسوس کی، دبے قدموں چلتا ہٹلر کے پاس رکھے ہوئے تھیلے کی طرف بڑھا۔ تھیلے کو جونہی میں نے ہاتھ لگایا، ہٹلر ایک ایسے آدمی کی طرح ہڑبڑا کر اُٹھا جیسے کوئی اچانک اُس پر حملہ کرنے والا ہو۔

"فیوہرر میں... پانی..."

"اوہ... ہاں پانی..." وہ بڑبڑایا۔

میں نے بوتل نکال کر چند گھونٹ پیے اس دوران میں وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا:

"شام ہو گئی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا تھیلا کندھے پر لٹکایا اور دُوسرا تھیلا مجھے اُٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں ہم نے کافی آرام کر لیا ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔"

میں نے جیب سے نقشہ نکالا ، اُس پر اک نگاہ ڈالی اور پھر میں اُس سے چند قدم آگے آگے چلنے لگا۔ خاموشی سے ہم نے کوئی تین ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا، ہٹلر کی رفتار سُست ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا اور نہ میرے خیال میں اُس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ مسلسل کئی کلومیٹر چل سکے۔ لیکن وہ اپنی کمزوری کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا اور گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔

ایک جگہ رُک کر ہم نے ڈبل روٹی پر مُربّہ اور مکھن لگا کر کھایا اور پھر چل پڑے۔ راستہ تنگ، ناہموار اور اُونچا نیچا تھا۔ آسمان پر کالے بادل چھا رہے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ اب بارش ہونے والی ہے۔ گہرے بادل بتا رہے تھے کہ وہ جی کھول کر برسیں گے۔

"فیوہرر! بارش ہونے والی ہے۔"

"ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔" اُس نے جواب دیا۔

بمشکل پندرہ منٹ چلے ہوں گے کہ مُوسلا دھار بارش نے ہمیں آلیا۔ ہم دوڑتے ہُوئے درختوں کے نیچے کھڑے ہو گئے لیکن ہم وہاں بھی محفوظ نہیں تھے۔ پانی درختوں کے پتّوں اور ٹہنیوں سے ہمارے اوپر آ رہا تھا۔ ہم شرابور ہو رہے تھے۔

"ناقص، سب کچھ ناقص ..." ہٹلر دہاڑا۔

میں نے تاریکی اور بارش میں اُس کی طرف دیکھا، اُس کا چہرہ صاف دکھائی نہ دے رہا تھا۔

"ہاں سب نکمّے، کام چور، غلط منصوبے بنانے والے۔" وہ پھر دہاڑا۔

"مائی فیوہرر!" میں نے کہا۔

"ہاں، تم بھی نکمّے ہو ڈاکٹر! ہم اتنے خطرناک مشن پر ہیں۔ ہماری زندگیوں کے علاوہ جرمنی کے مستقبل کا مسئلہ ہے، لیکن تم نے کیا انتظام کیا۔ کچھ بھی نہیں۔ اب اپنی غلطی کی سزا بھگتو لیکن تمہارا کیا جائے گا۔ تم ہو ہی کیا۔ ایک معمولی سے کیڑے کی طرح ہو۔" وہ اب پُورے غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا، وہیں سر جُھکائے کھڑا رہا۔ بارش بے حد تیز تھی۔

"تم لوگوں سے اتنا نہ ہو سکا کہ ساتھ دو برساتیاں رکھ لیتے۔ کاش! تم لوگ میرے مشیر نہ ہوتے۔ تم جیسے نکموں اور احمقوں کو میں نے عزّت نہ بخشی ہوتی۔"

ہٹلر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ موسم کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے ہمیں برساتیاں ضرور ساتھ لے کر آنی چاہییں تھیں لیکن سامان میں نے تیار نہیں کیا تھا۔ تھیلوں میں جو کچھ رکھا گیا تھا وہ اُسی کے حکم پر رکھا گیا تھا۔ اب وہ اپنی غلطی میرے سر منڈھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

دو گھنٹے تک ہم بارش میں بھیگتے رہے۔ ہمارے جسم سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگ گئے۔ ہمارے کپڑوں سے پانی مسلسل نُچڑ کر گر رہا تھا۔ میں سردی سے کپکپانے لگا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ ہٹلر کا جسم بھی کانپ رہا ہے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب بارش ختم ہُوئی تو میں نے کہا: "فیوہرر! آپ لباس تبدیل کر لیں۔"

"نہیں، ایسے ہی چلو... کپڑے خود بخود سُوکھ جائیں گے۔"

ہم چل پڑے۔ اب گیلی کیچڑ والی تنگ راہ پر چلنا مزید دُشوار ہو گیا تھا لیکن ہٹلر چلتا رہا۔ ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہُوئے ہم نے نصف سے زیادہ فاصلہ صُبح کی پَو پھٹنے سے پہلے طے کر لیا۔ ایک بار پھر میں سچے دل سے ہٹلر کی ثابت قدمی اور قوّتِ ارادی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ہم نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ایک نسبتاً خشک جگہ دیکھ کر درختوں کے نیچے لیٹ گئے۔ اس بار ہٹلر نے مجھے اپنے سے دُور جانے کے لیے نہیں کہا۔ ہم ساری رات کے تھکے ہوئے تھے اور پھر بارش نے بھی ہڈّیوں کو سرد کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس کیں... اور پھر میں سو گیا۔

دوپہر کے لگ بھگ جب میری آنکھ کُھلی تو میں نے خلافِ توقّع ہٹلر کو بیدار پایا۔

"کیا اس وقت سفر جاری رکھنا مناسب ہو گا؟" اُس نے

...احل تک کا علاقہ جنگلاتی اور پہاڑی ہے۔ اس طرف ...گزر نہیں ہوتا، اس لیے میرے خیال میں کوئی خطرہ نہیں۔"

...ٹلر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور چل دیا۔ ...بھی جلدی سے اُٹھا اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اُس شکست خوردہ انسان میں بلاشُبہہ بہت سی قوّت ...تھی جسے اُس نے اپنے اندر محفوظ کر لیا تھا۔ اُونٹ کی طرح ...پانی کا ذخیرہ کر کے مہینوں پانی نہیں پیتا۔ بظاہر ہٹلر کی حالت ...ابتر تھی۔ وہ گھسٹ رہا تھا لیکن اُس کی اندرونی قوّت ...چلنے میں سہارا دے رہی تھی۔ ہم رات کے آخری پہر اُس ...علاقے میں جا نکلے جہاں سے ساحلی علاقہ دو تین کلومیٹر کے ...فاصلے پر تھا۔ ہٹلر کی ہمّت اور جفاکشی قابلِ داد تھی۔ ہم نے ...سفر کا پہلا مرحلہ توقّع سے بھی کہیں تھوڑے عرصے میں مکمل ...کر لیا تھا۔

ہم ...ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ میں نے دیر تک ہٹلر ...کو ...کرتے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا جس کا ایک ...بھی میرے پلّے نہیں پڑ رہا تھا۔

...جب صُبح کا ملگجی اُجالا پھیلنے لگا تو میں نے آہستہ سے کہا:

"...فیوہرر! مجھے اجازت دیجیے کہ میں ...."

...اس کی سرد آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔

"...تم کب تک انتظام کر سکو گے؟"

"...فیوہرر! میں چند گھنٹوں کے اندر انتظام کر لوں گا لیکن ...سفر رات ہی کو کرنا چاہیے، رات کے وقت ہم زیادہ ...رہیں گے۔"

"...میں یہیں اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"...فیوہرر" میں نے کہا اور اُسے مخصوص نازی انداز میں سلیوٹ ...

اُس نے سر ہلا کر جواب دیا اور مجھے جاتے ہُوئے دیکھتا ...

...ڈیڑھ گھنٹے بعد میں ساحلی علاقے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اب خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ اس مرحلے میں کامیابی ہمیں جرمنی کی سرزمین سے نکال کر بہت دُور لے جا سکتی تھی۔ ایک ایسے ملک میں جس کا سربراہ ہٹلر کا دوست تھا اور ہٹلر اُس ملک میں پناہ لے کر اپنی طاقت جمع کر کے ایک بار پھر جرمنی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

میں اب پھونک پھونک کر چاروں طرف دیکھتے ہُوئے قدم بڑھا رہا تھا۔ جنگلی اور سمندری پرندوں کی آوازیں قدم قدم پر چونکا دیتی تھیں۔ میں چلتا رہا اور پھر میں نے درختوں کی اوٹ سے ساحلی علاقے کی ایک بستی دیکھی۔ یہ مچھیروں کی بستی تھی۔ وہ لوگ جو شب و روز سمندر کا سینہ چیرتے اور مچھلیاں پکڑ کر پانی سے اپنا رزق حاصل کرتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا اُس بستی کی طرف بڑھنے لگا۔

میرا استقبال ایک درمیانی عمر کی بہت صحت مند، بہت پُرکشش خاتون نے کیا۔

"میں کسی ایسے مچھیرے سے ملنا چاہتا ہُوں جو بہت

تلاشِ معاش

اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پُوری ہوں۔ دوسروں کے سینے کا بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ اُن سے مانگ مانگ کر کھاؤ، تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اِس طرح بادشاہوں اور حُکّام پر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی راہ بھی سُجھائے گا۔ اپنے مصارفِ وضع قطع میں تکلّف سے کام نہ لیا کرو۔ اُسی قدر صرف کرو جس کی تم میں سکت ہو۔ (تفہیمات — شاہ ولی اللہ دہلوی)

تجربے کار ہو۔"

وہ ہنسی تو اُس کے موتیوں جیسے دانت جگمگ جگمگ کرنے لگے: "وہ تو پھر میرا شوہر ہی ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"تمہیں اُس سے کیا کام ہے۔ کون ہو تم اور اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ مَیں ایک اجنبی ہُوں۔ بے ضرر اجنبی۔"

وہ پھر ہنسی: "ایک بھُوکا اجنبی۔"

"چلو یہ بھی دُرست ہے،" مَیں نے کہا، "مَیں واقعی بھُوکا ہُوں لیکن بھوک مٹانے سے پہلے تمہارے خاوند سے ملنا چاہوں گا۔"

"آؤ، مَیں اُسے بُلاتی ہُوں۔" وہ چل پڑی۔ مَیں اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اِدھر اُدھر جال بکھرے ہُوئے تھے۔ ریت میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ سامنے حدِ نگاہ تک سمندر تھا۔ تیز ہوا میں پھٹ پھڑا رہے تھے۔ ایک خیمے کے باہر رُک کر اُس نے آواز دی:

"ہنریخ! دیکھو تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی باہر نکلا۔ اُس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ اُس کا سینہ چوڑا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ وہ بہت توانا دکھائی دے رہا تھا۔

عورت نے مجھے مُسکرا کر دیکھا اور خیمے کے اندر جاتے جاتے بولی:

"مَیں تمہارے لیے کافی بھیجتی ہُوں۔"

"شکریہ! فراؤ" مَیں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

ہنریخ کی نیلی آنکھیں مجھے گھُور رہی تھیں۔ وہ بولا تو اُس کی آواز بھاری اور رُعب دار تھی۔

"کون ہو تم؟ مَیں تمہیں نہیں جانتا۔"

"لیکن تم بہت کام کے آدمی ہو۔" مَیں نے جواب دیا۔ "مجھے جیسے آدمی کی ضرورت تھی وہ مل گیا ہے۔ وہ تم ہو۔"

"سیدھی بات کرو، کیا چاہتے ہو؟"

مَیں نے اُسے اشارے سے پیچھے پیچھے آنے کے

کہا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ سمندر کی لہروں کے قریب

مَیں نے اُس کی نگاہوں میں جھانکا۔ وہ ایک بے خوف

آدمی تھا۔

"مجھے ایک مضبوط کشتی کی ضرورت ہے اور تمہاری بھی

"مَیں پہلے ہی کہہ چکا ہُوں کہ مجھ سے کُھل کر بات کر

مَیں اُس کے کچھ اور قریب ہو گیا اور مَیں نے سرگوشی میں پُوچھا:

"کیا اس طرف اتحادی فوجی تو نہیں آئے؟"

"آئے تھے چلے گئے۔"

"کیا دوبارہ آنے کا اندیشہ ہے؟"

"مَیں کیا کہہ سکتا ہُوں۔" وہ بے نیازی سے بولا "تم

بات کرو کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"تم... تم" مَیں نے رُکتے ہُوئے کہا "نازی ہو؟"

"ہاں مَیں نازی ہُوں۔ جرمنی کا بیٹا ہُوں۔"

"تم جانتے ہو ہٹلر......"

"ہاں مَیں سُن چکا ہُوں۔ ہم شہروں سے دُور رہتے

لیکن ایک ٹوٹا پھوٹا ریڈیو بہر حال ہمارے پاس ہے جو

پُوری دُنیا کے حالات سے واقف رکھتا ہے۔"

"تم نازی ہو، اس لیے مَیں تم سے توقع کرتا ہُوں کہ

مادرِ وطن کے لیے کام کرو گے۔"

"کام کی نوعیت کیا ہے؟"

"سنو، مَیں ایک بہت اہم نازی لیڈر ہُوں۔ میرے

ساتھ ایک اور اہم نازی رہنما بھی ہے۔ ہم دونوں کی تلاش

میں اتحادی کُتے نکل چکے ہوں گے۔ ہمیں تلاش کرنے کے

لیے وہ کوئی کسر نہ اُٹھائیں گے۔ ہمارے پاس فیوہرر کا ایک

پیغام ہے جو اگر ایک دوسرے ملک کے سربراہ کو مل جا

تو ایک بار پھر نازی ازم کو عروج حاصل ہو سکتا ہے اور ہم

شکست کا داغ دھو سکتے ہیں۔ ہم سب اتحادیوں کو ناکوں

سکتے ہیں۔ اس وقت جبکہ تمام نازی رہنما پکڑے جا چکے

اور جو باقی ہیں وہ پکڑے جائیں گے، ہمارا جرمنی سے نکلنا بہت ناگزیر ہو گیا ہے۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا بس اتنا سمجھ لو کہ وہ فیوہرر کا آخری منصوبہ اور آخری پیغام ہے۔"

میں دُزدیدہ نگاہوں سے اُس کا ردِ عمل دیکھ رہا تھا۔ ہر نازی کی طرح وہ بھی بہت جذباتی اور جوشیلا تھا۔ اُس کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ بولا:

"اگر ایسا ہے تو بتاؤ مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

"تم مجھے اور میرے ساتھی کو آج رات یہاں سے نکال کر لے جاؤ اور آبنائے سپین کے پاس ہمیں کسی ساحلی علاقے پر چھوڑ دو۔"

"آبنائے اسپین!" وہ مُسکرایا پھر اُس کا چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا "کم سے کم تین دن میں ہم اس علاقے میں پہنچ سکتے ہیں، وہ بھی اس صُورت میں کہ موسم سازگار رہے اور کوئی دوسری رُکاوٹ راستے میں کھڑی نہ ہو جائے۔"

"خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ تم صرف ملک اور نازی ازم کی خدمت ہی نہیں کرو گے بلکہ آنے والے زمانے میں تمہارا نام پُوری دُنیا میں گونجنے لگے گا۔ پُورا جرمنی تمہارا شکریہ ادا کرے گا۔ ہم ـــ میں اور میرا ساتھی تمہیں بہت بڑی رقم انعام میں دیں گے۔ سفر کے خاتمے پر تمہیں اتنا کچھ مل جائے گا کہ تم ساری عمر عیش و عشرت سے زندگی بسر کر سکو گے۔"

وہ مُسکرانے لگا اور پھر آہستگی سے بولا:

"میں طبعاً مُہم جُو ہُوں۔ خطروں سے نہیں ڈرتا۔ میں بھی نازی ہُوں اور جرمنی کے لیے جان دے سکتا ہُوں۔ میرے دل میں یہ شُبہ بھی پیدا نہیں ہُوا کہ تم غلط آدمی ہو۔ اس لیے میں کسی لالچ کے بغیر تمہارے کام آؤں گا۔ تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔"

"تمہارے خیال میں ہمیں رات کو یہاں سے نکلنا چاہیے؟"

"ہاں یہی مناسب ہے۔ صُبح طلوع ہونے تک ہم بہت زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہوں۔"

چند لمحے وہ خاموش رہا اور کچھ سوچتے ہُوئے کہنے لگا:

"بہت سی چیزوں کا انتظام کرنا ہو گا۔ کشتی کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہو گا۔ ضرورت پڑی تو اُس کی مرمّت بھی کی جائے گی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ رکھنی ہوں گی۔ آخر تمہیں پہنچا کر مجھے بھی تو واپس آنا ہے۔ خیر... تمہارا ساتھی شام تک پہنچ جائے گا اور ہم سات آٹھ بجے آسانی سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

"تم خوشدلی سے تعاون کر رہے ہو۔" میں نے کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا:

"اسے ایک نظر دیکھو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ میں کون ہُوں۔"

اُس نے کارڈ لے کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ پھر اُس کی آنکھیں بھنچ گئیں۔

"اس پر تو فیوہرر کے ذاتی دستخط ہیں۔"

"ہاں، میں اُن کا ذاتی خدمت گزار اور مشیر رہا ہُوں، میرا نام ڈاکٹر جوہان گشٹالٹ ہے۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ مجھے غور سے دیکھا اک نگاہ پھر کارڈ پر ڈالتے ہُوئے بولا:

"ہاں، میں آپ کے بارے میں بہت کچھ پڑھ اور سُن چکا ہُوں۔ پچھلی رات بھی ریڈیو سے اعلان ہُوا تھا کہ فیوہرر کے بنکر سے ڈاکٹر جوہان پُراسرار انداز میں غائب ہو چکا ہے۔ اتحادی فوجیں واقعی تمہاری تلاش میں ہیں۔"

"اب تمہیں اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ہمیں آج ہی رات یہاں سے کیوں نکل جانا چاہیے۔ اُس نے دُور خیمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری بیوی کافی لا رہی ہے آئیے اُدھر چلتے ہیں۔"

کافی کے گرم گرم گھونٹوں نے میری توانائی بحال کر دی۔ کافی ختم ہُوئی تو وہ کہنے لگا:

"میں اب سفر کی تیاریاں کرتا ہُوں۔ آپ...."

"میں جنگل میں چلا جاؤں گا۔ اپنے ساتھی کے ساتھ سات بجے یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک بڑی گڈی نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا:

"اسے رکھ لو، یہ سفر کے ابتدائی انتظامات کے لیے ہے۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں...."

"تمہیں، سفر کے خاتمے پر جو انعام ملے گا، وہ تمہیں ساری زندگی کے لیے محنت مشقّت سے نجات دلوا دے گا۔"

"دیکھیں گے۔" وہ مُسکرایا۔ "وقت کم ہے اور کام زیادہ..."

میری اُنگلیوں کے جوڑ شدید درد کرنے لگے ہیں۔ میں مزید اختصار سے کام لُوں گا۔ اپنی رُوداد کو انجام تک پہنچانے کے لیے ابھی مجھے بہت کچھ لکھنا پڑے گا۔

اُسی رات ہم ہنریخ کی کشتی میں سوار طویل سمندری سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہَوا موافق تھی۔ موسم خوشگوار تھا اور سمندر انتہائی پُرسکون اور مطمئن تھا۔ ہٹلر نے اُس رات ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ وہ کچھ دیر تک کشتی میں جاگتا رہا پھر گہری نیند سو گیا۔ میں بھی جلد ہی سو گیا۔ صُبح ہم اُٹھے تو ہنریخ نے ہمیں ناشتے کے لیے کافی دی۔ ہٹلر کافی دیکھ کر خاصا خوش ہُوا۔ ہنریخ نے ہمیں ایک ایک اُبلا ہُوا انڈہ بھی دیا۔ جب ہم کھا چکے تو وہ بولا:

"یہ کچھوے کے انڈے تھے۔ لذیذ تھے ناں؟"

ہٹلر نے چند لمحوں کے لیے بُرا سا مُنہ بنایا لیکن پھر آنکھیں بند کر لیں۔ خود میرے لیے کچھوے کا انڈہ کھانا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

اس لمحے جبکہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں سے گزر رہا ہُوں، میں سچ لکھوں گا کہ وہ دو دن اور تین راتیں جو میں نے سمندر کے سینے پر گزاریں، میری زندگی کے پُرسکون شب و روز تھے۔ یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہُوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے ایک ایسی پُرجوش، بے سکون، ہنگامہ خیز زندگی بسر کی جس میں اَن گنت خطرات کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا لیکن یہ شب و روز پُرسکون تھے۔ سمندر مہربان تھا اور آسمان بے حد نیلا۔ طوفان آیا نہ بارش ہُوئی۔ فیوہرر نے مجھے اُنہی دنوں میں ایک بار کہا تھا۔ یہ نیک شگون ہے۔ طوفان بھی نہیں آیا اور بارش بھی نہیں ہُوئی۔

تیسری رات ہمیں ہنریخ نے ہماری منزل پر اُتار دیا۔ ہٹلر نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا:

"میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا پھر کندھے پر تھپکی دی اور اُسے وہ تین ہیرے تھما دیے جو ہٹلر نے مجھے ہنریخ کو دینے کے لیے دے رکھے تھے۔ وہ ہیرے رات کی تاریکی میں جگمگا رہے تھے۔ ہنریخ نے آہستہ سے کہا: "شکریہ! میں نے اپنا فرض پُورا کیا۔"

صُبح ہم نے اپنے آپ کو ایک سرحدی ہسپانوی قصبے میں پایا۔ ہم محفوظ تھے اور سمجھتے تھے کہ اب اتّحادی جاسُوس ہمیں کبھی تلاش نہ کر سکیں گے۔ ہم ایک دوست ملک کی سرحدوں کے اندر تھے اور جانتے تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے....

پسنجر ٹرین میں سوار ہوتے ہی ہمارے سفر کا تیسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔ سفر طویل تھا لیکن کسی خطرے کا ڈر نہ تھا۔ ہٹلر عام آدمیوں میں بیٹھا ہُوا کچھ بیزار سا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی مصنوعی بڑی ڈاڑھی اور سر کے بالوں کی وگ اُسے کچھ پریشان کرنے لگی تھی۔ اُس کے ماتھے کی لکیریں بتاتی تھیں کہ وہ گہرے خیالوں میں گُم ہے۔

اُسی روز جب شام گہری ہو رہی تھی ہم قسطلہ کے اسٹیشن پر اُترے۔ یہاں ہمارا قیام ضروری تھا۔ قسطلہ کی اُونچی نیچی گلیوں اور رات کی تاریکی میں ہم پر کسی نے توجّہ نہ دی۔ جب ہم اپنی منزل تلاش کر کے ایک اُونچی دیواروں والے پُرانے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے تو میرا دل کہہ رہا تھا: "ہٹلر دوبارہ برسرِ اقتدار آئے گا۔ جرمنی کے ماتھے سے شکست کا کلنک دُھل جائے گا۔ دُنیا ایک بار پھر ہٹلر کی طاقت کا لوہا مانے گی۔"

دروازہ کھُلا۔ ایک آدمی نے باہر جھانکا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا: "جوہان.... ڈاکٹر جوہان...." آدمی کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ

گیا۔ دوسرے لمحے مَیں اور ہٹلر مکان کے اندر تھے۔ دروازہ اندر سے مقفل کر دیا گیا۔

ایک بڑے کمرے میں مدھم روشنی تھی۔ وہاں ایک اور آدمی بھی بیٹھا تھا۔ مَیں نے اُس سے اپنا تعارف کرایا۔ اب دونوں کی آنکھیں میرے ساتھ والے پُراسرار شخص کی طرف بار بار اُٹھ رہی تھیں۔ مَیں نے دروازے پر استقبال کرنے والے آدمی کو سرگوشی میں بتا دیا تھا۔

"اندر چل کر ان سے تعارف کراؤں گا۔"

وہ تینوں نازی تھے جنہیں چھ ماہ پہلے ہٹلر نے ایک خاص مشن کے تحت اسپین بھجوا دیا تھا۔ ہٹلر اپنے آپ پر اعتماد رکھنے کے باوجود بہت محتاط بھی تھا۔ بوٹل اور گرنڈنگ، صفِ اوّل کے نازی لیڈر تھے اور انہیں گسٹاپو میں اہم اور کلیدی ذمےداریاں سونپی گئی تھیں۔ چھ ماہ پہلے انہیں اسپین کے آمر فرانکو کے ساتھ خصوصی مذاکرات کے لیے بھیجا گیا تھا۔ فرانکو نے انکار کیا تھا نہ کوئی خاص پیش رفت ہُوئی تھی۔ یُوں لگتا تھا کہ وہ ہٹلر کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتا اور جنگ کی بدلتی ہُوئی صُورت کے تحت کسی نتیجے پر بھی پہنچنا چاہتا تھا۔

اب نتیجہ نکل چکا تھا... اب فرانکو کا ردِعمل کیا ہو سکتا تھا، ہٹلر اس کی سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔

اُس نے مجھے اشارہ کیا اور دونوں آدمیوں سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہُوا۔ مَیں اُس کے پاس گیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا:

"انہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔ مَیں دوسرے کمرے میں جانا چاہتا ہُوں۔"

مَیں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ میرے ساتھی لباس تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ گرنڈنگ نے ہٹلر کو دوسرے کمرے کا دروازہ دکھا دیا۔ جب ہٹلر کمرے کے اندر چلا گیا اور اُس نے دروازہ بند کر دیا تو گرنڈنگ اور بوٹل دونوں نے بیک وقت پُوچھا:

"کون ہے وہ؟"

مَیں نے آہستہ سے کہا: "ابھی بتا دوں گا۔ اپنا ہی آدمی ہے۔"

"اب کیا ہو گا؟" بوٹل کی آواز بے انتہا پریشانی میں ڈوبی ہُوئی تھی "ہٹلر کی موت...."

"جرمنی اب کبھی ذلت کا یہ داغ نہ دھو سکے گا۔" گرنڈنگ بولا۔

"کاش! ہٹلر نے ہوش مندی کا ثبوت دیا ہوتا۔ رُوس کا رُخ نہ کرتا..." مَیں نے بات بدلنے کی کوشش کی:

"تمام باتیں ابھی ہوں گی۔ چند لمحے انتظار کرو۔"

وہ پھر نگاہوں ہی نگاہوں میں پُوچھنے لگے "کون ہے وہ؟" میں خاموش رہا۔ گرنڈنگ اور بوٹل دونوں بہت بےچین دکھائی دے رہے تھے۔ چند منٹوں کے بعد دروازہ کُھلا لیکن دروازہ کھولنے والا نمودار نہ ہُوا۔

ہم تینوں کی نگاہیں دروازے پر گڑی تھیں....

مَیں نے اپنی نگاہ پھیری۔ اب بوٹل اور گرنڈنگ میری نگاہوں کی زد میں تھے۔

ہٹلر نمودار ہُوا....

اُس نے اپنا میک اپ اُتار دیا تھا۔ اب وہ اپنے حقیقی حُلیے میں تھا....

دونوں چونکے اور ایک ساتھ بولے: "ہیل ہٹلر" اور دونوں کے بازو ایک ہی ساتھ نازی سیلوٹ کے لیے اُٹھے۔

ہٹلر نے پُورے طمطراق سے انہیں نازی سیلوٹ کا جواب نازی سیلوٹ کی صُورت میں دیا۔

یہ ایک ایسا منظر تھا جس نے اُس لمحے مجھے بہت کچھ بُھلا دیا تھا اور آج بھی یہ منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔ مَیں ہٹلر کو اس انداز میں دیکھ کر بھول گیا تھا کہ جرمنی شکست کھا چکا ہے اور جرمن قوم ذلتوں کی دلدل میں اُتر گئی ہے۔ مجھے یُوں لگا جیسے جرمنی کے سامنے آج بھی دُنیا کے ممالک گھٹنے ٹیک رہے ہیں اور آج بھی ہٹلر کا سکہ رواں ہے۔

گرنڈنگ، بوٹل کو ہٹلر نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مبہوت اور مسحور کیفیت میں اُسے دیکھتے جا رہے تھے۔ انہیں شاید اپنی

آنکھوں پر یقین ہی نہ آرہا تھا۔ مَیں نے گرنڈنگ اور بوئل سے سے کہا: "وقت کم ہے۔ فیوہرر کی عظیم رفاقت اور رہنمائی میں اہم اُمور پر گفتگو کرنی چاہیے۔"

وہ دونوں کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہٹلر اپنے خاص انداز میں تن کر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنے رعشہ زدہ بازُو کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا رکھّا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہی دُرشتی اور وہی سفّاکی نظر آتی تھی جس کے بغیر اُس کے وجود اور اُس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اُس نے گرنڈنگ کو اپنے مشن کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا۔ گرنڈنگ نے بڑے ادب سے محتاط الفاظ میں اپنی رپورٹ پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسپین کا آمر فرانکو آنا کانی کرتا رہا ہے۔ وہ قابلِ اعتماد نہیں رہا اور موجودہ حالات میں تو اُس پر بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

خلافِ معمول ہٹلر نے یہ رپورٹ بڑے اطمینان سے سُنی۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہُوا تھا کہ کوئی ایسی رپورٹ جو ناخوشگوار ہو اُسے سُنتے ہُوئے وہ چیخا نہ ہو یا میز پر مُکّے نہ مارے ہوں۔ گرنڈنگ نے اپنی معروضات ختم کر دیں تو ہٹلر نے ایک جملہ کہا:

"تمھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم زندہ ہیں۔ جن اندازوں اور قیاسات سے تم نے یہ رپورٹ مرتّب کی ہے وہ تمام خودبخود باطل قرار پا جاتے ہیں۔"

"دُرست ہے، مائی فیوہرر!" گرنڈنگ نے جواب دیا۔

"مَیں چاہتا ہُوں کہ تم فی الفور میڈرڈ روانہ ہو جاؤ۔" ہٹلر نے قطعی انداز میں حکم جاری کیا۔

"فرانکو سے ملاقات کرواور اُسے بتا دو کہ ہم زندہ ہیں اور اُس سے ملنا چاہتے ہیں اور ہماری اُس کی ملاقات انتہائی خُفیہ اور رازدارانہ ہو گی اور یہ قطعی طور پر ظاہر نہیں ہونے دیا جائے گا کہ ہم زندہ ہیں۔"

"مگر جنرل فرانکو سے ملنے کے تمام رابطے بیکار ہو چکے ہیں، فیوہرر!" بوئل نے زبان کھولی۔ ہٹلر کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ طیش میں آچکا تھا لیکن اُس نے کسی طرح اپنے آپ پر قابو پایا اور دبے ہُوئے لہجے میں بولا:

"ہم نے اسپین کی خانہ جنگی میں فرانکو کی مدد کی۔ وہ اتنا احسان فراموش نہیں ہو سکتا کہ ملاقات کرنے ہی سے انکار کر دے۔ پھر یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ اُس کے قریبی لوگوں میں ہمارے حامی موجود نہ ہوں۔ رابطے قائم کرنا تمھاری ذمّے داری ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا، فیوہرر!" بوئل نے ڈانٹ کھا کر جواب دیا۔

"میڈرڈ صرف گرنڈنگ جائے گا۔ تم ہمارے پاس رہو گے۔" ہٹلر نے بوئل سے کہا۔ پھر وہ گرنڈنگ سے مخاطب ہُوا: "میڈرڈ پہنچتے ہی تمھیں اطلاع دینی ہو گی کہ تم کہاں ٹھہرے ہو اور ہمارے ساتھ رابطہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ تمام معاملات جلدی طے ہونے ضروری ہیں۔ تمھیں رپورٹ کرنے کے لیے قسطلہ نہیں آنا پڑے گا۔ تمھارے ساتھ ہم رابطہ خود قائم کریں گے۔"

ہٹلر کے سونے اور کام کرنے کے لیے ایک کمرہ بطورِ خاص تیار کر دیا گیا۔ اُس کے سکون اور آرام کا پُورا خیال رکھا گیا۔ اگلے روز گرنڈنگ میڈرڈ روانہ ہو گیا۔ قسطلہ کی اُس گلی میں ہم اس انداز سے رہ رہے تھے کہ کسی کو سرے سے علم ہی نہ ہو کہ بوئل کے ساتھ کوئی اور بھی رہتا ہے۔ ہٹلر نے مجھے کہا تھا: "ڈاکٹر! تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔"

تیسرے دن گرنڈنگ کا پیغام آیا جس میں اپنی رہائش کے بارے میں معلومات بھجوائی تھیں اور کہا تھا کہ ابھی وہ اصل آدمی تک جانے کے لیے رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہٹلر اس پیغام پر بڑبڑاتا رہا لیکن طیش میں نہ آیا۔ مَیں جانتا تھا کہ اُس کی حالت اُس شیر کی طرح تھی جسے نیا نیا پنجرے میں قید کیا گیا ہو۔

چوتھے دن ہٹلر نے شام کے وقت کہا: "ہمیں خود اب میڈرڈ کا رُخ کرنا چاہیے۔"

"مگر فیوہرر! ابھی گرنڈنگ کا پیغام تو نہیں ملا۔"

"کچھ بھی ہو۔" ہٹلر نے اُسے گھورتے ہُوئے کہا۔ "ہمیں میڈرڈ جانا ہو گا۔"

اُس کا حکم ٹالنا ممکن ہی نہ تھا۔ تاہم مَیں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ بوئل کے دل میں ہٹلر کے لیے نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔

اگلے دن ہٹلر کا پھر نیا حلیہ بنایا گیا اور ہم میڈرڈ روانہ ہو گئے۔ ہم نے اُسی ریل کا انتخاب کیا تھا جو شام کے بعد ہی میڈرڈ پہنچتی تھی۔

میڈرڈ میں گرنڈنگ ایک پُرانی عمارت میں رہائش اختیار کیے ہُوئے تھا۔ وہاں ہم پُراسرار انداز میں پہنچے کہ آس پاس کے مکینوں کو ہماری آمد کی بھنک نہ پڑے۔ گرنڈنگ مایُوس دکھائی دے رہا تھا۔ فرانکو سے ملاقات کی وہ تمام تر کوشش کر چکا تھا اور ناکام رہا تھا۔

ہٹلر ہونٹ بھینچے سب کچھ سُنتا رہا۔ اُس نے ایک جُملہ کہا: "اپنی کوشش تیز کر دو۔"

دن عجیب و غریب انداز سے گزر رہے تھے۔ یکسانیت نے میرے اعصاب پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں تھا۔ گھر سے باہر جانے پر مکمل پابندی تھی۔ بوئل میں بہت سی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ وہ حالت کے تناؤ سے بعض اوقات بھڑک اُٹھتا ہے۔ ایسے آدمی سے کسی بھی خطرناک کام کی توقع کی جا سکتی تھی۔ گرنڈنگ کے انداز میں البتہ ابھی تک بُردباری تھی۔ وہ فرانکو کے ساتھ ملاقات کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

ہٹلر نے البتہ اپنی بوریت کا ذرہ برابر احساس نہ ہونے دیا۔ یہاں میڈرڈ میں اُسے ایک علٰحدہ کمرہ دیا گیا تھا جسے جملہ سہولتوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ سارا دن لکھتا رہتا۔ کبھی کبھار اُس کے کمرے سے اُس کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی دیتی۔ راتوں کو اکثر ایسا بھی ہُوا کہ میری آنکھ کھُلی تو مَیں نے اُس کے کمرے میں اُس کے چلنے اور ٹہلنے کی آوازیں سُنیں۔ وہ بہت کم سوتا تھا لیکن بظاہر ہشّاش بشّاش دکھائی دیتا۔ ساری دُنیا میں اُس کی موت کی خبر پھیل چکی تھی لیکن وہ زندہ تھا اور انسان جب تک زندہ ہو، اُمید قائم رہتی ہے۔

اُس نے جو کچھ کھویا تھا اُسے دوبارہ پالینے کی سو فیصد اُمید تھی۔

کبھی کبھی جب اُس کا مُوڈ ہوتا تو وہ ہمارے کمرے میں آ

جھُوٹ کی بدبُو

شیخ ابوالحسن علی حنبلی، کتاب الکواکب میں فرماتے ہیں حضرت کعبؓ بن مالک کو اللہ تعالیٰ نے بے حد ایمانی فراست عطا کی تھی۔ نابینا ہونے کے بعد اُن کا یہ حال تھا کہ جب کوئی اُن کے سامنے جھُوٹ بات کہتا تو وہ فرماتے: "خاموش رہ! مَیں تیرے مُنہ سے جھُوٹ کی بدبُو محسوس کرتا ہُوں۔"

(حُجّیتِ حدیث ـــــ مولانا محمّد ادریس کاندھلوی)

نکلتا، ہم مؤدب ہو جاتے۔ وہ اپنے ماضی کا کوئی واقعہ سُناتا، خود بھی لُطف اندوز ہوتا اور ہمیں بھی محظوظ کرنے کی کوشش کرتا۔

میڈرڈ میں آئے ہمیں دسواں دن تھا کہ شام کو گرنڈنگ لَوٹا تو اُس کا چہرہ بشّاش دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے بلاتمہید کہا: "فیوہرر! کل ساڑھے دس بجے جنرل فرانکو مجھ سے ملنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

ہٹلر کا چہرہ بھی کھِل اُٹھا۔ پون گھنٹے کی بریفنگ کے بعد ہٹلر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو اُس کا چہرہ بہت پُراُمید اور بہت مطمئن تھا۔

دوسرے دن بارہ بجے کے لگ بھگ گرنڈنگ ہمارے پاس بیٹھا فرانکو سے اپنی ملاقات کا احوال سُنا رہا تھا۔ ہمارے چہروں پر تو بے حد اشتیاق اور تجسّس موجود تھا ہی، ہٹلر بھی تجسّس کو چھُپانے میں ناکام رہا تھا۔ گرنڈنگ کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ اُس نے بتایا:

"جنرل فرانکو نے بڑی سرد مہری سے میرا استقبال کیا۔ اس سے پہلے جب مَیں اُسے فیوہرر کے خاص پیغامات پہنچایا کرتا تھا تو

وہ بہت گرمجوشی اور اخلاق سے پیش آتا تھا۔ اُس نے چھُوٹتے ہی مجھ سے کہا: "مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تم بہت دنوں سے میرے ساتھ ملاقات پر اصرار کر رہے ہو۔ ایسی کون سی وجہ ہے جس نے تمہیں میرے ساتھ ملاقات کے لیے مجبور کر دیا؟" گرنڈنگ نے کہا:

"جناب! مَیں آپ کو اس صدی کی سب سے بڑی خبر سُنانا چاہتا ہُوں کہ فیوہرر زندہ ہیں۔"

فرانکو چند لمحوں کے لیے گرنڈنگ کو عجیب چُبھتی ہُوئی نظروں سے گھُورتا رہا پھر قدرے بے ہنگم انداز میں بولا:

"ہاں، یقیناً بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں ہٹلر کی موت پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر بھاگ نکلا ہوگا۔ تم نے بھی ایک سُنی سُنائی بات کو حقیقت سمجھ لیا ہے۔"

گرنڈنگ نے بڑے ادب سے کہا: "جناب! مَیں حقیقت بیان کر رہا ہُوں اور فیوہرر ہی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔"

جنرل فرانکو چند لمحوں کے لیے پھر خاموش رہا جیسے اُسے گرنڈنگ کی کسی بات کی سمجھ ہی نہ آ رہی ہو۔

"ہٹلر کہاں ہیں؟" جنرل فرانکو نے پُوچھا۔

"جناب! وہ زندہ ہیں اور اُنھوں نے مجھے آپ کے پاس روانہ کیا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مَیں نے تم سے سوال پُوچھا تھا کہ ہٹلر کہاں ہے۔ تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔"

"جناب! وہ جرمنی سے باہر نکل چکے ہیں۔ ایک دوست مُلک میں چھُپے ہُوئے ہیں۔"

فرانکو نے سر ہلایا اور پھر آہستہ سے کہا: "جرمنی سے باہر... دوست مُلک میں... لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔"

گرنڈنگ نے بریفنگ کے مطابق فرانکو پر بعض اُمور واضح کرتے ہُوئے کہا:

"فیوہرر کی خواہش ہے کہ یہ خُفیہ ملاقات جلد از جلد ہونی چاہیے۔"

"لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ہٹلر زندہ ہے۔" فرانکو نے اپنی بات پھر دُہرائی۔

گرنڈنگ نے پھر فرانکو کو یقین دلانے کے لیے کچھ دلیلیں پیش کیں۔

"ایسی صورت میں مَیں جاننا چاہتا ہُوں کہ وہ کہاں ہیں؟" فرانکو نے مطالبہ کیا۔

"وہ ایک دوست مُلک میں چھُپے ہُوئے ہیں۔"

"مَیں اُس دوست مُلک کا نام جاننا چاہتا ہُوں۔" فرانکو نے یک دم لہجہ بدلتے ہُوئے کہا۔ "میرے پاس وقت نہیں۔"

یہ گویا دھمکی تھی کہ اگر گرنڈنگ نے سوال کا جواب نہ دیا تو پھر ملاقات ختم کر دی جائے گی۔

"وہ اسپین میں ہیں۔"

فرانکو یکدم کُرسی پر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنا ردِعمل چھُپانے کی بھرپُور کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اُس نے کہا:

"اسپین میں کہاں؟"

"مجھے یہ بتانے سے منع کر دیا گیا ہے۔" گرنڈنگ نے جواب دیا۔

"ہُوں!" فرانکو نے بڑے ہی معنی خیز انداز میں کہا: "اگر ایسی بات ہے تو سُنو۔ اگر ہٹلر مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میری ملاقات سے پہلے اُس کے ساتھ میرا ایک نمائندہ ملاقات کرے گا۔ اگر وہ مجھ سے پہلے اس نمائندے سے ملاقات نہیں کرے گا تو میرا یہ پیغام اُسے دے دو کہ وہ اسپین سے فی الفور نکل جائے۔" فرانکو نے چلتے چلتے بات مکمل کی۔ "اُس کا جواب مجھے کل صبح دس بجے تک مل جانا چاہیے۔"

فرانکو یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

ہم سب بہت مایُوس ہوئے۔ ہماری نگاہیں اب فیوہرر کے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں۔ بوٹل کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا استہزائیہ انداز جھلک رہا تھا۔

ہٹلر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند منٹ تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر بولا:

"آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ شام کو بتاؤں گا ہمیں کیا کرنا ہے۔"

مَیں اور گرنڈنگ بہت پژمردہ اور مایُوس تھے لیکن بوٹل

"ہمارے سو سال کے تجربے کا حاصل فی الحقیقت عمدہ گھڑیاں بنانا ہے جو سالہا سال چلتی ہیں"

مارسل اوبری، پریذیڈنٹ، اوبری فریریز ایس اے

سو سال سے زیادہ عرصے سے صحیح وقت اور پُراعتماد قابل قدر کارکردگی کی بناپر باذوق خریدار ویسٹ اینڈ گھڑی کو ترجیح دیتے ہیں۔

آج بھی سوئٹزرلینڈ کے معیار کی یہ مقبول روایت ویسٹ اینڈ میں مسلسل برقرار ہے۔ خواتین و حضرات کی پسند کے لیئے مختلف اقسام اور دیدہ زیب اسٹائل کی دلفریب گھڑیاں۔ جدید ترین کوارٹز یا مکینکل ماڈلز دستیاب ہیں۔ اور ہر گھڑی کے ساتھ بعد از فروخت سروس کی عالمی گارنٹی دی جاتی ہے۔

آج ہی اپنے قریبی ویسٹ اینڈ ڈیلر کے شوروم میں ملاحظہ فرمائیں۔

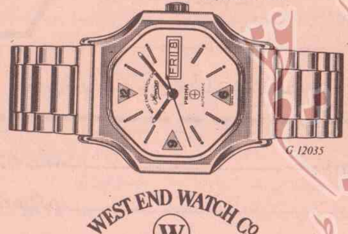

G 12035

WEST END WATCH Co

W

by Aubry of Switzerland

1886-1986

کامریڈ واچ کمپنی

لکشمی بلڈنگ، ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی
فون: ۲۳۱۱۱۹-۲۳۳۰۶۰

ASIATIC

۵۰ روپے کی خصوصی بچت

۱۸۰ روپے کے بجائے صرف ۱۳۰ روپے

اُردو ڈائجسٹ کے سال بھر کے بارہ شماروں کی قیمت ۱۴۴/- روپے بنتی ہے اور رجسٹری خرچ کے ساتھ مجموعی قیمت ۱۸۰/- روپے بنتی ہے۔ اگر آپ سالانہ خریدار بن جائیں تو آپ کو صرف ۱۳۰/- روپے ادا کرنے پڑیں گے اِس طرح آپ کو ۵۰/- روپے کی بچت ہو گی۔ مزید فائدہ یہ ہو گا کہ جو خصوصی نمبر شائع ہوں گے، اُن کی زائد قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

براہِ کرم ذیل کا کوپن پُر کر کے ۸۰ پیسے کے لفافے میں بذریعہ ڈاک ارسال کر دیجیے

میں ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کا ماہ ______ سے خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں

مجھے ۱۳۰ روپے کا وی پی کر دیں ______

نام و پتہ ______

______

آپ ہمیں ۱۳۰ روپے کا منی آرڈر بھی روانہ فرما سکتے ہیں، چیک وصول نہیں کیا جائے گا۔ ہر شمارہ بذریعہ رجسٹری ارسال ہو گا۔

مینجر اُردو ڈائجسٹ پبلیکیشنز، سمن آباد، لاہور۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۰

کے لیے اپنی مُسکراہٹ چھُپانا مشکل ہو رہا تھا۔ شام تک وقت انتہائی بوریت میں گزرا۔ سات بجے ہٹلر ہمارے کمرے میں آیا اور اری سے بولا:

"گرنڈنگ! بوٹل! ڈاکٹر جوہان! تمہارا مشورہ کیا ہے؟"

یہ ایک حیران کُن واقعہ تھا جو ہٹلر کی انتہائی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ جو یک طرفہ طور پر حکم دینے اور فیصلہ کرنے اور من مانی کرنے کا عادی تھا، آج ہم سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔

بوٹل نے پہل کی: "آپ کو جنرل فرانکو کی شرط منظور کر لینی چاہیے۔"

گرنڈنگ نے آہستہ سے کہا: "فیوہرر! میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہی بہتر ہو گا۔"

"ڈاکٹر جوہان! تم کیا کہتے ہو؟"

"فیوہرر! فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔"

جب وہ جرمنی کا آمرِ مطلق تھا، تب وہ ایسے جملے سُن کر خوش ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ ہمارے جواب سے خوش نہیں ہُوا تھا۔

"سوال صرف ایک ہے۔" ہٹلر نے کہا: "کیا ہم جنرل فرانکو پر اعتماد کر سکتے ہیں؟" ہٹلر کے لہجے میں اَن گِنت اندیشے اور خطرے چھپے ہوئے تھے۔

بوٹل نے خاصے گستاخ انداز میں کہا:

"جناب! ہماری مجبوری یہ ہے کہ فرانکو پر اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔"

ہٹلر ایسا لب و لہجہ برداشت کرنے کا عادی نہ تھا لیکن وہ بے بسی کی انتہا تک پہنچ چکا تھا؛ چنانچہ آہستہ سے بولا:

"شاید، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اُس پر اعتماد کیے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔"

"تو مائی فیوہرر! کیا حکم ہے؟"

"تم کل پیغام پہنچا دو کہ ہمیں جنرل فرانکو کی شرط منظور ہے۔ اور دیگر معاملات بھی طے کر لو۔"

بوٹل نظریں نیچی کیے مُسکرا رہا تھا۔

دوسرے دن گرنڈنگ اپنے کام سے چلا گیا۔ واپس آ کر اُس نے اطلاع دی کہ اُس نے پیغام پہنچا دیا ہے۔ اُسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ایک بور اور تکلیف دہ دن گزر گیا۔ دوسری صبح ہُوئی۔ گرنڈنگ رابطے والے آدمی سے ملنے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو خاصا گھبرا رہا تھا۔

"فرانکو کا آدمی آج ہی چار بجے سہ پہر ملنا چاہتا ہے۔"

"چار بجے سہ پہر!" ہٹلر بڑبڑایا۔

"مائی فیوہرر! مجھے ہدایت دی گئی ہے کہ میں دو بجے تک اطلاع دے دوں کہ ملاقات کہاں ہو گی۔"

ہٹلر بہت اُلجھا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ یکدم اُس نے سر اُونچا کر کے کہا:

"ملاقات یہیں ہو گی۔"

"مگر مائی فیوہرر! یہ مناسب نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے شایانِ شان ..." میں نے کہا تھا۔

"ڈاکٹر جوہان! ملاقات یہیں ہو گی۔" پھر اُس نے بوٹل سے مخاطب ہو کر کہا:

"وقت کم ہے۔ ملاقات کے بعد ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ تم جلد ہی کسی دوسری جگہ کا انتظام کرو۔"

"اتنی جلدی تو کسی ہوٹل ہی ... میں ..." بوٹل بولا اور بات اَدھوری چھوڑ دی۔

"میں سمجھتا ہُوں لیکن ہوٹل درمیانے درجے کا ہونا چاہیے۔ ہم وہاں بدلے ہُوئے بھیس میں جائیں گے اور فرضی کاغذات دکھا کر ہی ٹھہریں گے۔"

بوٹل اُٹھا اور اُس نے کہا:

"میں انتظام کرنے کے لیے جاتا ہُوں۔"

چار بجے سے پہلے ہم نے ڈرامہ مکمل کر لیا۔ . .

جب گرنڈنگ جنرل فرانکو کے ایک نمائندے کو ساتھ لایا تو ہم نے اُسے کمرے میں بٹھایا اور اطلاع دی:

"فیوہرر چند منٹ میں آنے والے ہیں۔"

"تو کیا اُن کا قیام یہاں پر نہیں؟" فرانکو کے نمائندے جنرل

فرانچسکو نے پوچھا کہ فرانکو نے اپنے دستِ راست جنرل فرانچسکو ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔

"جی نہیں" میں نے جواب دیا" یہ جگہ اس ملاقات کے لیے چند روز پہلے حاصل کی گئی تھی۔ فیوہرر کسی دوسری جگہ ٹھہرے ہیں اور آپ سے ملاقات کے بعد، آپ کے جانے سے پہلے وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ ضروری ہے"۔

جنرل فرانچسکو نے کوئی جواب نہ دیا۔

ہٹلر کو ہم نے اس دوران میں باورچی خانے میں بٹھا رکھا تھا۔ دس منٹ بعد گرنڈنگ نے اطلاع دی:

"فیوہرر آ رہے ہیں"۔

ہٹلر بدلے ہوئے بہروپ میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی ڈاڑھی، مونچھیں اور وگ اتار کر میز پر رکھ دیں۔ جنرل فرانچسکو نے اُسے فوجی سلام کیا۔ گرنڈنگ اور بوئل کو کمرے سے جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ ملاقات میں ہٹلر نے صرف میری موجودگی ضروری سمجھی۔

"یقین کیجیے.... مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہو رہا ہے"۔ جنرل فرانچسکو نے کہا۔ ہٹلر نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب جنرل فرانچسکو کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا تو ہٹلر نے کہا:

"آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ میں ہی ایڈولف ہٹلر ہوں"۔

"جناب! بالکل یقین ہو چکا ہے۔ آپ کا نمائندہ پہلے ہی سارے ثبوت فراہم کر چکا تھا۔ آپ کو ایک نظر دیکھنے کی ضرورت تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ جنرل فرانکو تک میرا پیغام پہنچا دیں کہ ہماری ملاقات بہت جلد ہونی چاہیے۔ یہ اُن کے بھی مفاد میں ہے"۔

"یقیناً... یقیناً..." جنرل فرانچسکو بار بار ہٹلر کو دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ کی ملاقات ختم ہوئی۔ ہٹلر نے کہا:

"مجھے اجازت دیجیے۔ آپ کو ابھی چند منٹ رکنا ہو گا"۔

"بالکل... جی... درست ہے"۔ جنرل فرانچسکو نے جواب دیا۔

ہٹلر بڑی تمکنت سے کمرے سے نکلا۔

اُس کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے کہا:

"جنرل، آپ کو زحمت ہوئی۔ اب آپ جا سکتے ہیں"۔

نصف گھنٹے بعد ہم اُس ہوٹل میں تھے جہاں بوئل نے تین کمرے حاصل کیے تھے۔ ایک کمرہ صرف ہٹلر کے لیے تھا۔ باقی دو کمروں میں ہم تینوں کو گزارہ کرنا تھا۔

جنرل فرانچسکو نے جنرل فرانکو کو کیا رپورٹ دی، فرانکو کا ردِ عمل کیا تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیونکہ ہٹلر اور فرانکو کی ملاقات ہی نہ ہو سکی اور حالات نے یکدم پلٹا کھایا...

اُس رات نصف شب کے قریب گرنڈنگ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں سو رہا تھا۔ اُس نے مجھے جگاتے ہوئے کہا:

"ہمیں یہاں سے فی الفور نکلنا ہو گا"۔

"مگر کیوں؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ فرانکو کے حکم پر انٹیلی جنس کے کارکن پورے شہر میں ہٹلر کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر گھر اور ہر ہوٹل کی تلاشی لیں گے"۔

"اب کیا ہو گا؟" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بوئل کچھ انتظام کرنے جا چکا ہے۔ ہمیں ہوٹل سے نکلنا ہو گا"۔

"مگر فیوہرر..."

"میں اُن کو اطلاع دینے جا رہا ہوں۔ تب تک آپ چلنے کی تیاری کریں"۔

پانچ منٹ بعد گرنڈنگ میرے کمرے میں تھا اور میں تیار ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بوئل آ گیا۔

"میں نے ایک خفیہ ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے۔ جرمنی کا ایک نازی میڈرڈ سے دس میل دُور ایک اضافی بستی میں رہتا ہے۔ وہ ہمیں پناہ دے گا"۔

"کیا تم نے اُسے فیوہرر کے بارے میں بتا دیا؟"

"میں بے وقوف نہیں"۔ بوئل نے عجیب انداز میں کہا۔

"دس میل کا فاصلہ..." میں نے پوچھا۔

"انتظام کر کے آیا ہوں۔ چلنے کی تیاری کرو"۔ یہ کہہ کر بوئل نے گرنڈنگ کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں

ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ میرے دل میں خطرے کے سانپ سرسرانے لگے۔ لیکن میں بھی تو مجبور تھا۔

ہوٹل کے عقب میں ایک چھوٹی سی پُرانی کالے شیشوں والی کار کھڑی تھی۔ بوئل ہٹلر کو ہوٹل کے عقبی راستے سے باہر لایا، کار میں سوار کر کے بوئل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اور گرنڈنگ دونوں پچھلی نشست پر تھے۔

چھ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار یک لخت رک گئی۔ بوئل نے سرگوشی میں کہا:

"آگے دو ایک میل کا فاصلہ پیدل چلنا ہو گا۔ ایک اندر کے متوازی راستے سے۔ یہاں سے آگے پولیس نے بڑی سڑک کی ناکہ بندی کر رکھی ہے"۔

ہٹلر باہر نکلا اور ہم بھی باہر آ گئے۔

تاریکی میں ایک دوسرے کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بوئل نے آہستہ سے کہا:

"گرنڈنگ! تم اور ڈاکٹر جوہان ہم سے سو پچاس گز آگے چلو گے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔ میں اور فیوہرر تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ کوئی خطرہ ہو تو ہمیں متنبہ کر دینا"۔

ہم خاموشی سے گرنڈنگ اور میں آگے چلنے لگے۔ راستہ درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اوس درختوں سے ٹپک رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

نصف گھنٹے بعد ہم ایسے حصّے میں تھے جہاں تاریکی بے پناہ تھی۔ اچانک مجھے غرغراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا۔ وہ گھُٹی گھُٹی کربناک آواز ہمارے پیچھے سے آ رہی تھی... میں مڑا... غرغراہٹ مدھم ہو رہی تھی لیکن کسی کے ہانپنے کی آواز نمایاں ہو رہی تھی۔ میں پیچھے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ گرنڈنگ بھی مڑا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔

زمین پر جھکا گھٹنوں کے بل بیٹھا بوئل ایک بھاری پتھر اُٹھائے بار بار پوری قوّت سے ہٹلر کے سر پر مار رہا تھا۔ بوئل ہانپ رہا تھا اور دبے دبے ہذیانی انداز میں کہہ رہا تھا:

"تم کروڑوں انسانوں کے قاتل ہو۔ تم نے ایک ملک

آزادی کے چراغ

نیا ایڈیشن

مُسلمانوں نے پاکستان کی آزادی کے چراغ فروزاں رکھنے کے لیے جس جوانمردی اور والہانہ پن سے خون کی سبیلیں لگا دی تھیں ان کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر اس قدر مکمل اور کہیں نہیں ملتی۔ سید مشکور حسین یاد خود ان جانگداز حادثات سے گزر کر آئے ہیں اور اُنہوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جسے بتائے نہ بنے اور چھپائے نہ بنے۔

سفید کاغذ | فوٹو آفسٹ طباعت

رنگین سرورق

نیا ایڈیشن
قیمت ۲۰ روپے

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد۔ لاہور

ہی نہیں پوری دُنیا تباہ کر دی ہے۔ تم تو مر چکے ہو۔ تمہاری لاش کو برلن میں آگ لگائی جا چکی ہے۔ پھر تم کیسے زندہ رہ سکتے ہو۔ صبح جب تمہاری لاش لوگوں کو نظر آئے گی تو کوئی تمہیں پہچان بھی نہیں سکے گا۔"

میرے قدم زمین پر گڑ گئے تھے۔ میں مسحور سا کھڑا رہا۔ بوئل دیوانہ ہو چکا تھا۔ وہ بار بار پوری قوت سے پتھر ہٹلر کے چہرے پر مارتا جا رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ تاریکی اور سناٹے میں اُس کے ہانپنے کی آواز نے ماحول کو بہت خوفناک اور پُراسرار بنا دیا تھا۔

ہٹلر کی زندگی کا سفر تمام ہُوا۔

ایک مسخ لاش جلی ہُوئی.... برلن کے بنکر کے باہر دُنیا بھر کے لیے تماشا بنی ہُوئی تھی...

یہاں اصلی ہٹلر کا چہرہ تک مسخ کر دیا گیا تھا...

مَیں سازش کی تہ میں پہنچ گیا تھا سوچنے لگا... اب گرنڈنگ اور بوئل میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں؟

گرنڈنگ نے بوئل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہانپتا اور کراہتا ہُوا اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہُوا ہمارے ساتھ چل دیا۔ گرنڈنگ نے مجھ سے کہا: "ڈاکٹر! تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

ہم اُسی کار میں سوار ہو کر دوبارہ اُسی ہوٹل پہنچے جہاں سے ہم تھوڑی دیر پہلے چوروں کی طرح نکلے تھے۔ بوئل وہ تھیلا اپنے ساتھ لے آیا تھا جو ہٹلر نے اُٹھا رکھا تھا۔

بوئل نے شراب کی بوتل کھولی اور غٹا غٹ ایک چوتھائی بوتل حلق میں انڈیل لی۔

ہٹلر کو قتل کرنے والا معمولی انسان نہیں ہو سکتا تھا اور اُس کے قتل کو چھپانا بھی معمولی بات نہیں تھی۔

بوئل کی آنکھیں سُرخ تھیں اور وہ کہہ رہا تھا:

"ڈاکٹر جوہان! سنو، اگر ہٹلر اور فرانکو کی ملاقات ہو جاتی تو ایسے امکانات پیدا ہو جاتے کہ دُنیا چند برسوں کے بعد پھر ایک خوفناک جنگ اور تباہی کا سامنا کرتی۔ ہم نے ہٹلر ہی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یاد رکھو! ہم چاہیں تو تمہیں بھی ہلاک کر سکتے ہیں لیکن تم ایک فلسفی اور دانشور ہو، اس لیے تمہیں زندہ چھوڑ رہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ تم مرتے دم تک یہ راز اپنے سینے ہی میں چھپائے رکھو گے۔"

بوئل نے ایک جھٹکے کے ساتھ تھیلا میرے کندھے سے اُتار لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہٹلر اور میرے تھیلے میں چھپے ہُوئے ہیرے میز پر پڑے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

اُنھوں نے تمام ہیرے آپس میں مساوی بانٹ لیے۔ مجھے صرف تین ہیرے دیے گئے لیکن یہ تین ہیرے ہی میری ابقایا زندگی کی کفالت کے لیے کافی تھے۔

دو روز بعد میڈرڈ کے اخباروں میں ایک پُراسرار قتل کی خبر شائع ہُوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ لاش کا چہرہ اس حد تک مسخ تھا کہ اُس کی شناخت نہ ہو سکی۔ چھوٹی سی خبر میں بتایا گیا تھا کہ لاش کو لاوارث سمجھتے ہُوئے ضروری کارروائی کے بعد کمیٹی نے اُس کی تدفین کر دی ہے۔

تو یہ تھا ہٹلر.... فیوہرر ہٹلر کا انجام... قدرت نے اُسے کتنی ذلّت آمیز موت بخشی تھی۔

مَیں چند برس گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر پیڈرو سے میری دوستی ہو گئی اور مَیں نے اپنا سینہ اس خوفناک راز سے خالی کر دیا ہے جسے سالہا سال سے مَیں اپنے دل پر بوجھ محسوس کرتا تھا۔

--

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص کسی مسلمان کے عیب چُھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں اُس کے عیبوں پر پردہ ڈالے رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد میں اُس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ (الحدیث)

چلنا ہی زندگی ہے

قابلِ رشک ناکامیوں اور کامرانیوں کے چند سوانحی اشارے۔

ڈاکٹر محمد افضل

میں نے اپنی زندگی کس طرح گزاری، اس میں کیا مراحل آئے، جب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ناکامیوں اور مایوسیوں کا ایک مرقع نظر آتا ہے۔ ضمناً کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں لیکن بہرحال غلبہ ناکامیوں کا رہا ہے۔ یہ ناکامیاں بھی ضائع نہ ہوئیں کہ بقول میرؔ؎

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہر مایوسی نے ہمت بندھائی اور ہر مشکل نے شخصیت کے بنانے میں مدد کی۔ ان حالات کا مقابلہ کرتے ہُوئے اپنے آپ کو مسلسل محنت اور تگ و دو سے اس قابل بنایا کہ مزید علم، شعور اور آگہی حاصل ہوتی چلی جائے۔ جب کبھی کسی مرحلے پر کامیابی حاصل ہُوئی، تو اُسے پہلا قدم سمجھا اور کوشش کی کہ اعلیٰ مقاصد نگاہ میں رہیں۔ ان سب کے پس منظر میں زندگی کا ایک خاص تصور تھا ؏

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

زندگی کے پہلے سترہ سال دیہاتی ماحول میں گزرے۔ اس زندگی سے سادگی، خلوص، محنت اور نامساعد حالات کے مقابلے کا جذبہ اخذ کیا۔ مشکل حالات سے گھبرانے کے بجائے اِستعینوا بالصبرِ والصلوٰۃ کا سبق سیکھا۔ آج بھی دیکھتا ہُوں تو ہر صُورتِ حال میں سعی و استقلال ہی سپر دکھائی دیتے ہیں۔ سفرِ حیات میں شہری زندگی ہی سے زیادہ عرصے تک سابقہ رہا لیکن 'دیہاتیت' مزاج میں کچھ اتنی راسخ ہو گئی تھی کہ آج تک مغلوب نہ ہو سکی اور اس کے نقوش میرا عزیز سرمایہ ہیں۔

ابتدا ہی سے مطالعے کی عادت رہی؛ چنانچہ اب کبھی اپنی ذات کا تجزیہ کرنے بیٹھوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اسی عادت سے خیالات میں لچک پیدا ہُوئی اور اپنے آپ کو سخت سے سخت حالات کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت کو جلا ملی۔ اس کی بدولت ذاتی تربیت کا عمل ہی جاری نہیں رہا، بلکہ دوسروں کے ساتھ مشورہ اور مِل کر کام کرنے کا رُجحان بھی پُختہ تر ہُوا۔ رُکاوٹیں میرے سامنے ہمیشہ چیلنج کی صورت میں ظاہر ہُوئیں اور اپنی عادت کے مطابق میں نے کوشش یہی کی کہ وہ دوسروں کی معاونت سے دُور رہوں؛ چنانچہ ہر فرضِ داری مَیں نے بساط بھر محنت اور لگن سے پُوری کرنے کی کوشش کی۔

مطالعے کی عادت نے میرے اندر مختلف مسائل کے لیے مختلف اندازِ نظر اختیار کرنے کا رُجحان پروان چڑھایا اور یُوں نت نئے راستے تلاش کرنے کی تحریک پیدا ہُوئی۔ یہ صُورت تو نہ ہوتی کہ

ازاں کہ پیرویٔ خلق گُمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفت لست

(عام لوگوں کی پیروی سے گمراہی کا خدشہ ہوتا ہے، اس لیے میں اُس راہ نہیں چلتا جدھر سے کارواں گزرا ہو)

لیکن اتنا ضرور ہے کہ مروّجہ اندازِ فکر سے ذرا الگ ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے کی عادت ہمیشہ رہی۔ ابتدا ہی سے نتیجہ خیزی طبیعت میں کچھ اس قدر رچ بس گئی تھی کہ میری سوچ پر ہمیشہ عملیت کا غلبہ رہا اور وہ غور و فکر جس سے عملی نتائج نہ پیدا ہوں میرے لیے بیکار ٹھہرا۔ اس طرزِ فکر کا نقصان یہ ہُوا کہ مَیں تحریر و تقریر کے میدان میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا لیکن فائدہ یہ ہُوا کہ ہر خیال ذہن میں ایک ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے عملی مضمرات پیشِ نظر ہوتے ہیں؛ چنانچہ مَیں نے کوشش کی کہ خیالات سے ٹھوس عملی نتائج پیدا کیے جائیں اور بحمداللہ اس میں بہت حد تک کامیابی رہی۔ تشکیک و استفہام آگہی کی اساس رہا اور اسی طریقے سے مَیں نے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ روایتی طریقوں سے سرکشی اور گریز نے ہر جگہ ایک نئی تخلیقی راہ سُجھائی۔

مَیں نے اپنے کیریئر کا آغاز بھی تعلیم ہی کے میدان سے کیا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۲ء تک ثانوی تعلیم کے محکمے سے لے کر یونیورسٹی تک مختلف انتظامی عہدوں سے منسلک رہا اور اس طرح ان تمام مدارج کی عملی تربیت حاصل کی۔ یہ امر اب میری قابلِ فخر یادوں کا حصّہ ہے کہ ملک میں پہلا ثانوی تعلیمی بورڈ مَیں نے قائم کیا۔ ۷۲ - ۱۹۶۲ء کے عشرے میں میری توجہ زیادہ تر انتظامات کی طرف رہی۔ اس دوران میں مَیں نے یونیورسٹی میں 'انتظامی علوم' کا نیا شعبہ قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس شعبے سے متعلق علوم کی مختلف شاخوں کی تدریس میں حصّہ لیا۔ 'انتظامیات' ہی میری تحقیق کا موضوع بھی رہا اور اسی میدان میں مَیں نے کورنیل یونیورسٹی امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۷۲ء تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہنے کے بعد کویت میں انسٹی ٹیوٹ آف سائنٹیفک ریسرچ سے بحیثیت ڈائرکٹر ٹیکنو اکنامکس ڈویژن منسلک رہا اور کویت کی سائنسی اور صنعتی پالیسیوں کی تشکیل کے سلسلے میں اساسی نوعیت کی تحقیقات اور منصوبہ بندی کی۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان واپس بُلوایا گیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین کی ذمّے داریاں سونپ دی گئیں۔ اسی دوران میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں صدر کا مشیر بھی مقرر ہُوا۔ آجکل وزارتِ تعلیم کی ذمّے داریاں ہیں اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا ریکٹر ہُوں۔

بہت سے اداروں کی مشاورت کا موقع بھی گاہے بگاہے حاصل ہوتا رہا۔ ۱۹۵۹ء میں قومی کمیشن برائے تعلیم، ۱۹۶۹ء میں قومی محنت کے کمیشن کے علاوہ اور کئی منصوبوں اور پراجیکٹس کو انتظام، معیشت اور دیگر پہلوؤں پر تکنیکی مشورے دیتا رہا۔

تعلیم و تدریس کے میدان سے میرا تعلق ؏

یہ نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

چنانچہ قدرت نے مختلف ذمّے داریاں سونپیں اور انہیں باندازۂ ہمت پُورا کرنے کی توفیق بھی عطا کی۔ اس ملک میں نظامِ تعلیم کی جو کچھ خدمت مجھ سے ہو سکی، اُس میں ثانوی تعلیمی نظام کی از سرِ نو ترتیب، یونیورسٹی کی سطح پر نظامِ امتحانات میں چند بڑی اور شاید دُور رس تبدیلیاں، تجارتی اور حکومتی انتظامات کے شعبوں کی بُنیاد رکھنا؛ ۱۹۵۹ء میں قومی کمیشن کے مشیر کی حیثیت سے نظامِ تعلیم کی ترتیبِ نو میں حصّہ لینا اور اُردو ٹائپ کے سلسلے میں تحقیق جو اُردو ٹائپ رائٹر بنانے میں مفید ثابت ہُوئی، میری خوش کُن اور تسکین دینے والی یادوں کا حصّہ ہیں۔

مَیں نے کوشش یہی کی کہ مختلف میدانوں میں تجرباتی طریق سے نئے اور بہتر نتائج پیدا کیے جائیں اور قدرت نے اکثر صورتوں میں یہ نتائج پیدا کر دیے۔ 'توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے' کا اُصول پیشِ نگاہ رہا؛ چنانچہ کوشش کی کہ ہمت بلند رہے اور خدا کا شکر ہے کہ ناکامیوں اور مایوسیوں کے درمیان جگہ جگہ کامیابیاں بھی مل گئیں اور یہ انعام کچھ کم نہیں۔ باقی، زندگی کا پُورا تصوّر آج بھی یہی ہے کہ ؎

اگر امروزِ تُو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

تازہ افسانہ

قرض

سندھ کی موجودہ صورتِ حال کے پس منظر میں
انتہائی خوبصورت اور سبق آموز کہانی۔

سیّد جاوید اختر

کِسی نے رائفل کا بٹ ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کی پیٹھ پر مارا اور کڑک کر بولا: "بولو۔ کیا تم سیٹھ شفقت ہو؟"

"نہیں": اُس نے کراہتے ہُوئے جواب دیا۔ "مَیں سیٹھ شفقت نہیں۔ تمہیں کتنی بار بتا چکا ہُوں۔ آخر تم مانتے کیوں نہیں؟"

"ہمارا اُستاد نہیں مانتا۔" کوئی دوسرا شخص بولا۔ "وہ کہتا ہے تم سیٹھ شفقت ہو اور صادق آباد میں رہتے ہو۔"

"تمہارے اُستاد کو پہچاننے میں غلطی ہُوئی ہے۔ خُدا کے بندو! مجھے چھوڑ دو۔ مَیں تو ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہُوں اور لیاقت پور میں رہتا ہُوں": اُس نے فریاد کی۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" رائفل کا بٹ مارنے والا غصّے سے گرجا۔ "ہمارے اُستاد نے کبھی غلطی نہیں کی۔ وہ ایک نظر جسے دیکھ لے تو ایک سال بعد اُسے بھی پہچان سکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ دونوں بدمعاش پھر اُسے مارنے لگے جیسے دھنیا روئی دُھنتا ہے ___ ٹھوکریں، چانٹے اور گھونسے۔

آخرِ فروری کی یہ رات سنسان اور وحشت ناک تھی۔ چاند ڈوبنے والا تھا۔ ایک عجیب سنّاٹا سا طاری تھا اور وہ متواتر مار کھائے جا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خُون رِس رہا تھا اور جسم کا عضو عضو بُری طرح دُکھ رہا تھا۔

اُسے حیرت تھی کہ ڈاکوؤں کے اُستاد نے اُسے کیونکر پہچان لیا۔ جب شاہراہ پر اُس کی موٹر کو روکا گیا تھا تو اُس نے پھرتی سے شناختی کارڈ اور لائسنس وغیرہ سیٹ کے نیچے چھپا دیا تھا۔ بٹوا اگرچہ کوٹ کی جیب میں تھا مگر اُسے نکالنے کی مہلت ہی نہ ملی اور اب وہ باقی چیزوں کے ساتھ اُن کے قبضے میں تھا۔

یہ حادثہ اُسے روہڑی سے تقریباً پچاس میل شمال میں پیش آیا تھا۔ اُس وقت دس بج رہے تھے جب وہ ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھا۔ پنجاب کی سرحدی چوکی کوٹ سبزل ابھی خاصی آگے تھی۔ دراصل اُسے روہڑی سے نکلتے نکلتے ہی نو بج گئے تھے۔ کراچی سے تو وہ علی الصبح سورج نکلنے سے پہلے، مدھم اُجالے میں روانہ ہو گیا لیکن پانچ بجے کے لگ بھگ روہڑی پہنچ کر اُس کی

یٹوٹا ۴۷ کا گیئر ایک دم جام ہوگیا۔ بڑی مشکل سے ایک مقامی مکینک نے گراریاں سیٹ کیں اور ساڑھے آٹھ بجے اُسے فارغ کیا۔

"مَیں آگے جاؤں یا رات یہیں کہیں کسی ریستوران میں ٹھہر جاؤں؟"

اُس نے کئی بار اپنے آپ سے پُوچھا تھا کیونکہ اُن دِنوں اخباروں میں اس شاہراہ پر پڑنے والے ڈاکوں کی خبریں روزانہ شائع ہو رہی تھیں۔ اُس کا ذہن کہتا تھا یہ خطرہ مول نہ لو لیکن پھر یہ سوچ کر کہ صادق آباد اب صرف دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ہے، لہٰذا رات گھر جا کر بیوی بچّوں کے ساتھ بسر کی جائے، وہ آگے چل دیا تھا۔

نقاب پوش حملہ آوروں نے تلاشی لینے کے بعد اُس کی آنکھوں پر دبیز پٹّی کس کر باندھ دی اور ایک جیپ میں سوار کر کے یہاں ڈیرے پر لے آئے۔ راستہ کوئی پندرہ بیس منٹ کا تھا۔ ڈیرے پر پہنچ کر اُسے اُستاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ آنکھوں پر پٹّی ہونے کے سبب وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا ۔۔ اُستاد کو نہ شاگردوں کو۔ اُس سے چھینی ہُوئی نقدی، گھڑی اور ریوالور اُستاد کے

حوالے کر دیے گئے۔

"گاڑی بھی لے آئے ہو؟" اُستاد نے سوال کیا۔

"جی سائیں! یہ ہیں چابی!" کسی نے جواب دیا۔

"اور گاڑی کے کاغذات؟"

"وہ نہیں ملے، سائیں!"

"کون ہے یہ؟"

"خبر نہیں، سائیں! بولتا ہے مَیں ٹیکسی ڈرائیور ہُوں۔"

"کیوں بابا، آپ کون ہیں؟ سچ سچ بتاؤ۔ سچ میں بڑی برکت ہوتی ہے۔" اُستاد نے میٹھے لہجے میں اُس سے پُوچھا۔ "یُوں لگتا ہے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ بھلا آپ صادق آباد کے سیٹھ شفقت تو نہیں ۔۔ جننگ فیکٹری والے؟"

اُس کا دل ایک دم دھڑک اُٹھا۔ "خُدا خیر کرے!" اُس نے سوچا۔ "اس کمبخت اُستاد نے مجھے کہاں دیکھا ہے۔ اگر ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مَیں سیٹھ شفقت ہی ہُوں تو کل میرے گھر پانچ سات لاکھ روپوں کا مطالبہ پہنچ جائے گا۔" یہ سوچ کر اُس نے بشیر احمد ٹیکسی ڈرائیور کا سوانگ رچائے رکھا۔

"اچھا بابا ۔۔ اگر تم لیاقت پور کے بشیر احمد ہو تو تمہاری ٹیکسی کے کاغذات وغیرہ کدھر ہیں؟" اُستاد نے کسی قدر برہم ہو کر سوال کیا۔

"جناب! وہ راستے میں کہیں کھو گئے ہیں!" اُس نے جھوٹ بولا۔ "مَیں خود پریشان تھا کہ راستے میں چیک پوسٹ پر کیا کروں گا۔ سائیں! آپ چاہے میری ساری چیزیں رکھ لیں مگر مجھے واپس جانے دیں۔ میری بیوی سخت بیمار ہے، اسی لیے مَیں رات کو مجبوراً سفر کر رہا تھا۔"

کئی قہقہے بیک وقت بلند ہُوئے اور پھر اُستاد کی گرج دار آواز آئی: "لے جاؤ اسے اڈّے پر اور پُوچھو کون ہے یہ ۔۔ سیٹھ شفقت یا بشیر ٹیکسی والا!"

چنانچہ اُسے کھینچتے ہُوئے باہر کُھلی فضا میں لا کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور دو آدمی اُسے فحش گالیوں کے ساتھ بے رحمی سے پیٹنے لگے۔ بار بار وہ ایک ہی سوال کر رہے تھے: "بتاؤ تم سیٹھ شفقت ہو؟" اور ہر بار وہ ڈھٹائی سے یہی ایک جواب دہرا رہا: "نہیں، مَیں بشیر احمد ہُوں۔" اس طرح پُوری رات گزر گئی۔ ڈاکو بھی مار مار کر تھک گئے مگر اُستاد کا حکم تھا کہ صُبح ہونے سے پہلے پہلے اس کا صحیح اتہ پتہ معلوم کر لیا جائے۔

پھر جب رات کے سنّاٹے میں چڑیوں کی آخری چہکار سُنائی دی تو اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے یہ اُس کی آخری رات ہے اور صُبح اُس کے نصیب میں نہیں۔ نقاہت سے اُس کا بُرا حال تھا اور پُورا بدن شدّتِ درد سے اینٹھا ہُوا تھا۔

اور پھر جانے اُسے کیا ہُوا کہ وہ پاگلوں کی طرح چلّانے لگا: "ہاں ہاں ۔۔ مَیں سیٹھ شفقت ہی ہُوں ۔۔ مار دو مجھے، کُتّو! مَیں ویسے بھی مرنے والا ہُوں۔"

یہ سُنتے ہی ایک آدمی بھاگ کر اُستاد کو اطلاع کرنے ڈیرے پر گیا۔ اس دوران میں سیٹھ بڑبڑاتا رہا: "مَیں شفقت ہُوں.. مَیں سیٹھ شفقت ہُوں۔ صادق آباد کا مل اونر ۔۔ مار دو مجھے، حرامزادو!"

تھوڑی دیر بعد وہ آدمی واپس آیا اور آتے ہی اپنے ساتھی سے مخاطب ہُوا: "سائیں کا حکم ہے اسے چھوڑ دو۔"

"وہ کیوں...؟" دوسرے نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"سائیں بولتے ہیں اس آدمی نے ایک بار اُن پر احسان کیا تھا۔ چار سال پہلے جب وہ چوری کے جھوٹے الزام میں گرفتار تھے تو تھانہ صادق آباد میں اسی سیٹھ نے اُنہیں رہا کرایا تھا۔"

اُسے یک بہ یک کچھ یاد پڑا۔ شاید کوئی بے چارہ مسافر تھا جسے اُس نے ایک بار تھانہ صادق آباد سے آزاد کرایا تھا اور وہ اگلے روز اُس کے گھر مٹھائی کا ڈبّہ لے کر آیا تھا۔ لمبے قد کا جوان تھا اور دادو کا رہنے والا تھا شاید۔

جب اُس کی رسّیاں کھول دی گئیں اور ایک آدمی نے اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا تو ڈیرے سے کوئی شخص آیا اور بولا:

"سیٹھ صاحب! لو یہ دُودھ پی لو۔ سردار نے بولا ہے، آپ کا ہم پر ایک بڑا قرض ہے۔ اس لیے ہم آپ کو آزاد کر رہے ہیں۔"

پھر اُس نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "ارے بابا ۔۔ دُودھ پلا کے سیٹھ صاحب کو جدھر سے لایا ہے، اُدھر ہی پہنچا آؤ۔ یہ لو ان کی گاڑی کی چابی ۔۔ ریوالور اور پرس ۔۔ یہ سب کچھ ان کو واپس کر دو ۔۔ لیکن بابا سائیں کا حکم ہے آنکھوں کی پٹّی نہ کُھلے جب تک منزل نہ آ جائے۔"

اور اُسی لمحے سیٹھ شفقت کو خیال آیا: "اے کاش! مَیں نے پہلے ہی سچ بول دیا ہوتا۔"

●●

علم اور استدلال

ممتاز مؤرخ اور ماہرِ تعلیم، ابنِ خلدون کے مقدّمہ کو آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی نوعیّت کا ایک ایسا کارنامہ قرار دیا ہے جس کی تخلیق کے بارے میں ٹائن بی نے تسلیم کیا ہے کہ اس سے قبل ایسی تحریر کسی بھی ذہن نے کسی بھی عہد یا مقام میں پیش نہیں کی ہے۔ تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات کے آغاز میں ابنِ خلدون انسان کو ایک معاشرت پسند حیوان قرار دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں انسان کے سلسلۂ تعلیم کا تعیّن اُس تہذیب کی مادّی، فکری اور رُوحانی قوّتیں کرتی ہیں جس میں وہ رہتا بستا ہے۔ وہ اس خیال کا حامی تھا: "تعلّم و تعلیم صرف مہذّب معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں۔ انسان کی استدلالی صلاحیّت ہی اُسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اُس کی یہ قوّتِ استدلال اُسے زندگی بسر کرنے، معاشرے کے دوسرے ارکان کے ساتھ تعاون کرنے اور اُن تعلیمات کو قبول کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے ذریعے سے انسان کو دینوی اور اُخروی فلاح کے لیے عطا کی ہیں۔"

(کوریا کہانی ۔۔۔ حکیم محمدؒ سعید)

جرمنی سے ایک مکتوب

سکن ہیڈز

فرنگی نوجوانوں کا خطرناک ترین گروہ
جو افریشیائی باشندوں کو
بود بسے بدر کرنے کے درپے ہے۔

امجد علی

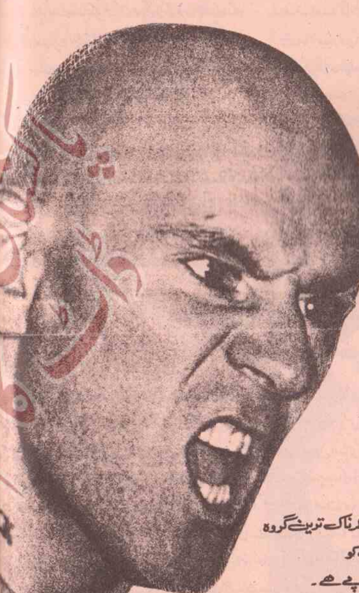

یہ واقعہ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ہمبرگ جرمنی کے علاقے وانڈشبک میں پیش آیا۔ ۲۶ سالہ ترک نوجوان رمضان عنصی اپنے دو ہم وطنوں کے ہمراہ ایک بار کے سامنے سے گزر رہا تھا جس میں سفاک جرمن نوجوانوں کا ایک گروہ جمع تھا۔ ترک نوجوانوں کو دیکھ کر انہوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ شائیز ترکن' اور 'کاناکرز' کے نعرے لگا رہے تھے۔ جلد ہی انہوں نے باہر نکل کر ترک نوجوانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اُن کے ہاتھوں میں بیئر کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں تھیں جن کے سرے بے حد تیز اور نوکیلے تھے۔ رمضان کے پاس گیس پھینکنے والا آلہ تھا، بہت سے غیر ملکی جو شہروں میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، اب اکثر ایسی چیزیں پاس رکھنے لگے ہیں۔

اچانک رمضان کے کندھے پر کسی نے بوتل دے ماری۔ اُس نے حملہ آوروں پر آنسو گیس پھینکی اور اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھاگتے بھاگتے اگلے چوک تک ہی پہنچے تھے کہ جرمن نوجوانوں نے انہیں آ لیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے: "ہم تم سُوروں کو جانے نہیں دیں گے"۔

رمضان کے باقی دو ساتھی تو نکل گئے مگر وہ خود بوکھلاہٹ میں سڑک پار کرتے ہوئے ایک فوکس ویگن سے ٹکرا کر گرا اور اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ جرمن نوجوان زمین پر بے بس پڑے ہوئے رمضان پر پل پڑے۔ انہوں نے پہلے تو اپنے بھاری جوتوں سے اُسے ٹھڈے مارے اور پھر کلہاڑے کے دستے، بیس بال کے ڈنڈے اور ورزش کے لٹھ سے اُسے ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ اکثر ضربیں انہوں نے پوری شدت سے لگائیں۔

پھر ان میں سے ایک اُس کے سر پر چڑھ گیا۔ اُس نے سیاہ رنگ کے مضبوط بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اپنا پورا وزن رمضان کے سر پر ڈالتے ہوئے وہ دائرے میں گھوم گیا۔ اس سے کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ رمضان کا سر کچلا گیا۔ تین دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کی صبح وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی میں غیر ملکیوں کے خلاف ہونے والی پُرتشدد کارروائی میں سے یہ خوفناک ترین تھی۔

پولیس نے پانچ نوجوانوں کو گرفتار کیا جن کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان تھیں۔ اپنے بالوں کے انداز، لباس اور چال ڈھال سے وہ نواحِ شہر کے اُن نوجوانوں سے مختلف نہ تھے جو ہفتے کی سہ پہر ہجوم در ہجوم فٹ بال اسٹیڈیم میں اور شام کو بار میں جمع ہوتے ہیں۔ ان پانچوں نوجوانوں کا تعلق نوجوانوں کے خطرناک ترین گروہ سکن ہیڈز (SKIN HEADS) سے ہے جس کے ارکان کے حلیے ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ اس گروہ کے نوجوان چمکدار فیتوں کے ساتھ جین کی مڑے ہوئے پائنچوں والی پتلونیں، تسمے دار لمبے سیاہ بوٹ اور سبز مٹی رنگ کی ہمبر جیکٹس پہنتے ہیں لیکن اُن کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سر منڈوائے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ملزموں میں سے صرف ایک یعنی ۲۲ سالہ رالف لانج نے اپنا سکن ہیڈ ہونا تسلیم کیا ہے مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ پانچوں کے پانچوں اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں غیر ملکیوں سے نفرت شمولیت کی شرطِ اوّل ہے۔

غیر ملکیوں اور تارکینِ وطن سے نفرت کی لہر نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، چنانچہ سکن ہیڈز کی یہ تحریک شمالی آئرلینڈ سے لے کر ایتھنز تک پھیل گئی ہے۔ اس میں یورپ کے نوخیز قوم پرست اور انتہا پسند نوجوان شامل ہیں۔ پچھلی دو تین دہائیوں میں یورپی نوجوانوں کے کئی ایک گروہ سامنے آئے مثلاً ماڈز (MODS) ٹیڈز (TEDS) انارکوس (ANARCHOS)، ہپی اور پنک (PUNK) وغیرہ لیکن اُن میں سے کوئی بھی اتنا خطرناک اور مار پیٹ کا رسیا نہیں تھا جتنے یہ سکن ہیڈز ہیں۔ ان کی مار دھاڑ اور تشدد پسندی رواں صدی کی تیسری دہائی میں جرمنی کی 'ایس اے' (STURN ABTEILUNG) یعنی 'نازی طوفانی دستے' کے مظالم کی یاد دلاتی ہے۔ سیاسی سطح پر اس گروہ کا تعلق دائیں بازو سے بنتا ہے۔

'سکنز' برطانیہ میں مزدوروں کے رہائشی علاقے کی پیداوار ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں لندن کے شکستہ حال علاقے ایسٹ اینڈ میں نمودار ہوئے جہاں کارکنوں اور بے روزگاروں کا تناسب برابر تھا۔ یہاں بھارت اور پاکستان سے آئے ہوئے تارکینِ وطن بھی رہائش پذیر تھے۔ غربت بہت زیادہ تھی، اس لیے ماں باپ بچوں کے بال کٹوانے پر خرچ ہو جانے والی رقم بچانے یا انہیں جوؤں سے نجات دلوانے کی خاطر اُن کے سر مُنڈوا دیتے۔ والدین اپنے بچوں کو فٹ بال کے لیے مخصوص مہنگے جوتے خرید کر نہیں دے سکتے تھے، اس لیے انہیں 'ڈاکٹر مارٹن' مارکہ لوہے کی نوک والے بوٹوں سے کام چلانا پڑتا تھا۔ یہی بوٹ جو کل مجبوری اور ضرورت تھے، آج فیشن بن چکے ہیں۔ جرمن 'سکنز' بھی 'ڈاکٹر مارٹن' کے جوتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بوٹ ان دنوں خاصے مہنگے ہیں مثلاً جرمنی کے شہر گیلزن کرشن کی ایک 'بوتیک' نردین' میں اُن کی قیمت ۱۴۰ مارک ہے یعنی تقریباً ۱۲۰۰ پاکستانی روپے۔

جہاں تک سکنز کی چمکدار فیتوں اور مُڑے ہوئے پائنچوں والی پتلونوں کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک معاشی مجبوری ہی تھی۔ والدین بچوں کو ہمیشہ نئے کپڑے لے کر نہیں دے سکتے تھے، اس لیے انہیں اکثر اپنے بڑے بھائیوں یا آبا حضرات کی اترنیں پہننا پڑتیں۔ یہ پتلونیں سائز میں اکثر بڑی ہوتیں، لہٰذا چمکدار فیتوں کی ضرورت

پڑتی اور انہی چیزوں نے آگے چل کر ایک مخصوص روایتی علامت کی شکل اختیار کر لی۔

ملازمتوں پر بڑوں کی اجارہ داری کے پیشِ نظر کم عمر بے روزگار نوجوان جن میں کالے اور گورے دونوں شامل تھے، باہم متحد ہو کر بغاوت پر اُتر آئے اور نوبت گلیوں میں اور سڑکوں پر ہاتھا پائی تک پہنچنے لگی۔ کالے اور گورے نوجوانوں کے اس اتحاد کی جھلک موسیقی میں بھی نظر آئی۔ ریگے کے دھیمے دھیمے سُر اور راک اینڈ رول کی تیز موسیقی بڑی خوبصورتی سے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

کالوں اور گوروں کے درمیان اتحاد اور محبت کی یہ باتیں آج قصۂ ماضی ہیں۔ اب تو انگریز سکن ہیڈز گلیوں میں یونین جیک لہراتے ہُوئے کچھ اس قسم کی نعرے لگاتے ہیں:

"اِف یُو آر وہائٹ۔ یُو آر آل رائٹ۔ اِف دے آر بلیک۔ سینڈ دیم بیک۔" (اگر تم گورے ہو تو تم بالکل ٹھیک ہو، اگر وہ کالے ہیں تو اُنہیں واپس بھیج دو)

وہ غیر ملکیوں کے خلاف زہر آلود پراپیگنڈے پر مشتمل پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں جن میں وہ اپنے ساتھیوں کو قومی انقلاب کی خاطر لڑنے پر اُبھارتے ہیں۔ انگریز سکن جارج اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہُوئے کہتا ہے: "کالوں کے جس سیلاب نے ہماری سرزمین کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اس کے خلاف ایک ہی چیز مؤثر ہے اور وہ ہے تشدد۔"

سکن ہیڈز ہر جگہ ہائل ہٹلر یعنی ہٹلر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہُوئے نازی آمر سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اُس کے نام اور اُس کی شخصیت کے دیوانے ہیں۔ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت بھی ہٹلر کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ فوجی انداز میں سینے سے اُوپر اُٹھا دیتے ہیں۔

انگریز سکنز، جن میں مُنڈے ہُوئے سروں والی لڑکیاں بھی شامل ہیں گلی کوچوں میں اکثر رات کے وقت غیر ملکیوں کے شکار کو نکلتے ہیں۔ ہر غیر ملکی سے اُنہیں خدا واسطے کا بیر ہے جو بھی اُن کے ہتھے چڑھ جائے، اُسے یہ اپنے تشدد کا نشانہ بناتے اور خُوب مارتے ہیں۔ کوئی غیر ملکی کُنبہ اُنہیں راستے میں مل جائے تو اُسے بُری طرح ہُوٹ کریں گے، اُس کی بے عزتی کریں گے اور گالیاں دیتے ہُوئے چلّائیں گے: "یہاں سے نکل جاؤ، جاؤ اپنے آبائی بنگلوں میں واپس بھاگ جاؤ۔"

یہودی بھی ان سے بچے ہُوئے نہیں۔ کوئی یہودی نظر آ جائے تو یہ انگریز سکنز نازی دور میں یہودیوں کی ہلاکت کی یاد تازہ کرتے ہُوئے جرمن زبان میں نعرے لگائیں گے "یُوڈن فیر گاسن... یُوڈن فیر گاسن"۔ (یہودیوں کو گیس چیمبر میں موت کے گھاٹ اُتار دو۔) پاکستانیوں کے لیے ان انگریز سکنز نے ایک خاص اصطلاح وضع کی ہُوئی ہے: "پاکی بیشنگ" (پاکستانیوں کو ختم کر دو) پاکستانیوں کو گلی کوچوں میں تنگ کیا جاتا ہے۔ اُن ہوٹلوں کے شیشے اکثر توڑ دیے جاتے ہیں جن کے مالکان پاکستانی ہیں۔ کئی خاندان، جن کا تعلق پاکستان سے ہے، سکن ہیڈز کی نفرت آمیز کارروائیوں سے تنگ آ کر برطانیہ چھوڑ چکے ہیں۔

انگریز سکن ہیڈز کے نعرے مثلاً "غیر ملکیوں کو باہر نکال دو۔" "ہر قیمت پر نظم برقرار رکھو" اور یہ کہ "کام کرنے سے طبیعت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔" اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ مغربی جرمنی کا نیو نازی گروہ اُن سے اپنے روابط بڑھا رہا ہے کیونکہ یہ نعرے ہٹلر کے دور کی یادگار ہیں۔ پورے یورپ میں مختلف سیاسی جماعتیں سکنز کی پشت پناہی کر رہی ہیں یا پھر اُنہیں اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کے لیے اُن پر ڈورے ڈال رہی ہیں۔ برطانیہ میں فاشسٹ پارٹی برٹش موومنٹ اور دائیں بازو کی انتہا پسند پارٹی 'نیشنل فرنٹ' دونوں سکن ہیڈز کی طاقت کو اپنے لیے جیتنے کی خاطر پُورا زور لگا رہی ہے۔

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں سکن ہیڈز کب نمودار ہُوئے، اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ جرمن نوجوانوں میں سر مُنڈانے اور لمبے سیاہ جُوتے پہننے کا رواج ۸۳-۱۹۸۲ء میں یا اس سے کچھ پہلے شروع ہُوا۔ یہ فیشن اُنہوں نے فٹ بال کے برطانوی شائقین کی نقل کرتے ہُوئے اپنایا تھا۔ ان شائقین کے درمیان موجود سکنز ہمیشہ اگلی صفوں میں نظر آتے تھے۔ انگریز

'سکنز' کی طرح جرمنی کے 'سکنز' کا تعلق بھی معاشرے کے ایسے طبقات سے ہے جہاں پیسے، شفقت اور تربیت کی کمی ہے۔ گوداموں کے عقب میں واقع رہائشی مکانات اور شہر کی نواحی بستیاں جہاں غربت اور بے روزگاری کا دور دورہ ہے اور جہاں بڑی تعداد میں غیر ملکی خاندان رہائش پذیر ہیں، یہی وہ مقامات ہیں جہاں یہ نوجوان پلے بڑھے ہیں۔

اکثر ایسا ہُوا کہ جو نوجوان 'سکن ہیڈز' میں شامل ہُوئے ہیں، وہ ایک طویل عرصہ 'پنک' میں گزار چکے ہیں، مثلاً گیلزن کرشن کے ۱۹ سالہ فرانک کا ایک عرصے تک پنک کے مختلف گروہوں مثلاً جی بوائز (GE-BOYS) اور سائیکوس (PSYCHOS) وغیرہ سے تعلق رہا لیکن پھر اُسے یہ سب کچھ بے حد فضول لگنے لگا اور پنک اُسے میلے کچیلے، مردم بیزار اور تنگ نظر دکھائی دینے لگے۔ یُوں وہ ایک سال پہلے 'سکنز' میں شامل ہو گیا۔ اب اُسے جرمنی قومیت اور ایک 'سکن' ہونے پر بے حد فخر ہے۔ وہ اپنے لمبے سیاہ جُوتے دن میں دو بار پالش کرتا ہے اور جب وہ چمکنے لگتے ہیں تو اُنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ فرانک کی ماں ایک ٹرام ڈرائیور ہے اور اپنے بیٹے کی اس تبدیلی سے بہت پریشان ہے۔ اُس کے بیٹے نے اُسے ایک بار گالی دی اور 'یہودی سُورنی' کہا تو پہلے تو اس کا جی چاہا کہ بیٹے کو گھر سے نکال دے مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ اب ماں کو اُمید ہے کہ جب فرانک لازمی فوجی تربیت کے لیے فوج میں جائے گا تو وہ لوگ یقیناً اس کا دماغ درست کر دیں گے۔ اُسے دست بدست لڑائی کی تربیت حاصل کرنے کا بڑا شوق ہے۔ فوج کا معاملہ تو ابھی بہت دُور ہے، سرِدست اُس کی یہ خواہش ہے کہ دادی اُسے دوبارہ کچھ پیسے دے تو وہ اُن سے اپنے جسم پر نقش گدوائے۔ بقول فرانک: "یہ نقوش ہر اصلی 'سکن' کی خاص علامت ہیں جس کے جسم پر ایسے نشانات سب سے زیادہ ہوں گے وہی سب سے سخت اور مضبوط سمجھا جائے گا۔"

'پنکس' اور غیر ملکیوں کی مخالفت اور اُن سے مار کٹائی اور یہ نقوش 'سکنز' کی نفسیاتی ضرورت ہیں۔ اُلجھے بالوں والے مردم بیزار 'پنکس' کے مقابلے میں 'سکنز' کام کرنے سے نہیں گھبراتے اور اُن میں سے اکثر نوجوان کہیں نہ کہیں کام سیکھ رہے ہیں یا کوئی ملازمت کر رہے ہیں۔ نفیس طریقے سے تراشے گئے بالوں، لمبے کوٹوں اور موٹر سائیکلوں والے 'ماڈز' یا پھر بُوٹوں کے تسموں کی ٹائی پہننے اور سینے پر سے تنگ مخملی کالروں کی جیکٹوں والے 'ٹیڈز' نے معاشرے کے نچلے طبقے سے اپنا تعلق چُھپانے کی کوشش نہیں کی۔ 'سکنز' کو بڑی رقوم یا خوبصورت کپڑوں کا بھی کوئی اتنا زیادہ شوق نہیں۔

ڈنزل ڈورف کے ۱۸ سالہ 'سکن' مارٹن کا کہنا ہے: "میری زیادہ سے زیادہ خواہش یہ ہے کہ کام مل جائے، ایک خوبصورت گھر ہو، کچھ کھانے کو ہو اور فرج میں ہمیشہ ایک ٹھنڈی بیئر موجود رہے۔"

مار پیٹ اور گالی گلوچ اُن کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جرمن 'سکن' ہانزی غیر ملکیوں سے نفرت کا اظہار کچھ یُوں کرتا ہے: "میں جب اُنہیں دیکھتا ہُوں تو میرے ہاتھ قابو میں نہیں رہتے۔ دل چاہتا ہے میں اُنہیں پیٹ ڈالوں۔" وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ سارے 'سکنز' کا یہی رویّہ ہے۔ پولیس کی رپورٹیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ ڈیوزبرگ میں چار 'سکنز' نے ٹرام کے اندر ایک ترک کو پیٹ ڈالا۔ اشٹٹ گارٹ میں 'سکنز' نے ترکوں کے دھوکے میں دو یوگوسلاوی باشندوں کو بے تحاشا مارا۔ تفتیش کے دوران میں اُنھوں نے اپنی اس کارروائی کو 'مالی نقصان' سے تعبیر کیا۔ اُنھوں نے بریمن میں ایک جرمن مرد کے چہرے پر بیئر کا گلاس دے مارا کیونکہ وہ ایک ترک عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ مائینز میں چھ 'سکنز' نے ایک ترک کو گالیاں دیں اور کھلی سڑک پر اُس کا پیچھا شروع کر دیا۔ وہ بھاگ کر اپنے ہموطنوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اُنھوں نے اُسے پہلے ہی پکڑ لیا اور مار مار کر اُس کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ ایک عورت کو بھی جو اُس ترک کی مدد کرنا چاہتی تھی، اُنھوں نے خوب مارا۔

'سکنز' کا تشدد غیر ملکیوں ہی تک محدود نہیں۔ برلن میں اُنھوں نے ایک یُوتھ ہوسٹل پر حملہ کر دیا اور ایک ۱۴ سالہ لڑکے کو بُری طرح پیٹا۔ ایک لڑکی کو دھمکی دیتے ہُوئے کہا: "تجھے تو مال بنا کے چھوڑیں گے۔" میونخ میں اُنھوں نے نوائے اسکاوٹس کے ایک ہوسٹل پر دھاوا بول دیا۔ 'سکنز' کے ایسے اِکادُکا واقعات عموماً قصباتی پولیس کی فائلوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کی زبردست پوشیدہ قوت کا اندازہ تب ہوتا ہے جب ایسے واقعات کسی جگہ تسلسل سے رُونما ہوں۔ مثلاً مغربی برلن میں پولیس نے پچھلے ساڑھے تین سال کی مدت میں 'سکنز' کے تقریباً دو ہزار جرائم رجسٹر کیے جو مالی نقصان اور جسمانی طور پر زخمی کر دینے سے متعلق تھے۔ 'سکنز' کے لااُبالی پن سے عام سڑکوں پر چلنے والے شہری بھی محفوظ نہیں۔ اگر کوئی ایک بار ان کے ہتھے چڑھ جائے تو پھر وہ لاکھ روئے، چیخے، معافی مانگے اور ان کے پَیر پکڑے وہ اُسے نہیں چھوڑتے۔ میونخ اور برلن کے علاوہ ہمبرگ بھی 'سکنز' کا بہت بڑا اڈّا ہے۔ یہاں وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور تقریباً سبھی پولیس کے علم میں ہیں۔ پُورے جرمنی میں دو ہزار تک ایسے نوجوان ہوں گے جنہیں 'سکنز' میں گِنا جا سکتا ہے۔

جرمن 'سکنز' کی ایک مثال ۱۹ سالہ مائیکل ہے جس نے اپنا نام 'ایروڈمیرا' (اسٹرابری) رکھا ہُوا ہے۔ اپنے دائیں بازو کے اُوپر اُس نے 'بدصورت، تشدد پسند اور سفاک' کے الفاظ گدوا رکھے ہیں اور مائیکل سے بھی ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ لمبے سیاہ بُوٹ اور گہرے رنگ کی بمبر جیکٹ پہنے وہ ایک ایسے پیکٹ کی طرح نظر آتا ہے جس کے اندر طاقت بند ہو۔ اُس کے بازوؤں پر کھوپڑیوں، مکڑیوں اور سانپوں کے نقوش گدے ہُوئے ہیں۔ کوئی ہنگامہ ایسا نہیں جس میں اُس نے حصّہ نہ لیا ہو۔ ۱۹۸۲ء میں فرینکفرٹ میں جن لوگوں نے بائیں بازو کے یُوتھ ہوسٹل 'باچ کپ' پر دھاوا بولا، وہ اُن میں سے ایک تھا۔ موسمِ گرما ۱۹۸۳ء میں اُس نے ہینوور میں 'پنکس' سے لڑائی کی اور جب ۱۹۸۵ء میں راٹرڈام کے راک فیسٹیول میں ہنگامہ ہوا تو ظاہر ہے مائیکل وہاں بھی موجود تھا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح اُسے بھی غیر ملکیوں سے شدید نفرت ہے لیکن فرینکفرٹ میں اپنے عمارتی کام کی جگہ جہاں وہ مستریوں کا کام سیکھ رہا ہے، اُسے خاموش رہنا پڑتا ہے کیونکہ وہاں بہت سے غیر ملکی بھی کام کرتے ہیں۔ اُس کے فورمین نے اُسے کہہ رکھا ہے کہ اگر اُس نے غیر ملکیوں کے خلاف ذرا سی آواز بھی نکالی تو وہ اُسے کھڑے کھڑے اُسی وقت نکال دے گا۔

جب وہ شراب کے نشے میں دُھت ہو جاتے ہیں تو 'ہائل ہٹلر' کے نعرے لگا کر اُس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ۲۰ اپریل کو ہٹلر کی سالگرہ منانے کے لیے تقریباً ۲۰۰ جرمن 'سکنز' فلینز برگ میں جمع ہُوئے۔ شراب پی کر وہ چیختے چلّاتے اور شور مچاتے اندرونِ شہر میں نکل گئے اور شہریوں اور پنک نوجوانوں کو بے حد پریشان کیا اور سارا فلینز برگ میں ترک قونصل جنرل نے اپنے تمام ہموطنوں کو اُس دن گھروں میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بندرگاہی علاقے میں بار اور ریستوران والوں نے اپنی حفاظت کے لیے لڑاکا جوانوں اور کراٹے کے پہلوانوں کا انتظام کیا ہُوا تھا۔ شہر کے تاجروں کو تحریری طور پر مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ ذاتی طور پر اپنی دُکانوں اور سٹورز کی حفاظت کا انتظام کر لیں۔

'سکنز' جہاں بھی گروہوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں وہاں خوف اور دہشت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہمبرگ کے ایک بار میں درجن بھر 'سکنز' گھس آئے۔ اُن کے جارحانہ عزائم دیکھ کر بار میں بیٹھے ہُوئے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا لیکن جلد ہی پولیس کی اکٹھی تیس گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں اور یُوں پولیس اُنہیں وہاں سے دُور لے گئی۔ جی بھر کر شراب پینے کے بعد وہ گالی گلوچ اور مار کٹائی پر اُتر آتے ہیں اور ایسا عموماً فٹ بال اسٹیڈیم میں ہوتا ہے۔ وہاں وہ کیا توقعات لے کر جاتے ہیں، اس کا اظہار میوزک بینڈ 'بیوہ ہرے اونکلز' کے نغمے 'فٹ بال اور تشدد' سے ہوتا ہے: "ہمیں اپنے

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک بار صحابہؓ سے فرمایا کیا تم میں سے کوئی ابوضمضم کی طرح نہیں ہو سکتا جو صبح و شام کہتے ہیں: "اے اللہ! مَیں نے اپنے نفس اور آبرو کو تجھے ہبہ کر دیا۔ اے اللہ! مَیں نے اپنی آبرو تیرے بندوں پر صدقہ کر دی جو مجھے گالی دے گا، اُسے مَیں گالی نہ دُوں گا اور جو مجھ پر ظلم کرے گا، اُس پر مَیں ظلم نہ کروں گا۔"

(آداب المریدین ــــ شیخ ضیاء الدّین سہروردیؒ)

مخالفین کا انتظار ہے۔ فتوحات کے جشن تو ہم بعد میں بھی منا سکتے ہیں۔ ہم ایک جنگی محاذ پر کھڑے ہیں اور اپنے نغمے گا رہے ہیں۔ ہمیں اپنے رنگوں کی قسم! ہم ان سب کو شکست دیں گے۔"

یورپ میں 'سکنز' کے اور بھی ایسے گروہ موجود ہیں مثلاً سوئٹزرلینڈ کا بینڈ 'بلوٹ اُنٹ ایہرے' اور مغربی برلن کا بینڈ 'کرافٹ دُرش فروئیڈے' 'کرافٹ دُرش فروئیڈے' ہٹلر کے دَور کی ایک سرکاری تنظیم کا نام بھی تھا۔ اُن کے ایک نغمے کا عنوان شاید ہٹلر کی تصنیف 'مائن کامپف' ہی کے جواب میں 'دائن کامپف' رکھا گیا ہے۔ اس نغمے میں وہ کہتے ہیں:

"سکن ہیڈ — جس کا تم نے انتخاب کیا ہے، ایک ایسا راستہ ہے جو تمہیں اپنے وجود کی بقا کے لیے طاقت بخشتا ہے۔ تم جنگ کرو گے اور فتحیاب ہو گے۔ تم ان سُوروں کو ختم کر دو گے، ہلاک کر دو گے۔"

فرانسیسی گروپ 'ایول سکنز' کا نغمہ 'سائیکلون بی' کچھ یُوں ہے: "ہمارا رہنما لوٹ آیا ہے۔ ہم تندور دوبارہ گرم کر رہے ہیں۔ خاردار تار پھیلا رہے ہیں اور سائیکلون بی تیار کر رہے ہیں۔ ہٹلر زندہ باد!"

ان میں سے اکثر برطانوی گروپ 'اسکریوڈرائیورز' کی نقل پر قائم ہوئے ہیں۔ 'اسکریوڈرائیورز' شروع میں ایک باغیانہ پنک بینڈ تھا لیکن اب اُس میں شامل ارکان اور اُن کا لیڈر ایان سٹوئرٹ مکمل طور پر فاشسٹ تنظیم 'نیشنل فرنٹ' کی لائن پر چل رہے ہیں۔

انگریز 'سکن ہیڈز' میتھیو مورگن (میڈ میٹ) جس نے 'ریس اینڈ نیشن' کے عنوان سے 'اسکریوڈرائیورز' کے لیے ایک نغمہ لکھا ہے، اُس کا کہنا ہے: "میں سفید نسل کی برتری پر یقین رکھتا ہوں۔ یہ واقعی ایک خاص اور اعلیٰ درجے کی نسل ہے۔" میڈ میٹ مشرقی لندن کی ایک ۲۲ منزلہ عمارت میں رہتا ہے جس کی لفٹیں بدبودار ہیں اور جہاں کمروں کے دروازوں کو، جن پر چوریوں کے نشانات ہیں اضافی تالوں سے محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُس کے سینے پر 'نازی سکن' اور WALHALLA کے الفاظ گدے ہُوئے ہیں۔ دائیں جانب جرمن نازی پارٹی کا نشان 卐 بنا ہُوا ہے جس کے اوپر 'اڈولف ہٹلر ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء' گدا ہُوا ہے۔ میڈ میٹ ایک غیر ملکی پر حملے کے جرم میں چار سال قید کاٹ چکا ہے۔ اُس کے پاس ہٹلر کی بہت سی تصاویر اور مختلف قسم کے جھنڈے موجود ہیں۔

برسلز میں مقیم ۲۲ سالہ انگریز 'سکن ہیڈ' جان میڈلٹن بظاہر دوسروں ہی کی طرح نظر آتا ہے لیکن پُوچھنے پر وہ ذرا سوچ میں پڑ جاتا اور پھر کہتا ہے: "میں بھی کبھی 'سفید طاقت' پر یقین رکھتا تھا لیکن اب تو میں اسے احمقانہ اور غیر انسانی نظریہ خیال کرتا ہُوں۔ اب مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ میں ہٹلر کے انداز میں سلام کے لیے اپنا ہاتھ اُونچا کروں۔" شاید اسی لیے اُس کے ساتھی اُس سے دُور دُور رہتے ہیں۔

یورپ کی سیاسی جماعتیں بھی کسی نہ کسی طریقے سے 'سکنز' کی تحریک کو مدد فراہم کر رہی ہیں۔ سپین میں نازی تنظیم (CEDADE) ان غنڈوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں کر رہی ہے۔

سویڈن میں "NORDISKAPASKPARTIET" (شمالی ملّی پارٹی) اُن کے لیے سرگرمیوں کا میدان مہیا کرتی ہے۔ آسٹریا میں "AKTION NEVE RECHTE" (نئے حقوق کی تحریک) اُن کی پُشت پناہی کر رہی ہے۔ بہت سی یورپی نیو نازی جماعتیں، جو پارلیمنٹ میں پہنچ گئی ہیں مثلاً اٹلی میں 'ایم ایس آئی'، فرانس میں ژاں ماری لے پاں کی 'فرنٹ ناسیونال' (قومی محاذ) اور سوئٹزرلینڈ میں 'NATIONAL AKTION' کی چند ٹکڑیاں، یہ سب جماعتیں 'سکنز' کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی میں 'آزاد جرمن مزدور پارٹی' ایف اے پی اور این پی ڈی اس میدان میں پیش پیش ہیں۔ جرمنی ہی میں دائیں بازو کے مائیکل کیوہنن کی کالعدم تنظیم 'ایکشن فرنٹ ناسیونالر سوشیالسٹن'، یعنی اے این ایس سے 'سکنز' کے بڑے قریبی تعلقات ہیں۔ دائیں بازو کی جماعت ایف اے پی کے ساتھ مل کر 'سکنز' نے ہٹلر کے نائب، شپانڈاؤ جیل برلن میں قید روڈولف ہیس کی سالگرہ منائی۔ صوبہ نارڈر ہائن ویسٹ فالن کے شہر وہیل میں این پی ڈی کا سالانہ اجلاس ہُوا تو اُس میں تقریباً ستّر 'سکنز' جمع تھے جن کی مخالفین کے ساتھ شدید جھڑپیں ہُوئیں۔

جرمن وزارتِ داخلہ کے خیال میں نیو نازی ارکان کے ساتھ 'سکنز' کا تعلق زیادہ تر پینے پلانے کی محفلوں تک ہی محدود ہے۔ این پی ڈی کے صوبائی چیئرمین کلاؤس شُکس کے خیال میں تو 'سکنز' کو یہ بھی

معلوم نہیں کہ دائیں بازو کی تعریف کیا ہے۔ فرینکفرٹ پولیس کو تفتیش کے دوران میں پتہ چلا کہ ہٹلر زندہ باد کے نعرے لگانے والے 'ڈرِٹن رائش' یعنی تیسری سلطنت کو قرونِ وسطیٰ کی کوئی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ جرمن تاریخ میں اس اصطلاح کا مطلب ہٹلر کا دَور ہے۔ تاہم جب نفرت میں بھرے ہُوئے 'سکنز' غیر ملکیوں کا تعاقب کرتے اور انہیں پریشان کرتے ہیں تو دراصل بالواسطہ طور پر اسی پالیسی کو عملی جامہ پہنا رہے ہوتے ہیں جو نیو نازی منشور کا اہم حصّہ ہے۔ اس طرح یہ نظریاتی لوگ مار پیٹ کے عادی احمقوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ستائیس سالہ فرانسیسی 'سکن' ہیبرٹ ایک مکینک ہے اور 'برُوٹل کمبیٹ' نامی بینڈ کا گلوکار ہے۔ 'سکن ہیڈز' کے حُلیے اور لباس کے فوائد گنواتے ہُوئے اُس نے کہا: "ہمارا لباس ہی ہمارے دفاع کے کام آتا ہے۔ ہمارے بال چھوٹے ہیں اس لیے ہمیں کوئی بالوں سے پکڑ کر زیر نہیں کر سکتا۔ اور تنگ پتلونیں بھی ہم اسی وجہ سے پہنتے ہیں۔ ہماری جیکٹوں اور قمیصوں کے کالر نہیں ہوتے تاکہ ہمیں کوئی کالر سے نہ پکڑ سکے اور جہاں تک بھاری سیاہ جُوتوں کا تعلق ہے تو ہم ان کی مدد سے دُوسروں کی خوب مرمّت کر سکتے ہیں۔" اس بینڈ کے پانچوں ارکان معاشرے سے کٹے ہُوئے افراد نہیں بلکہ وہ فرانسیسی بحری اڈّے بریسٹ کی سیکورٹی برانچ میں کام کرتے ہیں۔ دو مکینک ہیں اور دو مزدور جبکہ پانچواں بطور چوکیدار کام کرتا ہے۔

فرانس کے 'سکنز' پیرس اور دُوسرے شہروں کی گلیوں میں مراکش اور دیگر عرب اور افریقی ممالک سے آئے ہُوئے افراد خصوصاً نوجوانوں کی گھات میں لگے رہتے ہیں، اُن کا پیچھا کرتے اور انہیں پکڑ کر بُری طرح پیٹتے ہیں۔ یہ گروہوں کی شکل میں غیر ملکی ریستورانوں پر حملہ کرتے ہیں اور وہاں کی ہر چیز توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ فرانسیسی 'سکنز' بھی ہٹلر کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہیں، اگرچہ وہ ہٹلر کی زبان نہیں سمجھتے مگر پھر بھی ویڈیو فلموں اور ٹیلیویژن پر اُس کی تقاریر، اُس کی آواز، اُس کے اندازِ گفتگو اور اُس کی حرکات و سکنات کے گرویدہ ہیں۔ یہ لوگ اکثر نازی دَور کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔

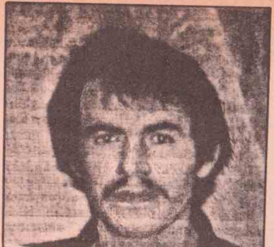

تُرک نوجوان رمضان عنصی جو سکنز کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

رالف لاخ جس کے بارے میں پولیس کو شُبہ ہے کہ یہ رمضان کے سر پر اُچھلتا کودتا رہا۔

ایک فرانسیسی فاشسٹ گروپ کا ساٹھ سالہ بُوڑھا فریڈرک بھی ہٹلر کے شیدائیوں میں سے ہے۔ اُس کا کہنا ہے: "جمہوریت یہودیوں کی ایجاد ہے۔ ہم تو لیڈر شپ کے قائل ہیں۔ یورپ کے آخری سرے تک بھی صرف گورے ہی موجود ہونے چاہییں جیسا کہ ہٹلر کی خواہش تھی۔" بُوڑھے کی ایسی باتیں نوجوان بڑے غور سے سُنتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: "ہم اپنے آپ کو کوئی سیاسی جماعت نہیں سمجھتے بلکہ ایک مخصوص نصب العین کے لیے چلنے والی مسلسل تحریک سمجھتے ہیں۔ ہمارے ارکان اس وقت پولیس

کی اعلیٰ صفوں میں بھی موجود ہیں۔"

اس تنظیم کے ایک رُکن الکانار نے ایسے پمفلٹ بھی ڈیزائن کیے ہیں جنہیں یہ تنظیم پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ ان پمفلٹوں میں بڑی بڑی ناکوں والے یہودی دکھائے گئے ہیں جو ایک شہر پر قابض ہیں یا پھر موٹے موٹے ہونٹوں والے حبشی جو ایک گورے مرد کو چبا چبا کر کھا رہے ہیں۔ یہ تصویریں بنانے والا پولیس ملازمین کی ایک تنظیم کے رسالے کے لیے کام کرتا ہے۔

فرانسیسی سکن اولیور پیرس یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ تعلیم کے بعد اُس کا ارادہ بھی پولیس میں بھرتی ہونے کا ہے۔ ایسے فاشسٹ اور انتہا پسند عناصر بڑی منصوبہ بندی سے پولیس کی ملازمت اختیار کر رہے ہیں۔ وہ پولیس میں جا کر کیا کیا گل کھلائیں گے، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ان لوگوں کی قوت آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ یورپی ممالک فلسطینی دہشت گردوں سے تو بہت نالاں ہیں مگر اُن کی ناک کے نیچے جو دہشت پل رہی ہے اور جو ٹائم بم رکھا ہوا ہے، اُنہیں شاید اس کی خطرناک شدت کا احساس ہی نہیں۔

سوئٹزرلینڈ کا ۲۲ سالہ سکن ہیڈ ایرک ویبر جو ایک جرمن اخبار کے لیے بطور رپورٹر کام کرتا رہا ہے، ۱۹۸۷ء سے نیشنل ایکشن نامی جماعت کی طرف سے منتخب ہو کر صوبہ بازل کی پارلیمنٹ کا رُکن بن چکا ہے لیکن اُسے یہ پارٹی پسند نہیں آئی کیونکہ وہ اُس کے خیال میں کچھ زیادہ ہی پُرامن ہے، چنانچہ اُس نے وی اے کے نام سے ایک نئی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ 'ہماری سرزمین پر بہت زیادہ سیاسی پناہ گزینوں اور غیر ملکیوں کے خلاف عوامی ایکشن' اس تنظیم کا پُورا نام ہے۔ اس کے مددگار دستے سوئٹزرلینڈ کے سکنز ہیں جو نیشنل فرنٹ کی صورت میں کام کر رہے ہیں۔ اُن کے ہمراہ ویبر ایک دن بازل پارلیمنٹ میں پہنچ گیا "ہمیں ترک سُور نہیں چاہییں" کے نعرے لگاتے ہوئے اُنہوں نے پارلیمنٹ کی وزیٹر گیلری سے پمفلٹ نیچے پھینکے جن پر لکھا تھا: "سوئٹزرلینڈ صرف سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کے لیے ہے۔"

ویبر کا کہنا ہے: "افسوس کہ ان پمفلٹوں میں کُھل کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اصل میں کیا چاہتے ہیں۔" اُس کے سکن ہیڈ ساتھی پُوری تندہی سے اپنی جارحانہ مشقیں جاری رکھتے ہیں۔ اُن کے عزائم اتنے خطرناک ہیں کہ بعید نہیں کل کو وہ سیاسی پناہ گزینوں کے کسی ہوسٹل کو آگ لگا دیں یا بقول سکن ہیڈز: "ہم ایک نیشنل سوشلسٹ تحریک ہیں، ہمارے سیاست دان غیر ملکی سُوروں کا مسئلہ حل نہیں کرتے، اس لیے ہمیں خود میدان میں آنا پڑا۔"

یورپ کے سکنز اکثر ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے اور مختلف چیزوں مثلاً پمفلٹوں اور اسٹکرز وغیرہ کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ جب کبھی مل بیٹھتے ہیں تو شراب پی کر خوب غل غپاڑہ مچاتے ہیں اور جس جگہ اُن کی رہائش ہوتی ہے وہ علاقہ ہمسایوں کے لیے دوزخ بن جاتا ہے۔ ان نوجوانوں کی اکثریت مجرمانہ ذہنیت اور سیاہ ماضی رکھنے والوں کی ہے یعنی ان میں سے اکثر کسی نہ کسی لڑائی جھگڑے کے الزام میں جیل جا چکے ہیں۔

یونان کا ۲۲ سالہ یورگوز جیورل، ایتھنز کے سکنز کا سرغنہ ہے۔ اپنے دائیں ہاتھ پر اُس نے لفظ HATE (نفرت) گُدوایا ہوا ہے۔ اُس کے دائیں بازو کے نیچے ہٹلر کی نازی پارٹی کا نشان اور ایس ایس کے الفاظ گُدے ہوئے ہیں۔

وہ بھاری تن و توش کا نوجوان ہے اور ہر روز کم از کم دو گھنٹے وزن اُٹھانے کی مشق کرتا ہے۔ شہر کے مشرقی پہاڑوں میں کُشتی، دست بدست لڑائی، گلا گھونٹ دینے اور راڈ یا چاقو استعمال کرنے کی مشق کی جاتی ہے۔ پچاس نوجوان سکنز اُس کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ مار دھاڑ کے اس دستے کا ہر مشن بالکل فوجی انداز میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ مثلاً شہر میں ایک جگہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کے تین ریستوران تھے۔ پہلے دو ریستورانوں پر اُنہوں نے ایسے ہی دکھاوے کے لیے حملہ کیا تاکہ پولیس کی توجہ ان دو ریستورانوں پر مرکوز رہے اور اس طرح تیسرے ریستوران پر حملہ کرنا بہت آسان ہو۔

پھر بیس بال کے چھکے اور لوہے کے سریے لے کر اُنہوں نے اُس تیسرے ریستوران پر بھرپور حملہ کر دیا۔ اُنہوں نے بہت سے افراد کو شدید زخمی کر دیا اور فرنیچر توڑ پھوڑ ڈالا۔ یورگوز کا اُصول ہے کہ حملہ کرو اور غائب ہو جاؤ۔" اُنہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے

دفتر پر شراب کی بوتلیں پھینکیں۔ اکروپولس کے تاریخی کھنڈروں میں اُنہوں نے ایک سیاہ فام کی پٹائی کردی۔ ایک پنک نوجوان کو اتنا مارا کہ بعد میں اُسے اسپتال لے جانا پڑا۔ اتنے سارے واقعات کے باوجود پولیس ابھی تک ایک 'سکن' کو بھی نہیں پکڑ سکی۔ یورگوز برطانوی نیشنل فرنٹ کا ممبر ہے۔ سال میں وہ کئی بار بذریعہ ہوائی جہاز لندن آتا جاتا ہے۔ یا پھر 'نیشنل فرنٹ' کے وفود کو دعوت دے کر اپنے ہاں بُلاتا ہے لیکن ایسے مواقع پر اُسے ان لوگوں کی حفاظت کا بھی سخت انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بائیں بازو کے مظاہرین سے اُنہیں بہت خطرہ ہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک کے 'سکن ہیڈز' کا بھی برطانوی نیشنل فرنٹ کے ارکان سے بہت قریبی اور مسلسل رابطہ رہتا ہے۔

یونانی 'سکنز' کے یونان کی فاشسٹ پارٹی 'اینک' سے روابط بہت بڑھ چکے ہیں —— اس پارٹی نے تمام 'سکنز' سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنہیں ملازمتیں دلوائے گی۔ دوسروں کی طرح یونانی 'سکنز' بھی پہلے سے کوئی ایک مقام طے کر لیتے ہیں جہاں وہ رات کو ملتے ہیں اور پھر اکٹھے اپنے ہدف تک پہنچتے اور شکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحے سے لیس ہوتے ہیں اور ان کے پاس خاص قسم کے چاقو، ڈنڈے اور لوہے کی سلاخیں بھی ہوتی ہیں۔ مار دھاڑ کا مُوڈ بنانے کے لیے وہ جرمن نازی پارٹی کے جھنڈے لہراتے ہیں اور موسیقی بجاتے ہیں۔ مثلاً 'چار سکنز بینڈ' کا نغمہ 'ایول' بجتا ہے جس میں گلیوں میں ہونے والی لڑائی اور ٹانگیں اور بازو توڑنے کے 'خوبصورت احساس' کا تذکرہ ہے اور اس بات کا ذکر ہے کہ چہروں پر ضربیں لگانا کتنی مزیدار چیز ہے۔

ہمبرگ کے رمضان عنصی کے مقدمۂ قتل کی کارروائی کے دوران میں ایک 'سکن' نے بیان دیا: "میں غیر ملکیوں کے خلاف نہیں ہُوں۔" دوسرے 'سکن' نے بھی کچھ ایسا ہی بیان دیا: "... میں ویسے ... اُصولاً غیر ملکیوں کے خلاف نہیں ہُوں۔ وہ تو ہمیں ان تُرکوں نے مشتعل کیا تھا اور شراب کے نشے میں ہم اس سلسلے میں ملوّث ہو گئے۔" مگر اس کا کیا کیجیے کہ رمضان کی طرح پچھلے سال ... شٹ کا تُرک نوجوان محمّد کا ئیما کسی بھی ان 'سکنز' کے تشدد کا شکار ہو گیا۔ پہلے تو 'سکنز' نے اُسے بُری طرح مارا اور پھر ایک فولادی چادر سے اُس کا سر کُچل ڈالا۔ بعد میں ایک مجرم نے تفتیش کے دوران بتایا: "ہم ہر صُورت میں اُس تُرک کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔"

رمضان عنصی کے قتل کے بعد ہمبرگ میں ماحول پر اس قدر خوف طاری ہے کہ شام کے بعد کوئی تُرک گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا حتیٰ کہ دن کے وقت بھی خطرہ ہی رہتا ہے۔ تُرک قونصل جنرل ایزن نے بتایا کہ ہمارے ہموطن خود کو غیر محفوظ تصوّر کرنے لگے ہیں۔ روزانہ بسوں میں، ریل گاڑی میں اور ... ہر جگہ اُنہیں خطرہ رہتا ہے کہ اُن کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے۔

اِدھر اب تُرک نوجوان بھی دفاعی گروہوں کی صُورت میں منظم ہو رہے ہیں۔ ہمبرگ کی دیواروں پر سیاہ روشنائی سے ایسے نعرے لکھے نظر آتے ہیں۔ "او سکنز! ہم تمہارا شکار کریں گے ... ہم رمضان کا بدلہ لیں گے۔" ہمبرگ کے سترہ سالہ تُرک طالب علم کا کہنا ہے کہ ہم نے بھی چاقو اور گیس پستول خرید لیے ہیں۔ شام کے وقت دس پندرہ تُرک نوجوانوں کا گروہ شہر میں نکل جاتا ہے اور جہاں بھی کوئی 'سکن' دکھائی دے اُسے بُری طرح پیٹتے ہیں۔

کم از کم ایک 'سکن' اس صورتِ حال سے گھبرا گیا ہے۔ موسیقی کے بینڈ 'ناراض بچے' کا گلوکار کیون دوبارہ بال بڑھنے دے رہا ہے۔ اُسے شکایت ہے کہ 'سکن' کے طور پر اب اُسے اپنی زندگی غیر محفوظ نظر آنے لگی ہے۔

حیرت یہ ہے کہ روزانہ اخبارات کے ذریعے سکنز کی کارروائیوں سے باخبر ہونے کے باوجود جرمن عوام کی اکثریت اُنہیں بے ضرر خیال کرتی ہے بلکہ کچھ لوگ تو اُنہیں معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ گردانتے ہیں۔ ❀

بے کار ہے وہ لمبی زندگی جو اعمالِ حسنہ کی پُونجی سے محروم ہے۔ (حضرتِ عثمان رضؓ)

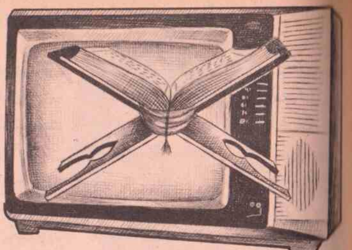

قرآن کی فریاد

توقیر عائشہ

دلِ حسّاس کے سچے تأثرات۔

روشنیاں جیسے ہال کی چھت سے ٹپک رہی ہیں۔ بلبوں کا ایک ایک شیڈ اپنی قیمت آپ بتا رہا ہے۔ وسط میں جابجا قیمتی فانوس جھلملا رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی تقریب میرے اعزاز میں دی جا رہی ہے۔ دُنیائے اسلام کے تمام نمائندے یہاں موجود ہیں۔ یہ سب میری خاطر دُور دراز کا سفر کر کے آئے ہیں مگر میرا دل بے چین ہے۔ یہ سب میرے زخمی دل میں نشتر چبھو رہے ہیں۔ اسٹیج پر صدرِ مجلس ہیں، مُسلم دُنیا کے بڑے معزز افراد پر مشتمل ججوں کا پینل ہے۔ اُمرا، سُفرا جوق در جوق چلے آ رہے ہیں اور نرم و گداز نشستوں پر بیٹھتے جاتے ہیں۔ اگلی صف میں وہ تمام خواتین و حضرات ہیں جن کے ہاتھوں میں میرا ایک ایک خوبصورت طباعت والا نسخہ ہے۔ اُن کے مابین یہ مقابلہ ہوگا کہ کون میری عبارت خوش الحانی سے پڑھتا ہے۔

تقریب کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدا سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع سے ہو رہی ہے اور میں حیران و ششدر ہوں کہ اتنی کثیر تعداد میں میرے عقیدت مند بیٹھے ہیں مگر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکتا جبکہ صاحبِ وحیؐ رات کی آخری گھڑیوں میں بہتے اشکوں کے ساتھ اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

اناؤنسر بڑے ہی احترام کے ساتھ میری شان میں الفاظ سجا سجا کر ادا کرتا ہے اور کسی ملک کا نام لے کر قاری صاحب کو دعوت دیتا ہے۔ وقفے وقفے سے سُورۂ نُور، سُورۂ حجرات، سُورۂ رحمٰن اور سُورۂ یٰسین کی منتخب آیات لحن بن کر مائیک پر اُبھرتی ہیں۔ یہ وہی آیات ہیں جنہیں سردارِ انبیاؐ اپنے ساتھیوں سے فرمائش کر کے سُنا کرتے تھے۔ اہلِ مکہ انہیں سُننے کے لیے گلیوں اور دروازوں کے پیچھے چھُپ کر کھڑے ہوتے۔ ایسے میں کوئی صحابی اپنے گھر میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اُنہیں پتہ بھی نہ ہوتا کہ اُن کے لبوں سے نکلنے والی آسمانی وحی کی لہریں کس کس دل کو بے چین کر رہی ہیں، کس کس دل میں ایمان کی شمع جلا رہی ہیں۔ میرے اصل قاری تو وُہی تھے جن کی قرات سے اسلام پھیلتا تھا۔ اُنہوں نے کبھی مجھے مقابلے کے لیے استعمال نہیں کیا — مگر یہ مجھ پر کیسا ظلم ہے جو اُن کی جانب سے ہے جن کے ہاتھوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ میری آیات کو مُلک کا دستور بنا دیں۔ افسوس...

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یُوں بھی مجھے رُسوا کرتے ہیں ایسے بھی ستایا جاتا ہُوں

لو دیکھو! مردوں کا مقابلہ ختم ہُوا اور اب عورتیں اس میدان میں اُتر آئیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ خواتین کے لیے یہ مقابلہ کہیں اور ہے؟ نہیں۔ یہاں تو ہال کے اندر جابجا پھسلتی، سرسراتی، بمشکل سر پر

بھکنے والی اوڑھنیوں میں خواتین نظر آرہی ہیں۔ دیکھتے جاؤ۔ عین مائیک کے سامنے ایک خاتون جلوہ افروز ہوئیں اور قرات شروع ہوگئی۔

اس اُمت کی ماؤں اور میرے حبیبؐ کی ازواج نے بھی کبھی یہ کام نہ کیا تھا کہ منبر پر کھڑے ہو کر قرات شروع کردی ہو۔ لیکن اب یہ کام نہایت اہتمام اور کثیر سرمائے کے خرچ سے برسرِعام ہو رہا ہے۔

اتنے بڑے ہجوم میں کوئی نہیں جس کی پیشانی حجاب کے حکم کی پامالی پر عرق ریز ہو جائے۔ یُوں لگتا ہے کہ یہ سب قرآن کی حدود توڑنے کے لیے جمع ہُوئے ہیں۔ مَیں اس ہال میں قید ہو گیا ہُوں۔ یہ وقت مجھ پر بہت بھاری ہے... مَیں ان کے درمیان پھنس گیا ہُوں۔ اے خُدا! تُو گواہ رہنا۔

اس بھری محفل سے کہیں بڑھ کر مجھے اُس تنہا صحرا میں مزہ آتا ہے جہاں ایک بدو اپنی اُونٹنی پر سوار تلاوت کرتا جاتا ہے۔ مجھے سکون ملتا ہے جب ایک نومسلم امریکی اپنے انگلش زدہ لہجے میں میری آیات پڑھتا ہے۔ جب آگ اور دُھواں اُگلتی فضا میں ایک افغان مجاہد اپنی پناہ گاہ کے اندر میرے اوراق پلٹتا ہے تو یُوں لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے حریر و ریشم کے جُزدان سے آزاد کر دیا ہو۔ جب ایک جماعت قیام میں میری تلاوت کرتی ہے اور اُس کے پیچھے اسلحہ بردار جماعت منتظر رہتی ہے۔ جب ایک عورت کے مصروف ہاتھ گھر کا کام نمٹاتے ہیں اور لبوں سے میری دلکش عبارت ادا ہوتی ہے تاکہ اُس کا چھوٹا بچہ بھی مجھ سے آشنا ہو جائے، جب ظالم حکمران کے آگے کلمۂ حق ادا کرنے والے کا مقدر کال کوٹھڑی بنتی ہے تو اُس کی سرد دیواریں میری آیات جذب کرتی چلی جاتی ہیں۔ مَیں اُس وقت ان دلوں میں جگہ بنا لیتا ہُوں۔ یہی میرے ٹھکانے ہیں۔ مَیں انھی میں بستا ہُوں۔ مَیں ضرور رب العالمین سے اُن کی سفارش کروں گا اُس دن جب سب اُس کے آگے شکستہ و عاجز کھڑے ہوں گے۔ ●●

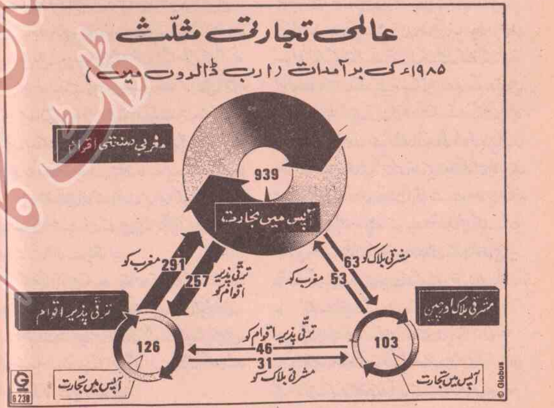

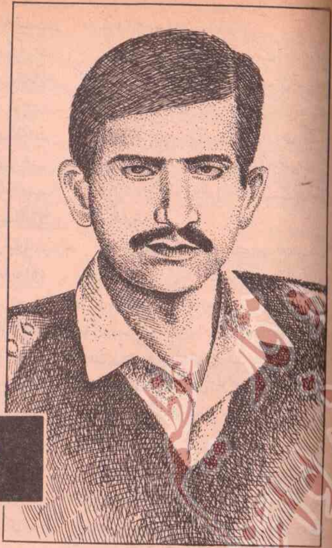

تکمیلِ وفا

وطنِ عزیز پر اپنی جان نثار کر دینے والے نوجوان کی رُوح پرور باتیں۔

بیگم ممتاز شفیع

تڑپتے زخمی دل پر صبر کی یخ سل رکھتے ہُوئے اُس نے بصد مشکل کہا: "ماں جی! میرا وطن مجھے پکار رہا ہے۔ ثابت قدمی کی دُعا کے ساتھ مجھے رُخصت کیجیے۔"

بہتے آنسو ماں کا جواب تھے۔ دُکھی مامتا کا سامنا میدانِ جنگ میں جانے سے بھی زیادہ مشکل نظر آرہا تھا مگر جلد ہی فرض کا احساس جذبات پر غالب آگیا۔ اُس نے بھرائی ہُوئی آواز پر قابو پایا اور سب سے رُخصت ہو کر دُور چلا گیا۔۔۔ بہت دُور اپنے عزیز وطن کو بچانے، مشرقی پاکستان کو دُشمن سے نجات دلانے، پاکستان کی سالمیت برقرار رکھنے اور... نذرانۂ جسم و جاں دینے کے لیے۔

جہاز پر چانس سیٹ مل گئی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اپنی پلٹن میں جا رہا تھا ـــــ ۲۴ ایف ایف میں ـــــ رشید ہوائی اڈے پر اُسے لینے آیا ہُوا تھا۔ بچھڑے دوست گلے ملے، پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خوشگوار دنوں کی باتیں کرتے کرتے وہ انجانے طور پر اُداس ہو گئے۔ شاید سنہرے دیش کی میٹھی ہواؤں نے اُنھیں دُکھی کر دیا تھا۔

کیپٹن مختار کی آنکھوں سے رُکے آنسو بہہ نکلے اور وہ

سوچنے لگا: "مَیں اس مقدس سرزمین میں آیا بھی تو کب؟ــــ جب میرا وطن، میرے قائد کی بے لوث اور بے مثال قیادت میں ایک ہونے کا ثمر، ہمارے بزرگوں کے خوابوں کی تعبیر اور ہماری پناہ گاہ دُشمن کی لگائی آگ میں جل رہا ہے۔ بھائی بھائیوں سے بدظن ہیں۔ گلے شکوے جھوٹ اور الزام تراشیوں کا بھیس بدل کر، دبی دبی مخالفتوں، غلط فہمیوں اور نظریات کے اختلاف کی گھاٹیوں سے گزر کر شدید نفرت میں بدل چکے ہیں۔ دلوں نے ایک ساتھ دھڑکنے کے بجائے الگ ہو کر دُشمنی کو جنم دیا ہے۔

"اور اب مَیں اپنے وطن کے اس حسین ترین حصّے کی شاہراہوں کا تحفظ کرنے آگیا ہوں ــــ اپنے قائد کے اُس ایمان افروز فرمان کے مطابق جس نے مجھے جذبے دیے اور حوصلہ عطا کیا ــــ کہ ہم لڑیں گے میدانوں میں... پہاڑوں پر... جب تک ہمیں اُٹھا کر بحیرہ عرب میں پھینک دے ــ قائدِ اعظم کے فرمان کا عزم ہمارا امتحان بن چکا ہے.. کیا ہم اس امتحان میں پُورے اُتریں گے؟ کتنا مان ہے ہمیں قائد کی ہر بات پر! کتنا سکون اور رہنمائی ملتی ہے اُن کے فرمودات میں۔ مَیں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہُوں مَیں اپنے وطن کی خاطر..."

"ارے یار! کن خیالوں میں کھو گئے؟ کون یاد آگیا۔ کوئی مزے کی بات سُناؤ۔"

مگر مختار خاموش تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ابھی تک بہہ رہے تھے۔

رشید چپ ہو گیا کہ بولنا آسان نہ تھا۔

"مختار بے جگری سے لڑ کر مُلک کے بیشتر حصّوں سے دُشمن کو نکال چکا ہے... ایسا جری اور دلیر افسر کیا کبھی کسی نے دیکھا ہے؟"

ایسی خبریں ہمیں ملتی رہتی تھیں۔ ۴۴ ایف ایف کا نام بلند ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا مختار ایسا بے دھڑک نوجوان آتشِ نمرود میں کُود سکتا ہے۔ یہ اُس کی سرشت میں تھا۔ کالج میں آئے دن حق و باطل کی جنگ میں اُس کی شمولیت، پرنسپل صاحب کی شکایتیں اور اُن کے ابا کی ندامتیں سب کو معلوم تھیں اور پھر اُس نے کالج چھوڑ دیا اور کیڈٹ بن گیا۔

مجھے اکثر اُس کی لڑائیوں کے قصّے یاد آتے رہتے اور خود کو حق بجانب قرار دینے کے دعوے بھی۔ ایک اعلیٰ افسر کے بیٹے نے کسی غریب لڑکے کی پٹائی کر دی۔ ایک دن وہ اپنے بھائی کے ساتھ نیون سٹریم کے پاس سے گزر رہا تھا۔ مختار کو پتہ چل گیا۔ گھات لگا کر بیٹھ رہا اور اُن دونوں کو پیٹا۔ یہ طفلانہ شرارت تھی نہ بُغض کی نمائش بلکہ بارہ سالہ لڑکے کے جذبۂ انصاف کا باشعور اظہار تھا۔

اور وہ دن بھی مجھے ابھی تک یاد ہے جب وہ ہمارے ہاں سپاہی کی وردی پہن کر آیا۔ مَیں نے کہا: "مختار بیٹے! کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی افسر بنو، ایف اے پاس کرو۔ تمہاری امی تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔" وہ خاموش رہا لیکن اُس کی آنکھوں میں عزم دمک اُٹھا تھا جیسے گم شدہ منزل نظر آ رہی ہو۔

چند ماہ بعد اُس نے آرمی سپیشل کلاس پاس کر لی اور افسر بن گیا مگر ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی افسر کی وردی پہنی۔

اور پھر وہ ایک دن صاف ستھری کلف لگی وردی پہنے ہمارے ہاں آیا اور کہنے لگا: "لو آنٹی! مَیں افسر بن گیا ہُوں۔ آپ کو یاد ہے نا جب مَیں کچّی کچّی چیری توڑ کر بچّوں کی طرف پھینک رہا تھا تو آپ باہر سے آگئیں۔ آپ نے ڈانٹا تھا بلکہ وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے وہ وعدہ؟"

"ہاں بیٹے! وہ وعدہ یاد ہے۔ لو! اب پکّی پکّی چیری کھاؤ اور اپنے دوستوں کے لیے بھی لے جاؤ۔"

وہ چیری کھاتا اور بچّوں کی سی معصوم باتیں کرتا رہا۔ میری نگاہیں سراپا دُعا بن کر اُس کا جائزہ لیتی رہیں۔ وہ بے حد معصوم، وجیہہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ میری آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"آج کیپٹن مختار میجر بنا دیے گئے۔" پانچ سال کی سروس کے بعد یہ ایک اعتراف تھا۔ اُس کی قومی خدمات کا۔ دوست میدانِ جنگ کی آزمائشیں اور صعوبتیں بھلا کر اُس کی عزت افزائی کا جشن منا رہے ہیں۔ اُن کی پلٹن کا چمکتا ستارہ، ہر میدان کا فاتح۔ کتنا ہر دلعزیز تھا وہ! اپنے یاروں کا یار، اپنے جوانوں کی جان، ہر کسی کا دوست اور ہر کسی کا غم خوار۔

"ابا جان! اس طرف سے مت گزریے۔ مَیں یہاں سے نہیں گزر سکتا۔ غریب کشمیری مہاجرین کو سڑک پر بے آسرا، آسمان کی چھت کے نیچے کس مپرسی کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔" اور کیپٹن غلام محمد نے اپنا رستہ بدل لیا۔ چھوٹے سے لڑکے نے باپ کی چھاتی میں دُکھ بھر دیا۔

سروس کے دوران میں بھی غریبوں اور بے کسوں کا غم اُسے احساس دلاتا رہا۔ اخبار میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال ٹی بی سنٹر پشاور کے ایک مریض غازی دین وارڈ اے بیڈ سات کا خط پڑھا۔ فوراً رقم بھیجی۔ آخری دم تک اُسے بیس روپے بھیجتا رہا۔ غریب کو خوشی اور اطمینان دیتا رہا اور اُس کی اجرِ عظیم کی دُعاؤں سے اپنی زندگی سنوارتا رہا۔

باغیوں سے غصب شدہ علاقے واپس لینے پلٹن اور وہ کاکس بازار پہنچ گئے۔ سات مئی ۱۹۷۱ء کو اُس نے اپنے والد صاحب کو لکھا: "اس وقت مَیں ٹیکناف میں دریائے ناف کے کنارے بیٹھا سوچ رہا ہُوں۔ آپ اس دریا کے دوسرے کنارے برما کی حفاظت میں لڑے تھے اور آج آپ کا بیٹا دریا کے اس کنارے وطن کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہے۔ ہم کاکس بازار کے ساحل پر اُترتے ہی وہاں قابض ہو گئے۔ دُشمن ہماری ہیبت سے پہلے ہی بھاگ نکلا تھا۔ دُشمن یہ علاقہ چھوڑ چکا ہے۔ باغی لوگ اور بھارتیوں نے یہ کھیل ہار دیا ہے۔ اللہ کے فضل سے سارا کا سارا سیکٹر دُشمن سے صاف ہو گیا ہے۔ بہت مشکل سے وقت نکال کر بڑی دیر کے بعد آج دریا میں نہایا ہُوں۔ یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ پچھلے ڈیڑھ ماہ کی تکلیفیں بھول گیا ہُوں۔ ہمارا خیال ہے اب ہمیں کسی اور جگہ بھیجیں گے۔ آج کاکس بازار واپس جا رہا ہُوں۔"

تقریباً ایک سال پہلے اُس کا عزیز دوست کیپٹن اقبال صدّیقی فوت ہو گیا تھا۔ مختار نے سات جولائی ۱۹۷۰ء کو کھاریاں سے صوبیدار میجر کو لکھا: "کاش! آپ کیپٹن صدّیقی کو روک لیتے۔ کیا واقعی صدّیقی فوت ہو گیا ہے؟ کاش! مَیں اُن کے گھر نہ جاتا۔ اُن کے والدین کا حال دیکھا نہیں جاتا۔"

اُس کی والدہ نے مختار کے خط کے جواب میں لکھا: "اپنے جوانمرگ بیٹے کی وفات پر ماں کے لیے صبر کرنا آسان نہیں۔ رات تین بجے اُٹھتی ہُوں۔ اپنا دُکھ خدا کو سناتی ہُوں۔ اُسی سے درد کی دوا مانگتی ہُوں۔ دو سال پہلے جب تم سے ملی تھی تو کرنل صاحب اور تم سب دوستوں نے اقبال کی تعریف کی۔ مجھے اطمینان ہُوا اور اب...."

سُنہری سرزمین سے اُس نے لکھا: "کیا واقعی ماں اولاد کے غم میں اتنی بے تاب ہو جاتی ہے؟ نہ جانے ماں جی کیا کیا سوچتی رہتی ہوں گی میرے بارے میں۔ کس حال میں ہوں گی؟ دُعا مانگنے کے باوجود کتنی غم زدہ رہتی ہوں گی! اگر مَیں مر گیا تو کیا گزرے گی میری ماں کے دل پر! اور اگر مَیں شہید ہو گیا تو کیا وہ مجھ پر فخر نہ کریں گی؟ وہ جانتی ہیں مَیں بہاریوں اور غریب بنگالیوں کی خاطر لڑ رہا ہُوں جن سے جینے کا حق چھینا جا چکا ہے۔ ماں! مَیں نے تیرا مقدس دُودھ پیا ہے۔ مجھے اُس دُودھ کی قسم! مَیں اپنے مُلک، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی خاطر جہاد کرتا رہوں گا۔ باطل کو سچ پر غالب نہیں آنے دوں گا۔ ماں! آپ میرے جذبوں کو خوب جانتی ہیں۔" اُسے ماں جی نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی غمزدہ مُسکراہٹ اُسے تڑپا رہی تھی۔ نہ جانے اس میں کیا راز تھا۔

مکتی باہنی کے بڑے بڑے گڑھ اُس کی گرفت سے نکل چکے تھے۔ میجر مختار اور ۴۴ ایف ایف فرائض کی ادائیگی میں کسی سے کم نہ تھے۔

رات گزرتی جا رہی تھی مگر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بہت بے قرار تھا۔ کاغذ قلم لیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا ــــ بیس مئی ۱۹۷۱ء۔ چھوٹے بھائی کو لکھا: "مَیں تمہیں اس مختصر خط میں کچھ نہیں لکھوں گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ کسی ظالم قوم

نے اتنا ظلم نہیں کیا جتنا بنگالی شر پسندوں نے کیا ہے۔ لڑائی تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن معمولی جھڑپیں کہیں کہیں ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں سے سُننے میں آرہا ہے کہ اتنی بڑی خانہ جنگی کسی ملک میں نہیں ہُوئی ـــ لیکن خدا نے ملک بچا لیا ہے۔ مَیں ایک ڈائری لکھ رہا ہُوں جو بعد میں اجازت ملی تو چھپواؤں گا۔ اس سے سب معلوم ہو جائے گا۔ ابّا جی نے ۲۶ ایف ایف کے ایک باربر کی خیریت پُوچھی تھی۔ وہ جیسور میں ہے۔ جونہی پتہ چلا، اطلاع دُوں گا۔"

اور پھر بے قراری بڑھتی گئی۔ خط ہی سہارا بنتے گئے۔ چٹاگانگ سے ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء کو اپنے والد صاحب کے نام لکھا: "یہاں کے حالات جو رُخ اختیار کر گئے ہیں اگر ان کی وجہ سے میرا خط نہ ملے تو افسردہ نہ ہونا۔ مَیں کسی اور جگہ جا رہا ہُوں جس کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ ہر کسی سے کہیں بالکل فکر نہ کریں، خاص طور پر ماں جی سے۔ اگر مجھے مرنا ہے تو کوئی بچا نہیں سکتا۔"

دل ہی دل میں سوچا یہ موت نہیں، شہادت ہو گی ـــ ابدی زندگی جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

اُسی شب سب سے چھوٹے بھائی کو لکھا: "مجھے افسوس ہے والدہ صاحبہ میرے متعلّق بہت فکر مند ہیں ـــ اُنہیں بتاؤ فکر نہ کریں... اگر میرا خط نہ آئے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

بے قراری تھی کہ حد سے بڑھتی جا رہی تھی۔ پیغامات تھے کہ دل میں تڑپ رہے تھے۔ ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء ہی کو اپنے بڑے بھائی (اب میجر جنرل) ذوالفقار کو لکھا: "اگر میرا خط نہ آئے تو پریشان نہ ہوں۔ مَیں آپ کو مشرقی پاکستان کی تازہ ترین صُورتِ حال کے متعلّق نہیں بتا سکتا... مَیں کسی اور جگہ جا رہا ہُوں۔ مگر ابھی تک وہ جگہ معلوم نہیں ہو سکی۔"

اور پھر وہ اُس مقام پر پہنچ گیا۔ جذبۂ صادق اُسے اُس نامعلوم جگہ لے گیا۔ یہاں اُس نے وطن کی آبرو بچانا تھی ـــ آزادی برقرار رکھنے کے لیے رُوح اور جسم کا رشتہ داؤ پر لگانا تھا ـــ آزادی جو مقدّس خُون کی قربانی مانگتی ہے ـــ سب سے بڑی سعادت ـــ زندگی کی اعلیٰ ترین راحت!

رات وہ جی بھر کر سویا۔ رات کی تاریکیاں کچھ زیادہ ہی حسین اور راحت آفریں ہو گئی تھیں۔ گھُپ اندھیروں میں اُمّید کے جُگنو جگمگا رہے تھے ـــ ٹمٹماتے ستاروں کے مانند۔ آج رات اُسے ماں جی کے صبر کی نوید ملنے والی تھی۔ حسرتیں اور تمنّائیں حقیقت بننے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔ ابھی تارے فلک پر نظر آرہے تھے۔ وہ اُٹھا۔ آسمان کی مدّھم روشنیوں نے کوئی پیغام دیا۔ فوراً نماز پڑھی۔ ثابت قدمی کی دُعائیں مانگیں۔ مشرق سے پَو پھٹنے کی روشنی میں اک انوکھا حُسن نظر آنے لگا۔ سورۂ فتح پڑھی اور پھر سوچوں میں کھو گیا۔ سوچیں جو اُسے ایک انجانا سکون دے رہی تھیں جیسے طوفان کے بعد ساکن سمندر ایک دل پذیر سکون کی کیفیت سر سے پا تک پھیلا دیتا ہے۔

صُبح کچھ زیادہ ہی اُجلی اُجلی سی تھی۔ وہ تازہ دم تھا۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ تن تیّار تھا ـــ برستی آگ اور جھلسا دینے والے شُعلوں کے درمیان سے گزر کر ایک سڑک پر مصروفِ پیکار ہونے کے لیے بالکل تیّار ـــ اُس عظیم مقصد کے لیے جس کی خاطر وہ پیدا ہُوا تھا۔

اور اُسی لمحے ۵۳ بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر سے میجر سالک نے اُس کے بڑے بھائی کو لکھا: "چند لمحے گزرے، میجر مختار نے شہادت پائی۔ مَیں نے مشرقی پاکستان میں اُسے کئی لڑائیاں لڑتے دیکھا ہے۔ کبھی ہم اکٹھے بیٹھے تو مَیں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کے بھائی نے پاکستان کے لیے کیا کیا کیا ہے۔"

کاکس بازار سے مولانا مسلم کبیر چودھری ایک بہاری دوست نے لکھا: "چند ماہ پہلے مجھے ایک دوست ملا ـــ ایسا دوست پہلے کبھی ملا تھا نہ ملے گا۔ مَیں اور میرے ضعیف والدین اُس کے مدح خواں رہے۔ ہم سب نے اُس کی شہادت پر ختمِ قرآن اور فاتحہ خوانی کی۔ اللہ اُسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے!"

کیپٹن غلام محمّد کو بیٹے کی شہادت کی خبریں ملنے لگیں اور حالات واضح ہوتے گئے۔ ۲۰ جون ۱۹۷۱ء کو ٹھاکر گاؤں سے کیپٹن زاہد اسلام نے لکھا: "فینی کا علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے۔ میجر مختار تین دن اس علاقے میں لڑتے رہے اور تقریباً تین پُلوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ بلونیا سے آگے گئے تھے۔ پہلے دن دُشمن نے اندھا دُھند فائر شروع کر دیا۔ اُس نے سو بیدار سے کہا نیچے ہو جائیں، گولی لگ جائے گی۔ اس کے بعد وہ اپنے ایف او او اور ایف او کے سگنلر کے ساتھ جائزہ لینے بیٹھے۔ ایک گولہ عین اُن سے چند فٹ پر پھٹا۔ سب زخمی ہو گئے۔ ایف او کا سگنلر وہیں شہید ہو گیا۔ میجر مختار کو خاصے زخم آئے جن میں پنڈلی اور پاؤں کا زخم خاصے گہرے تھے۔ وہ پُوری طرح ہوش میں تھے۔ کمپنی کے بارے میں بار بار پُوچھتے۔ پھر اپنی پنڈلی کے بارے میں پُوچھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ مرہم پٹی کر کے اُنہیں ہیلی کاپٹر میں ڈالا گیا۔ راستے میں اُنہوں نے اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔

"جس بہادری سے آپ کا بیٹا لڑا ہے، اُسے خدا جانتا ہے۔ اُس نے کبھی زندگی کی پروا نہیں کی۔ چٹاگانگ جاتے ہوئے جہاں اُن کے سی او کرنل شبّیر شہید ہُوئے تھے، اُس نے وہ بہادری دکھائی کہ اُس کے بریگیڈیئر (اقبال شفیع) بے حد تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ اُنہیں ستارۂ جرأت دینے کی بھی سفارش کر چکے ہیں ـــ بھائیوں جیسے تعلّقات تھے۔ مَیں یقین سے کہہ سکتا ہُوں ـــ وہ حکمِ الٰہی کے مطابق مرے نہیں بلکہ ہم اُنہیں دیکھ نہیں سکتے۔ مَیں اُن کی آخری آرام گاہ پر گیا تھا۔ مجھے یُوں لگتا تھا واقعی وہ زندہ ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ملک کے لیے جان دی ہے اور ایک روشن مثال قائم کی ہے۔"

۲۴ ایف ایف کے کرنل عاشق حسین نے چٹاگانگ سے تحریر کیا: "پاکستانی فوج نے ایک جری افسر کھو دیا ہے جس کی خدمات آنے والے وقتوں میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ وہ اس قومی بحران میں بے جگری سے لڑا۔"

اُس کے قلبی دوست رشید کا خط آیا: "میجر مختار ایک ایسا ہمدرد انسان تھا جس نے اپنی زندگی قوم کے نام وقف کر دی۔ ۳۰ مارچ کو فرض کی ادائیگی میں بے مثال بہادری دکھانے پر اُسے ستارۂ جرأت کے لیے نامزد کیا گیا ـــ باغیوں نے بھارتی فوج کے ساتھ مل کر پاکستان کا ایک حصّہ لے لیا تھا۔ میجر مختار کو پیش قدمی کا حکم ملا۔ پہلے دن میجر مختار نے پانچ میل کا علاقہ واگذار کرایا پھر تین طرفوں سے بھاری گولہ باری کی بنا پر پیش قدمی رُک گئی۔ ہم بھی دُشمن پر مارٹر فائر کر رہے تھے۔

"۸ جون ۱۹۷۱ء کو پیش قدمی پھر شروع ہو گئی اور نو بجے کمپنی کے ہراول دستے کا پہلا حصّہ دُشمن کی 'ڈیفنس پوزیشن' میں داخل ہو گیا۔ فوج تو سڑک ہی پر حرکت کر سکتی تھی کیونکہ دونوں طرف پانی تھا، مکمّل حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمپنی دُشمن کی زد میں تھی۔ شاید دُشمن کا مُشاہدہ کرنے والا' کمپنی ہیڈ کوارٹر کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مارٹر فائر کا حکم دیا اور تین جانب سے شدید گولہ باری شروع ہو گئی۔ مختار کو سات یا آٹھ زخم آئے اُس کا سینیئر جے سی او، جو اُس کی بہادری کا مدّاح تھا، اُس کی طرف بڑھا مگر وہ دوسرے شیل سے زخمی ہو گیا... ہیلی کاپٹر منگوایا گیا۔ ۲۵ : ۱۳ پر ہیلی کاپٹر فینی سے اُڑا۔ راستے میں اُس نے شہادت پائی۔

ہیلی کاپٹر میں اُس نے مجھ سے بات کی ـــ "رشید مَیں مر رہا ہُوں"۔ اُس نے کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ بھارتی فوج اس لڑائی میں پُوری طرح ملوّث ہے اور جھُوٹ اور دغابازی سے کام لے رہی ہے مَیں نے بھارتیوں جیسی بُزدل فوج کہیں نہیں دیکھی۔"

مشرقی پاکستان میں اُس وقت کی صُورتِ حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں جو ایکشن فوج نے شروع کیا تھا، وہ جون ۱۹۷۱ء تک قریب قریب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا مگر بعض اہم مقامات پر دُشمن ابھی تک پوزیشن لیے ہُوئے

تھا۔ اس میں سب سے اہم وہ جگہ تھی جہاں اُس نے بلونیا کے علاقے سے چٹاگانگ کو ملا سڑک ٹریفک کے لیے بند کی ہوئی تھی۔

کیپٹن رشید اور دیگر افسروں کے خطوط سے میجر مختار کا نمایاں کارنامہ کچھ یُوں سامنے آتا ہے:

۲۴ ایف ایف کو یہ علاقہ دُشمن سے صاف کرنے کا حکم ملا۔ پلٹن کی سی کمپنی جس کے کمانڈر میجر مختار تھے، اُسے ہراول دستے کی حیثیت سے ایڈوانس شروع کرنے کا حکم ملا۔ پہلے دن کئی میل تک دُشمن کی جو پوزیشنیں راستے میں آئیں، اُن کا صفایا کیا گیا۔ اگلے روز یعنی ۸ رجون کی صبح ایڈوانس پھر شروع ہُوا۔ اب دُشمن کی بڑی پوزیشنوں کا سامنا تھا۔ وہاں تیز رفتاری سے اُنھیں بھگا دیا گیا۔ پھر ہراول دستے کا ہر حصّہ دُشمن کی ڈیفنس لائنوں میں داخل ہو گیا۔ اندھا دُھند فائرنگ ہونے لگی۔ اِدھر سے بھی جوابی کارروائی ہوتی رہی مگر پھر ایڈوانس رُک گیا کیونکہ دُشمن پوشیدہ پوزیشنوں سے چھوٹے ہتھیاروں یا مشین گنوں کے فائر کر رہا تھا۔

بعض جگہوں پر دُشمن کی پوزیشنیں اُونچی جگہوں پر تھیں جہاں سے توپچی او پی کی مدد سے ایڈوانس کرنے والی فوج پر اندھا دُھند مارٹر فائر کر رہا تھا۔ ادھر ہماری فوج سڑک کے دونوں طرف دھان کے کھیتوں میں کھڑے پانی کی وجہ سے سڑک ہی پر اپنی کارروائی محدود کیے ہُوئے تھی۔ کسی جانب سے بھی آگے بڑھنا مشکل تھا۔ ذرا سی حرکت پر دُشمن کی فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔

ان حالات میں کمپنی کمانڈر میجر مختار نے حقیقتِ حال کا جائزہ لیا، پلان بنایا اور جوانوں کو ہمت دلائی۔ حملہ کرنے سے پہلے دُشمن کا مارٹر اُس جگہ جہاں میجر مختار اور اُس کا توپچی تھے آ کر گرا۔ توپچی کا وائرلیس آپریٹر موقع پر شہید ہو گیا اور میجر مختار شدید زخمی ہُوئے۔ اس حالت میں بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے نائب کمانڈر صوبیدار کو دُشمن کا صفایا کرنے کا حکم دیا۔ یہ حملہ اور دُشمن کا صفایا اُس نے دیکھا۔ اگرچہ بے شمار زخموں کی وجہ سے وہ ہِل نہیں سکتا تھا لیکن تمام واقعات کی اطلاع اُسے ملتی رہی اور وہ حالات کے مطابق آرڈر دیتا رہا۔

چند گھنٹوں کے بعد اُسے ہیلی کاپٹر میں ڈال کر سی ایم ایچ ڈھاکہ لے جا رہے تھے کہ راستے میں شہادت پائی۔

ایک اور معرکے میں اُس کی بے نظیر شجاعت اور جوانمردی کی تفصیل یُوں ہے:

چٹاگانگ میں دو عمارتیں دُشمن کا سب سے مضبوط گڑھ تھیں۔ اُس جگہ اُن کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا جہاں ایل ایم جی اور ایم جی نصب تھیں۔ میجر مختار کو یہ مُہم سر کرنے کا حکم ملا تاکہ دُشمن کی طاقت ٹُوٹے۔ ایک نزدیکی مقام سے اُن کا بریگیڈ کمانڈر اُنھیں ہدایات دیتا تھا۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ میجر مختار نے دُشمن کے سامنے سے دوڑ کر اندر گرینیڈ پھینکے اور سیکٹر ہیڈ کوارٹر تباہ کر دیا اور یُوں دُشمن کے لڑنے کی قوت ختم کر دی۔ ایسے ہی نام نہاد بنگلہ دیش ریڈیو اسٹیشن تباہ کرنے کی بنا پر اُسے ستارۂ جرأت کا اعزاز ملا جسے ۳ر فروری ۱۹۷۲ء کو اُس کی والدہ نے وصول کیا۔

مشرقی پاکستان کی سالمیت برقرار رکھنے میں میجر مختار کی شجاعت اور فرض شناسی کی حقیقتیں روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں تھیں۔ جتنی بار اُسے خطرناک سے خطرناک مُہمات سر کرنے کے لیے بھیجا گیا، کسی کو اتنے مواقع نصیب نہ ہُوئے۔ بار بار کی آزمائشوں پر اُس کی فتح یابیاں کیا اس قدر اہم نہ تھیں کہ اُسے وہ درجہ نہ ملتا جو اور شہدائے پاکستان کو مِلا۔ کیا انسانی آنکھ اُس کی شجاعت میں انصاف کی وہ عظمت نہ دیکھ سکی جو بار بار اُس کا مقدر بنی اور نشانِ حیدر سے اُسے محروم رکھا گیا۔ ایسے جری جاں نثار کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جنھیں چشمِ بینا ہی دیکھ سکتی ہے۔

لیکن دُنیا کی عظمتیں وقتی ہیں۔ اُسے عظمت اُس درگاہ سے عطا ہو گئی جو عظیم ترین ہے اور جس کے انصاف میں شک کی گنجائش نہیں۔ جس مجاہد کو وہ شہادت کا رتبہ عطا فرما کر ابدی سرخروئی سے نواز دے تو اُس کی خوش نصیبی پر کون فخر نہیں کرے گا۔

مطبوعاتِ مکتبہ اردو ڈائجسٹ

- ہمر یاراں دوزخ ـــــ صدیق سالک ۵۰/- روپے
- اجنبی اپنے دیس میں ـــــ شوکت علی شاہ ۵۵/- 〃
- نوکِ زباں ـــــ الطاف حسن قریشی ۲۰/- 〃
- سفرنامۂ ایران ـــــ سید اسعد گیلانی ۳۰/- 〃
- اتحاد جزیرۃ العرب ـــــ محمد مانع ۵۵/- 〃
- ذکرِ علیگڑھ ـــــ عبدالمجید قریشی ۲۵/- 〃
- سمرقند و بخارا کی خونی سرگزشت ـ اعظم ہاشمی ۶/۵۰ 〃
- فیصل پاسبانِ حرم ـــــ محمد صدیق قریشی ۱۶/- 〃
- ٹیپو سلطان ـــــ سجاد ہاشمی ۶/- 〃
- ستارے چھپاتے ہیں ـ مشکور حسین یاد ۱۶/- 〃
- اولادِ آدم ـــــ پروفیسر محمد منوّد ۱۲/- 〃
- انزیری خسر ـــــ سید ضمیر جعفری ۵/- 〃
- جہنم سے فرار ـــــ مقبول جہانگیر ۳۰/- 〃
- سات سمندر پار ـ بیگم اختر ریاض الدین ۱۸/- 〃
- امنِ عالم اور اسلام ـ سید قطب شہید ۲۰/- 〃
- ڈکیٹر کون ـــــ ایس ایم ظفر ۱۸/- 〃
- اسرائیل اور بھارت کے خفیہ تعلقات محمد حامد ۱۲/- 〃
- لہو کی مہندی ـــــ ابن آدم ۸/- 〃
- موت کے خطوط ـ مقبول جہانگیر ۲۰/- 〃
- بارِ سفر ـــــ باقی صدیقی ۱۲/- روپے
- آزادی کے چراغ ـ مشکور حسین یاد ۲۰/- 〃
- بازارِ صدا ـــــ شباب کیرانوی مرحوم ۲۵/- 〃
- دبستان ـــــ کوثر حمید ۱۵/- 〃
- اطمینانِ قلب ـ حکیم مشتاق احمد اصلاحی ۲۵/- 〃
- تھکن اور اس کا علاج ـــــ ادارہ ۶/- 〃
- بڑھاپا اور اس کا سدِباب ـــــ 〃 ۱۰/- 〃
- تنہا ـــــ سلمٰی اعوان ۲۵/- 〃
- حیرت انگیز کہانیاں ـــــ ادارہ ۱۵/- 〃
- دنیا کی عظیم کتابیں ـــــ 〃 ۱۶/- 〃
- جہاں نما ـــــ ممتاز احمد خان ۱۲/- 〃
- تدبر القرآن ـ عمر حداز خان غوری ۲۵/- 〃
- آدابِ دُعا ـ حکیم مشتاق احمد اصلاحی ۶/- 〃
- شگفتے پھول ـــــ شاہدہ صدف ۱۲/- 〃
- دفاعِ پاکستان کی لازوال داستان ـ بریگیڈیئر گلزار احمد ۲۵/- 〃
- تذکرۂ حجاز ـــــ 〃 ۴۰/- 〃
- نفسیات سوالاً جواباً ـ جاوید اقبال ندیم ۱۵/- 〃
- میرا دل میرا کولمبس ـ کیف جاوید ۲۰/- 〃
- لاف ان گیلری نمبر ۲ ـ جاوید اقبال ۱۰/- 〃

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور ۲۵ فون ۴۱۳۸۰۹

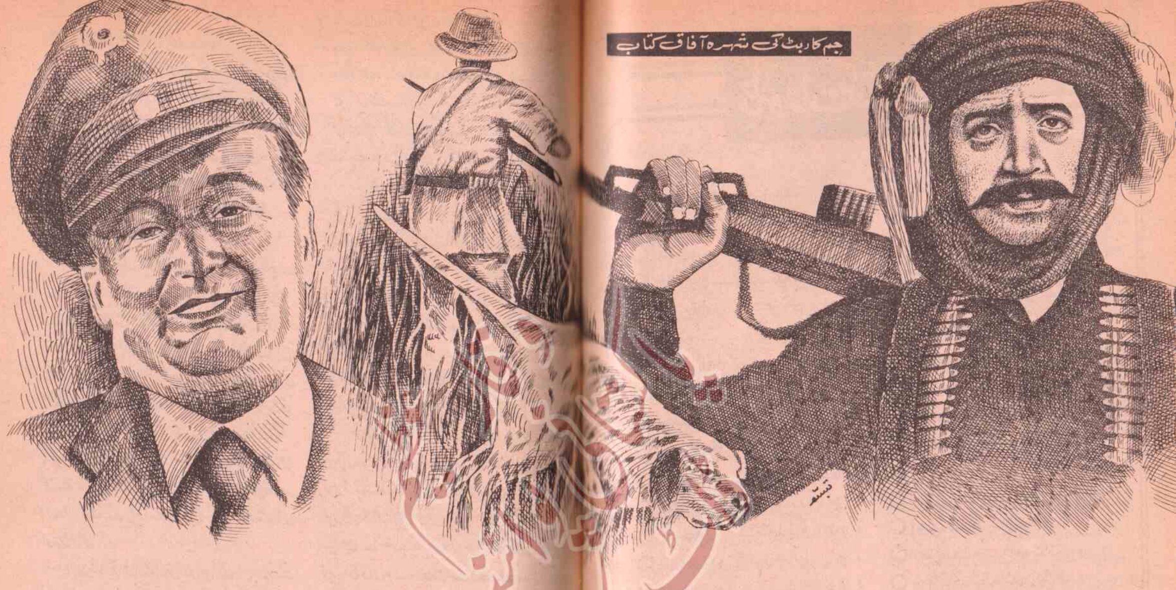

سلطانہ ڈاکو

جرائم کی دنیا کا عجیب و غریب کردار جس کی داستانیں افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہیں۔

ترجمہ و تلخیص: جلال الدین احمد صدیقی

پہلی جنگِ عظیم کے بعد میں نے سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تو میں ...ال کے جنگلی قبائل میں گھل مل کر رہنے لگا۔ ان لوگوں کے ساتھ دیر دیر تک دلچسپ گفتگو رہتی۔ جرائم سے پاک زندگی بسر کرنے کی ترغیب دینے کے لیے حکومت نے انھیں ضلع میرٹھ میں جمنا کنارے وسیع اراضی مفت دے رکھی تھی جس کا لگان وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ زمین بڑی زرخیز تھی اور قبائل تھوڑی سی محنت سے گندم، جوار اور باجرے کی پیداوار حاصل کرتے مگر پھر بھی وہ جرائم کی طرف راغب تھے جو اُن کا جدّی پیشہ تھا۔ جرائم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی جوان لڑکیاں مجرموں سے شادی کرنا پسند کرتی تھیں تاکہ اُن کی زندگی آرام و آسائش سے گزرے۔ مثلاً ایک قبیلہ ڈاکہ زنی میں دلیر تھا۔ اُن کے بزرگ نوجوانوں کو ڈاکہ زنی کی تربیت دیتے اور معقول حصہ انھیں ملتا۔ وہ قبیلہ چھوڑ کر حصولِ روزگار کے لیے علاقے سے باہر جا سکتے تھے مگر عورتیں نقل مکانی نہیں کر سکتی تھیں۔ بزرگوں نے ڈاکہ زنی کے لیے تین اصول بنا رکھے

تھے:

۱: تمام وارداتیں فردِ واحد کرے گا۔

۲: واردات قبیلے کی آبادی سے دُور سے دُور تر ہوگی۔

۳: کسی حالت میں بھی تشدد روا نہیں رکھا جائے گا۔

تربیت حاصل کر لینے کے بعد ہر آدمی کا طریقۂ واردات مختلف ہوتا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کلکتے یا بمبئی جیسے دور دراز شہر میں کسی نوّاب کے ہاں ملازمت کر لیتے اور جب موقع ملتا، قیمتی سامان مثلاً سونا، چاندی، زیورات یا بیش قیمت موتی ہتھیا کر چمپت ہو جاتے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ میرے لیے کماد کے کھیت سے تیتر پکڑ کر لائے۔ وہ چلے گئے تو ایک سرکاری اہلکار نے مجھے بتایا کہ ابھی جس آدمی کو آپ اُس کی مزدوری دس آنے دے رہے تھے، وہ چند روز پہلے ہی ایک سال بعد اس بستی میں آیا ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا چور ہے جو حال ہی میں ایک گرانقدر لعل جس کی مالیت کم و بیش تیس ہزار بنتی ہے چُرا کر لایا ہے۔ اُن کے تجربہ کار بزرگوں نے وہ قیمتی پتھر بڑی چالاکی سے کہیں چھپا دیا ہے۔ مزید برآں وہ اپنی محبوبہ اغوا کرنے کے لیے کلکتے سے ایک عالی شان کار چُرا لایا تھا اور اس واردات کے لیے اُسے ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کرنا پڑی تھی۔

اِن پیشہ ور قبائل کے بعض آدمی جن کے ہاں قوانین اتنے سخت نہیں، دولت مندوں کے ہاں چوکیداری کی ملازمت اختیار کر لیتے۔

نیا گاؤں ہمالیہ کی ترائی میں واقع تھا۔ یہ علاقہ بہت زرخیز اور گنجان آباد تھا۔ زمین کا چپّہ چپّہ زیرِ کاشت تھا اور یہاں کام کرنے والے نہایت خوشحال تھے۔ سر ہنری رمزے ان جفاکش لوگوں کو ہمالیہ کے دامن سے لایا تھا۔ یہ لوگ خاندانی طور پر جفاکش اور تنومند تھے۔

اُن دنوں ملیریا ایک بہت ہی مُہلک بیماری تھا اور اُسے بھابڑ بخار کہا جاتا تھا۔ چند ڈاکٹر اس علاقے میں تھے لیکن اُن میں اتنی اہلیت و قابلیت تھی نہ اُن کے پاس اتنے ذرائع تھے کہ وہ ملیریے سے نمٹ سکتے؛ چنانچہ اس وبا نے شہروں کے شہر انسانوں سے خالی کر دیے تھے۔ نیا گاؤں بھی اس مُہلک مرض سے بُری طرح متاثر ہُوا۔ کھیتوں کے کھیت اُجڑ گئے کیونکہ اُن کی آبپاشی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ چند گنے چُنے آدمی بچ گئے تھے جو خیموں میں زندگی گزارتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے نیا گاؤں ایک بار پھر جنگل میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اس زمین سے استفادہ کرنے کا منصوبہ بنا تو ایک پنجابی جو ڈاکٹر بھی تھا، وہاں جانے کے لیے تیار ہوا مگر بدقسمتی سے پہلے اُس کی بیٹی اور بیوی اور پھر وہ خود ملیریے سے لقمۂ اجل ہو گئے۔

اُس گاؤں کی وہ زمین جہاں پہلے کماد، گندم اور چاول کی فصلیں ہوتی تھیں، وہاں اب عام ہریالی اُگ آئی تھی۔ اس ہریالی کی وجہ سے گرد و نواح کے مویشی یہاں چرنے لگے حتیٰ کہ نیا گاؤں ایک مستقل چراگاہ بن گیا۔

موسمِ گرما میں لوگوں سے سُنا کہ اس چراگاہ کے نزدیک ہی ایک چیتے نے کچھار بنالی ہے اور وہ اکثر مویشیوں کو اپنا نوالۂ تر بنائے رکھتا ہے۔ چراگاہ کا میدان بالکل صاف تھا، کہیں کمین گاہ نہیں بن سکتی تھی؛ چنانچہ اس چیتے سے نمٹنے کے لیے مَیں نے منصوبہ تیار کیا کہ اُس پر اُس وقت بندوق کے فائر داغ دُوں جب وہ رات کے شکار سے فارغ ہو کر صبح اپنی کچھار میں واپس جا رہا ہو۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر تھا کہ چیتا کس طرف سے آتا ہے اور جاتا کدھر کو ہے۔ مَیں اور میرا وفادار اور عقلمند کُتا روبن صبح صبح گھر سے نکل پڑے۔

نیا گاؤں کے شمال میں کندی سرا نامی ایک سڑک گزرتی تھی اور اس کے مشرق میں پُرانی جرنیلی سڑک تھی جو ریلوے لائن بننے سے پہلے یوپی کو کماؤں سے ملاتی تھی۔ اس گاؤں کے جنوب اور مغرب میں گھنے جنگل ہیں۔ یہ دونوں سڑکیں بہت کم زیرِ استعمال تھیں، اس لیے میں نے جنگل کا خطرناک راستہ اختیار

کرنے کے بجائے انہی سڑکوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ ان دونوں سڑکوں کے سنگم پر جہاں کبھی پولیس چوکی تھی اور جس کا کام راہ گیروں اور لٹیروں کی سرکوبی تھی، مَیں نے مادہ چیتے کے نشاناتِ قدم دیکھے۔

مَیں اور روبن فوراً اُس کا پاؤں پہچان گئے کیونکہ وہ ہمارے گاؤں کے نزدیک ایک عرصے تک شکار کرتی رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس نے ہمارے مویشی بھی نہیں بخشے تھے مگر اُس کی وجہ سے جنگلی سُؤر اور بندر ہماری فصلوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ ہم نے قدموں کے نشانات نظرانداز کر دیے اور ٹرنک روڈ کے ساتھ ساتھ گوریو کی طرف چلتے رہے۔ گزشتہ شام سے اس طرف کوئی ٹریفک نہ تھی، اس لیے سڑک پر سے گزرنے والے جنگلی جانوروں یا درندوں کے نشانات بالکل واضح تھے۔

روبن میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ ہم جنگلی پرندوں کے شکار پر نہیں بلکہ درندے مارنے جا رہے ہیں، لہٰذا اُس کی توجہ اس مادہ چیتے اور اُس کے دو بچّوں کی طرف تھی جو ایک دو گھنٹہ پہلے وہاں سے گزرے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ اُگی ہوئی تر و تازہ گھاس پر چیتے کے بچّے خاصی دیر تک آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔

میرے کُتے روبن نے اب چیتے اور اُس کے بچّوں کی بُو اچھی طرح سونگھ لی تھی۔ یہ درندے سڑک کے ساتھ ساتھ ایک میل چل کر مشرقی جانب گئے تھے۔

چوراہے سے تین میل کے فاصلے پر شکارگاہ کا راستہ نیا گاؤں سے آتا اور سڑک عبور کر کے آگے نکل جاتا تھا۔ اس راستے پر آگے جا کر چیتے کے تازہ نشاناتِ قدم دکھائی دیے۔

روبن بڑے جوش و خروش سے اُس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا مگر مَیں نے اُسے منع کر دیا کیونکہ چند سال پہلے کندر سنگھ اور ہار سنگھ اسی جنگل میں اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری ذرا سی غفلت یا لاپروائی یا بے احتیاطی ہمارے دشمن کو چوکنا کر دے اور ہمارا مشن ناکام ہو جائے۔ مَیں نے اپنے شکار سے نمٹنے کے لیے ایک بہت ہی اعلیٰ منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ اس لیے مَیں ناشتہ کرنے کے لیے گھر لوٹ آیا۔ ناشتے کے بعد مَیں، روبن اور میرا دوست مُوسی تینوں اکٹھے گھر سے نکل پڑے اور دوبارہ چیتے کے نشاناتِ قدم کا پیچھا شروع کر دیا۔

چیتے نے گزشتہ روز سے ہمارے کسی مویشی کو اپنا لُقمہ نہیں بنایا تھا۔ مَیں نے سوچا ممکن ہے اُس نے اپنے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے سُؤر یا چیتل مار لیا ہو یا کل شکار کیا ہی نہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو وہ آج شکار کے لیے چراگاہ کی طرف ضرور آئے گا؛ چنانچہ مَیں اور مُوسی نے سڑک کے ساتھ ایک جھاڑی کی اوٹ میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ کُتا بڑی خاموشی سے ہمارے درمیان لیٹ گیا۔

ہمیں پوزیشنیں سنبھالے ایک گھنٹہ گزر گیا تو دفعتاً ایک مور اپنے خوبصورت پَر پھیلائے بڑی شان کے ساتھ ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کوئی دس بارہ چیتل جنگل میں رہنے والے تمام چرند پرند کو اپنی مخصوص آواز سے خبردار کرنے لگے۔ دس منٹ بعد ہمارے قریب ہی ایک چیتل نے پھر وہ مخصوص آواز نکالی۔ چیتا سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔ وہ ایسا نڈر ہو کر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہمیں پھاڑ کے رکھ دے گا۔

روبن اپنے اگلے پاؤں پسارے بڑی خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے کان ہماری طرح جنگل سے آنے والی مختلف آوازوں پر لگا رکھے تھے۔ جب اُس نے مجھے رائفل سنبھالے دیکھا تو اُس کے جسم میں کپکپی سی شروع ہو گئی۔ وہ چیتے سے بہت خائف تھا —— اس کے باوجود خواہ اس مُہم میں خود شکار ہو جاتا یا شکار کر لیتا مگر ہر حال میں اُسے بالکل بےحس و حرکت رہنا تھا۔ اس بات کی اُسے پہلے ہی تربیت دی جا چکی تھی۔

مور پگڈنڈی سے ہوتا ہُوا آلوبخارے کے درخت پر جا بیٹھا تھا اور پکے پکے پھل کھانے لگا۔ اچانک وہ زور سے ہوا میں اُچھلا اور سائیں سائیں کرتا ایک دُوسرے درخت

پر جا بیٹھا۔ وہ خطرے کی مخصوص آواز نکال رہا تھا۔

عین اُسی وقت مَیں نے سڑک کے دُوسری طرف ایک متحرک چیز دیکھی۔ یہ ایک انسان تھا جو دوڑ رہا تھا۔ دوڑ کی رفتار کم کیے بغیر، وقفے وقفے سے وہ مُڑ کر دیکھ رہا تھا۔ شام کی اِس گھڑی ایک تنِ تنہا انسان کا جنگل میں یُوں دوڑنا ایک حیران کُن بات تھی۔ سُورج غروب ہونے والا تھا۔ نو وارد کے ہر قدم نے ہمارے چیتے کے شکار میں رُکاوٹیں ڈال دیں۔

لگتا تھا وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے اور اُسے مدد کی سخت ضرورت ہے۔ جب اُس کا اور ہمارا فاصلہ بہت کم رہ گیا تو مَیں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ آدمی ہمارے قریبی گاؤں کا ایک مزارع تھا جسے سردیوں میں ایک چراگاہ میں چرواہا رکھ لیا گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا مگر جب ہمیں پہچان لیا تو رُکا اور نہایت رقّت آمیز آواز میں پکارا:

"دوڑو! دوڑو! سُلطانہ کے آدمی مجھے گرفتار کرنے کے لیے میرے پیچھے ہیں۔"

وہ بہت پریشان تھا۔ مَیں نے پُوچھا: "تم کہاں سے آئے ہو؟" مگر وہ جواب دینے کے بجائے اپنی ٹانگ میری طرف گھما کر زور سے چیخا:

"دیکھیے، سُلطانہ کے آدمیوں نے کیا ظُلم ڈھایا ہے۔ اگر وہ اب مجھے پکڑ لیتے ہیں تو یقیناً قتل کر ڈالیں گے اور وہ تجھے بھی معاف نہیں کریں گے۔"

اُس کی ٹانگ کا گھٹنے کے پیچھے سے لے کر ایڑی تک گوشت کاٹ دیا گیا تھا اور زخم سے خُون کے فوّارے بہہ رہے تھے۔

مَیں نے کہا: "اگر تم آرام کے لیے ایک گھڑی یہاں نہیں ٹھہر سکتے تو کم از کم دوڑ لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر مَیں نے ایک جھاڑی کی اوٹ سے ایک مرتبہ پھر سڑک پر نگاہ ڈالی مگر مجھے اُدھر چیتا نظر آیا نہ کوئی سلطانہ کا آدمی۔ وہ شخص لنگڑاتا ہُوا اپنے گاؤں کی طرف رواں دواں تھا۔

جب گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا اور صحیح نشانہ لینا ممکن نہ رہا تو مَیں، مُوسی اور روبن بڑے مایُوس ہو کر لَوٹ آئے۔

اگلے دن اُس آدمی نے مجھے پُوری کہانی سُنائی۔

اپنی بھینسیں گربیو اور چراگاہ کے درمیان چرا رہا تھا جب اُس نے بندوق چلنے کی آواز سُنی۔ اُس دن گاؤں کے نمبردار کا بھتیجا بھی اس جنگل میں پہنچا ہُوا تھا۔ وہ ایک سرسبز درخت کے نیچے تھا۔ اُس نے چرواہے سے پُوچھا کہ فائر کس نے کیا ہے، نیز چراگاہ مزید کتنے دن کے لیے کافی ہوگا۔ چرواہا حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے ایک طرف کو چل دیا۔ وہ جنگل میں کچھ دُور گیا تھا کہ اچانک اُس نے اپنے پیچھے سرسراہٹ کی آواز سُنی۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پانچ آدمی سر پر کھڑے تھے۔

اُن آدمیوں نے اُس سے کہا کہ ہمیں وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے بندوق چلنے کی آواز آئی ہے۔ اُس نے کہا کہ جب بندوق چلی ہے تو مَیں سویا ہُوا تھا، اس لیے فائر کی صحیح سمت نہیں بتا سکتا۔

اس پر وہ بولے کہ ٹھیک ہے، تم ہمیں چراگاہ میں لے چلو۔ ہمارا خیال ہے یہ بندوق والا آدمی اُدھر ہی آئے گا۔ اُن لوگوں کے پاس کوئی بارودی اسلحہ نہیں تھا مگر اُن کے سردار کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار تھی اور اُس نے تنبیہ کر دی کہ اگر چرواہے نے بھاگنے یا بندوقچی کو خبردار کرنے کی جسارت کی تو اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا جائے گا۔

راستے میں اُن کے پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ نمبردار کا بھتیجا بھی چراگاہ میں آیا ہُوا ہے۔ اُن کے لیڈر نے انکشاف کیا کہ وہ دراصل سلطانہ کے آدمی ہیں جس نے نزدیک ہی اپنا کیمپ لگا رکھا ہے۔ جب سُلطانہ نے بندوق چلنے کی آواز سُنی تو اُس نے حکم دیا کہ بندوق اور بندوقچی کو فوراً اُس کے رُوبرُو پیش کیا جائے۔ اگر چراگاہ میں اُنہیں ذرہ بھر بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ایک تو وہ چراگاہ جلا ڈالیں گے، دُوسرے اُسے اور نمبردار کے بھتیجے دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ اس دھمکی نے چرواہے کے لیے ایک عجیب سی کشمکش کی صورت پیدا کر دی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

اُس کے ذہن میں خیالات کی جنگ جاری تھی کہ اُسی لمحہ ایک چیتل سامنے سے گزرا جس کے پیچھے بہت سے کتّے لگے ہوئے تھے۔ وہ پانچوں آدمی یہ نظارہ دیکھنے میں کھو گئے۔ موقع پا کر چرواہے نے سڑک کے ساتھ اُگی ہُوئی اُونچی اُونچی گھاس میں غوطہ لگایا۔ سُلطانہ کے آدمی نے اُس کے پیچھے سے تلوار کا وار کیا۔ ٹانگ پر گہرا زخم آنے کے باوجود وہ پوری رفتار سے دوڑتا چلا گیا۔ آدمی پیچھے رہ گئے۔ بھاگتے بھاگتے اتفاقاً وہ اُس جگہ آ پہنچا جہاں ہم چیتے کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔

سُلطانہ بھانتو جرائم پیشہ قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرموں کا ایک الگ قبیلہ سمجھتا تھا اور اُس کی سرگرمیوں کو مراد آباد و نجیب آباد تک محدود کر دی گئی تھیں۔ مشنری تنظیم سالویشن آرمی نے سُلطانہ، اُس کے شیر خوار بچّے، اُس کی نوجوان بیوی نیز سینکڑوں دُوسرے بھانتوؤں کو اپنی زیرِ نگرانی قلعے میں بند کر رکھا تھا۔ قید کے دوران میں سُلطانہ نے قلعے کی دیوار پھاندی اور فرار ہو گیا۔ یہ واقعہ میرے کہانی لکھنے سے تقریباً ایک سال پہلے کا ہے۔

اس دوران میں سُلطانہ ڈاکو نے اپنے گرد سینکڑوں جری اور بہادر نوجوان اکٹھے کر لیے تھے۔ وہ سب مسلّح تھے اور سلطانہ کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اُن کا سب سے بڑا مقصد ڈاکے مارنا تھا۔ اُنھوں نے بھابر اور ترائی کے جنگلوں میں ٹھکانے بنا لیے اور اُن کی سرگرمیاں گونڈہ سے لے کر مشرق میں سہارن پُور تک پھیل گئیں۔ کبھی کبھار وہ صوبہ پنجاب کے علاقوں میں بھی راہزنی کرتے۔

مَیں نے سب سے پہلے سُلطانہ کا نام اُس وقت سُنا جب وہ ہمارے گھر سے چند میل دُور ایک کیمپ میں زندگی

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا

مَیں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہُوں کہ آپ کسی سیاسی پارٹی کے آلۂ کار بن گئے تو یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ یاد رکھیے انقلابی تبدیلی رُونما ہو چکی ہے، اب ہماری اپنی حکومت ہے۔ ہم ایک آزاد اور خُود مختار مملکت بنا چکے ہیں، اس لیے اب ہمیں آزاد لوگوں ہی کی طرح عمل کرنا چاہیے۔

(ڈھاکہ — ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

گزار رہا تھا۔ مسٹر پرسی وان ڈھائم اُس وقت کماؤں کا کمشنر تھا۔ بھابر اور ترائی کے جنگل، جن میں سُلطانہ کی آماجگاہ تھی، اُس کے زیرِ نگرانی تھے۔ کمشنر نے سُلطانہ کی سرگرمیاں روکنے کے لیے حکومت سے فریڈی ینگ کی خدمات حاصل کیں۔ حکومت نے اسپیشل پولیس فورس بنانے کی بھی اجازت دے دی جس میں تقریباً تین سو چُنے ہُوئے جری جوان بھرتی کیے گئے۔ فریڈی ینگ کو اس فورس کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجُود فریڈی اور اُس کے نڈر سپاہی اشتہاری ملزم سُلطانہ کو گرفتار نہ کر سکے۔ یہ بات اُن کے اور اُن کے افسروں کے لیے بہت باعثِ شرم تھی، اس لیے وہ جلد ہی لوگوں میں اپنی مقبولیّت کھو بیٹھے۔

جب فریڈی اپنی سپاہ کی طاقت بڑھانے میں مصروف تھا، اُن دنوں سُلطانہ کے آدمیوں نے بھابر اور ترائی کی بستیوں میں لُوٹ مچا رکھی تھی۔ فریڈی نے سُلطانہ کو رام نگر کے مغرب میں پھیلے ہُوئے جنگلات سے پکڑنے کی کوشش کی۔ محکمۂ جنگلات درخت کٹوا رہا تھا اور اس مقصد کے لیے مزدوروں کی ایک فوجِ ظفر موج جنگل میں بھیجی گئی تھی۔ ایک ٹھیکیدار کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ سُلطانہ کو، جو اس جنگل کے مضافات

میں کہیں بستا ہے، کسی طرح ایک ناچ پارٹی میں مدعو کرے اور اُن کے کھانے کا بھی انتظام کرے۔

سُلطانہ اور اُس کے آدمیوں نے ٹھیکیدار کی دعوت قبول کرلی اور طے شدہ وقت پر وہ مقررہ جگہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی اُنہوں نے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرائی۔ پہلے ناچ دیکھنے کے بجائے اُنہوں نے کھانا کھانا بہتر سمجھا۔ یہاں سُلطانہ کو یہ فائدہ تھا کہ وہ اپنے میزبان کو انعامات ہی سے نہیں نواز سکتا تھا بلکہ سزا بھی دے سکتا تھا جبکہ فریڈی کی طرف سے فقط اُس کی خدمات کا صلہ متوقع تھا۔

سُلطانہ غربت سے بخوبی آگاہ تھا کیونکہ نجیب آباد میں حراست کے دوران میں اُسے اس لعنت سے خوب پالا پڑا تھا۔ وہ غربت اور اُس سے جنم لینے والے مسائل کو بخوبی جانتا تھا۔ اُس کے سینے میں غریبوں کے لیے دھڑکنے والا دل اور ایک تڑپ تھی۔ اُس نے اپنی مجرمانہ زندگی میں کبھی کسی غریب پر ہاتھ نہ اُٹھایا۔ سوالی کا ہاتھ کبھی خالی نہ لوٹایا۔ اور چھوٹے دُکانداروں سے خریدی ہوئی چیزوں کی اُنہیں دُگنی قیمت ادا کی۔ اس پس منظر میں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اُس کے اپنے محکمۂ سراغرسانی میں سینکڑوں لوگ شامل تھے، چنانچہ وہ فریڈی کی طرف سے ٹھیکیدار کے ذریعے دی گئی دعوت کے متعلق پہلے ہی پوری طرح آگاہ ہوگیا۔

ٹھیکیدار جو مال و دولت کی وجہ سے بہت مشہور تھا، اُس نے رام نگر اور کاشی پور کے تمام اُمرا و رؤسا اس دعوت پر بلا رکھے تھے اور اپنے مہمانوں کو خوش رکھنے کے لیے مشہور ترین رقاصاؤں کا بھی اہتمام کیا تھا۔ خورونوش کے لیے اعلیٰ قسم کے مشروبات اور کھانے منگوائے گئے۔ رات کے وقت جب سُلطانہ کی گرفتاری عمل میں آنی تھی سارے مہمان آگئے اور دعوتِ عام شروع ہوگئی۔

ممکن ہے ٹھیکیدار کے آدمی اپنے مہمانوں کو نہ پہچان سکے ہوں کیونکہ ایسے موقعوں پر مختلف لوگ یکجا ہوجاتے ہیں اور اُن میں تمیز کرنا آسان نہیں رہتا۔

سُلطانہ اپنے آدمیوں کے ہمراہ دعوت میں آیا اور اُنہوں نے جی بھر کر لُطف اُٹھایا۔ کھانا کھاچکنے کے بعد سُلطانہ اپنے میزبان کو ایک طرف لے گیا اور اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی کیونکہ اُنہوں نے بہت دُور دراز کا سفر کرنا تھا وہ ناچ دیکھنے کے لیے نہیں رُک سکتے تھے۔ جانے سے پہلے اُس نے اپنے میزبان سے کہہ دیا کہ دعوت کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہیں آنا چاہیے اور یہ حسبِ پروگرام تکمیل کے مراحل تک پہنچے۔

ناچ میں موسیقی کا سب سے بڑا ساز ڈھول ہوتا ہے۔ طے یہ پایا تھا کہ جب ڈھول بجنے لگے تو اُس وقت فریڈی اپنے سپاہیوں کے ساتھ کیمپ کا محاصرہ کرلے۔ فریڈی نے اپنی سپاہ مختلف حصّوں میں بانٹ کر اُن کی ڈیوٹیاں لگادی تھیں۔ محکمۂ جنگلات کے گارڈز کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ سُلطانہ کی واپسی کے تمام راستے مکمل طور پر بند کردیتے لیکن یہ گروہ اندھیرے کی بنا پر جنگل میں راستہ کھو بیٹھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سُلطانہ اور اُنہوں نے مل کر ایک ہی جنگل میں زندگی گزارنا تھی۔

سُلطانہ کے ایما پر پروگرام کی تبدیلی نے اُسے بچ نکلنے کے لیے خاصا وقت دے دیا تھا، چنانچہ خطرے کا الارم بجنے سے پہلے ہی وہ دُشمن کے جال سے نکل گیا۔ فریڈی اس تمام صُورتِ حال سے بالکل بے خبر تھا۔ ڈھول کی آواز پر اُس نے محاصرہ تنگ کرنا شروع کردیا حتّٰی کہ وہ کیمپ تک پہنچ گیا، مگر وہاں ناچنے والی لڑکیوں اور ٹھیکیدار کے چند مُعزز مہمانوں کے سوا اُسے کچھ بھی نہ ملا۔

رام نگر جنگل سے بچ نکلنے کے بعد سُلطانہ نے پنجاب کا رُخ کیا۔ جنگلوں کی ادھر کمی تھی، اس لیے اُسے زیادہ عرصہ یہاں قیام کرنے کا موقع نہ ملا اور وہ پھر صوبجات متحدہ کے گھنے جنگلوں میں جا چھپا۔

پنجاب سے واپسی پر اُنہیں گنگا نہر عبور کرنا تھی۔ اس پر چار چار میل کے فاصلے پر پُل بنے ہوئے تھے جہاں سخت

پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ مگر سُلطانہ نے اپنی کمال ہوشیاری سے ایک ایسے پُل کا انتخاب کیا جہاں پہرہ نہیں تھا۔ پُل پار کرنے کے بعد سُلطانہ کا گزر ایک ایسے گاؤں سے ہُوا جہاں ہندوستانی موسیقی بج رہی تھی۔ جب اُس کے آدمیوں نے اُسے بتایا کہ یہاں ایک امیر کبیر آدمی کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے تو اُس نے حکم دیا کہ مجھے وہاں لے چلو۔

شادی میں ہزاروں لوگ شریک تھے۔ مہمان گاؤں کے بین وسط میں ایک کُھلے میدان کے اندر بیٹھے تھے۔ سُلطانہ وہاں پہنچا تو لوگوں میں ایک سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی مگر اُس نے فوراً دُولہا کے والد اور بستی کے نمبردار کو بُلا کر کہا کہ دیکھیے، مجھ سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اُنہیں ایک طرف لے گیا اور کہا کہ صرف دس ہزار روپے اور ایک رائفل میرے حوالے کر دیجیے۔ اُس کے حُکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اُس نے بندوق اور مطلوبہ رقم لی اور اس اجتماع کو خُدا حافظ کہہ کر اپنے آدمیوں سمیت اُس بستی سے نکل گیا۔ اُس کے ایک ساتھی نے دُلہن کو زبردستی اغوا کر لیا۔ سُلطانہ کو ایک دن تک اس کا علم نہ ہو سکا۔ جب اُسے علم ہُوا تو اُس نے فوراً اپنے نائب کو بُلا کر اُسے بُرا بھلا کہا اور لڑکی واپس اُس کے والدین تک پہنچا دی گئی۔

چرواہے کی زخمی ٹانگ کے حادثے کے بعد سُلطانہ نے کچھ عرصہ اس علاقے میں قیام کیا۔ مجھے اس دوران میں ایک بہت اچھا تجربہ ہُوا۔ ایک شام مَیں نے اپنے گھر سے تقریباً پانچ میل دور ایک چیتے کو گولی کا نشانہ بنایا اور موقع ہی پر اُس کی کھال اُتار لی۔ جب گھر پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ اپنا شکاری چاقو جائے شکار پر بُھول آیا ہُوں۔ اُسے اُٹھانے واپس گیا تو وہاں آگ کا الاؤ جلتے دیکھا۔ اُس جنگل میں سُلطانہ کے موجود ہونے کی خبر بہت گرم تھی۔ مَیں نے اُسی لمحے اُس ڈاکو سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ پتّوں پر صُبح صُبح شبنم پڑی ہُوئی تھی، اس لیے مَیں بغیر آواز پیدا کیے الاؤ تک جا پہنچا۔ بیس پچیس آدمی اس آگ کے گرد بیٹھے آگ سینک رہے تھے مگر اُن میں سُلطانہ موجود نہ تھا۔ دراصل یہ آدمی اُس کے گروہ کا ایک حصّہ تھے۔ مجھے اُن لوگوں سے کچھ غرض نہ تھی۔

مَیں اگلا قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس گروہ کے ایک آدمی کو یہ کہتے ہُوئے سُنا کہ اب یہاں سے جلدی کوچ کرنا چاہیے۔ میرے وجود میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خدشہ تھا اگر مَیں واپس مُڑوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ سُلطانہ کے ساتھی مجھے دیکھ لیں۔ اس سے ایک بہت بڑا فتنہ جنم لے گا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ مَیں دوڑ کر اس گروہ سے جا ملوں۔ مَیں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور جب دوڑ کر اُن کے درمیان جا پہنچا تو سب نے متحیّر ہو کر میری جانب دیکھا۔

مَیں نے جاتے ہی اُن لوگوں سے پُوچھا کہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جواب دیا کچھ نہیں۔ مزید سوالات کا اُنھوں نے بس ایک جواب دیا کہ وہ بریلی سے آئے ہیں۔ اُن کا پیشہ لکڑیاں اکٹھی کر کے بیچنا ہے مگر آج وہ جنگل میں راستہ کھو چکے ہیں۔ مَیں نے مُڑ کر درخت کی طرف دیکھا جس پر بندوقیں لٹکتی دکھائی دیں۔ دراصل یہ لکڑیاں کاٹنے والے کلہاڑے تھے جن کے دستوں پر رنگ کر دیا گیا تھا اور جو دُور سے بندوقیں یا رائفلیں دکھائی دیتے تھے۔

مجھے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے ہُوئے تھے۔ مَیں نے بھی اُن کے ساتھ آگ سینکنا شروع کر دی اور بعد میں اُنہیں اُن کے کیمپ کا راستہ بتا دیا جو نزدیک ہی تھا۔ پھر مَیں نے اپنا چاقو اُٹھایا اور گھر چلا آیا۔

فریڈی نے اب اپنی تنظیم کو بہتر طور پر منظم کر لیا اور آمدورفت کے لیے گاڑیوں کا خاطر خواہ بندوبست کیا۔ اب وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر سُلطانہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سُلطانہ نے بھی فریڈی کی کوششیں ناکام بنانے کی خاطر اپنے گروہ کے آدمیوں کی تعداد کم کر دی تھی۔ اُن دنوں اُس نے پیلی بھیت کے ضلع میں رہائش رکھی ہُوئی تھی۔ یہاں رہ کر وہ گورکھ پور تک ڈاکہ زنی کرتے اور سونا چاندی اکٹھا کرتے رہے۔

جب وہ ہمارے مضافات کے جنگلوں میں واپس آیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ ریاست رام پور کی امیر ترین رقّاصہ نمبردار کے

ہاں رہائش پذیر ہے۔ ڈاکوؤں کے خوف سے نمبردار نے تیس محافظوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ سُلطانہ وہاں پہنچا اور اُس کے آدمیوں نے گھر کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کیا مگر اس کارروائی سے بہت پہلے وہ رقاصہ اپنے زیورات سمیت گھر کے پچھلے دروازے سے چھلانگ لگا کر بچ نکلی تھی۔

نمبردار اور اُس کے محافظوں کو سُلطانہ کے آدمیوں نے گھر کے صحن ہی میں رسّیوں سے جکڑ دیا تھا۔ جب لڑکی کے بارے میں انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ڈاکوؤں نے اُن کی خُوب پٹائی کی۔ ایک جرأت مند محافظ نے لمبا سا بانس نکال کر ایک ڈاکو کے سر پر زور سے دے مارا تو دوسرے ڈاکو نے اس بیچارے کا سینہ گولی سے چھلنی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سُلطانہ اپنے آدمیوں کو لے کر بھاگ نکلا کیونکہ اب خطرہ درپیش تھا کہ لوگ مسلح ہو کر اُن پر حملہ ہی نہ کر دیں۔ بھاگتے بھاگتے وہ سردار کا عالیشان گھوڑا بھی ساتھ لیتا گیا جو اُس نے حال ہی میں خریدا تھا۔

اگلے دن جب مجھے اس گھناؤنے قتل کا پتہ چلا تو بڑا افسوس ہُوا۔ مَیں نے فریڈی سے مِل کر سُلطانہ کو گرفتار کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ ایک ماہ بعد مَیں فریڈی کے ہیڈ کوارٹر ہردوار پہنچا اور اُسے اپنی آمد کے بارے مطّلع کر دیا۔ جب مسٹر وائن ڈھیم مرزا پور میں کلکٹر کی اسامی پر تعینات تھا تو اُس وقت چیتے کے شکار میں اُس نے میری مدد کے لیے بیس آدمی مقرر کیے تھے۔ اُن میں سے چار نہایت جری اور دلیر تھے جو اب فریڈی کی سپاہ میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ فریڈی اور اُن چاروں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ فریڈی نے میرے اور اُن چار بہادروں کے ذمّے یہ ڈیوٹی لگائی کہ ہم سُلطانہ کو تلاش کریں۔ اُس کی موجودگی کا پتہ چل جائے تو کافی سپاہ لے کر اُس پر فوراً حملہ کر دیں گے۔

اس تمام کارروائی کی تکمیل رات کو ہونا تھی مگر سُلطانہ کوئی بہت ہی بے چین رُوح تھی۔ وہ اپنا ٹھکانہ تبدیل کرتا رہتا اور کسی ایک جگہ ایک دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ رات کے وقت اُس کے مسلح ساتھی میلوں دُور تک ڈاکے ڈالتے۔

موسم انتہائی گرم تھا۔ مسلسل سفر اور ناکام کوششوں سے تنگ آ کر مَیں نے اپنے چاروں ساتھیوں سے مشورہ کیا اور پھر اپنی تجویز فریڈی کے سامنے رکھ دی۔ تجویز یہ تھی کہ مَیں اور میرے چاروں ساتھی، جو فریڈی کے دیے ہُوئے اسلحے سے لیس تھے، ہردوار اسٹیشن پر اُتر جائیں اور اکیلے ہی سُلطانہ سے ٹکر لیں خواہ اس میں ہم قتل ہوں یا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

فریڈی گھنٹوں نیم وا آنکھوں سے ہماری تجویز پر غور کرتا رہا۔ آخر کار اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا کہ مَیں آپ کی زندگیوں کا ذمّے دار ہُوں، اتنی خطرناک مُہم پر جانے کی ہرگز اجازت نہ دوں گا۔ اُسے دلیل سے قائل کرنا بے سُود تھا، اس لیے ہم اگلی صبح اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ ویسے یہ تجویز بالکل غلط تھی کیونکہ میری اور میرے چار دوستوں کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ اگر سُلطانہ پر حملے کی وجہ سے کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو ہماری کارروائی کبھی دُرست نہ گردانی جاتی۔

تین ماہ بعد جب مون سُون کا زور تھا، فریڈی نے بجنور اور ترائی جنگلات کے سپرنٹنڈنٹ اینڈرسن اور مجھ سے سُلطانہ ڈاکو کے پکڑنے کے لیے تعاون طلب کیا۔ ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہُوا کہ اُس نے سُلطانہ کے کیمپ کے بارے میں صحیح معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔ یہ کیمپ نجیب آباد جنگل کے عین وسط میں تھا۔ فریڈی کا منصُوبہ یہ تھا کہ ہم سب مل کر اُس کیمپ کے گرد گھیرا ڈال لیں اور پھر گھیرا اتنا تنگ کریں کہ سُلطانہ گُھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے۔ نیز اُس کے فرار کی تمام راہیں مسدُود کر دی جائیں۔

اُس وقت تک فریڈی کو سُلطانہ کی سی آئی ڈی کے متعلق ہرگز علم نہ تھا۔ جہاں تک ہمارے منصُوبے کا تعلق تھا، اُسے فریڈی، میرے اور دو ساتھیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہر شام پولیس کی بہت سی مسلح نفری جنگل میں دُور دراز مقامات تک پہنچا دی جاتی۔ ساتھ ہی مَیں، فریڈی اور ہمارے چار ساتھی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنگل کے اندر دُور تک چلے جاتے اور خاصی دیر بعد واپس ڈاک بنگلے آتے۔

ایک شام ہم ریلوے اسٹیشن کے ہارڈویئر گُڈز یارڈ میں

...گاڑیاں ویگنیں ہماری منتظر تھیں۔ اُن کے دروازے کُھلے ...تھے تاکہ سوار ہونے میں ایک منٹ بھی ضائع نہ ہو۔ ہم ...ڈبوں میں سوار ہُوئے، گاڑی سیٹی بجائے بغیر چلنے لگی۔ ...گاڑی دو جنگلوں کے عین درمیان رُک گئی اور بڑی خاموشی ...سپاہیوں کو مطلع کر دیا گیا کہ نیچے اُتر جائیں۔ اس حکم کی ...کے فوراً بعد گاڑی نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

...سپاہ کی مجموعی تعداد تین سو تھی۔ اُن میں پچاس مسلح جری ...ہربرٹ کی زیرِ قیادت تھے جنھیں سُلطانہ کا فرار ناکام ...تھا۔ ہربرٹ بذاتِ خود ایک بہادر جوان تھا۔ اُس نے ...عالمی جنگ میں فرانس کے محاذ پر خدمات سرانجام دی ...ہربرٹ کا دستہ ایک رات پہلے ہی جنگل کی طرف روانہ ...کیا گیا تھا تاکہ وہ جنگل کے اندر ایک مخصوص جگہ ٹھہر جائیں۔ ...سپاہ کا کمانڈر اینڈرسن تھا۔ مَیں اور فریڈی بھی اس نفری میں ...تھے۔ مخصوص جگہ سب اکٹھے ہو گئے تو ہم انجانی منزل کی طرف ...گئے جو تقریباً بیس میل دُور تھی۔

موسم بڑا خراب تھا۔ صبح ہی سے بادل گرج رہے تھے ...موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، تاہم ہم نے اپنا سفر جاری ...ہمیں اپنا راستہ بار بار بدلنا پڑتا کیونکہ راستے میں پڑنے ...دیہات میں ایسے لوگ بھی تھے جنھیں سُلطانہ مستقل تنخواہ ...دیتا تھا۔

ہم قدِ آدم گھاس اور برستی بارش میں اپنی منزلِ مقصود کی ...رواں دواں تھے۔ بعض اوقات دلدلی زمین میں گھٹنوں ...تک دھنس جاتے اور بڑی مشکل سے باہر نکلتے۔ بارش کے ...قطروں سے بچنے کے لیے مجھے اپنا ایک ہاتھ اپنی آنکھوں پر ...رکھنا پڑتا تھا۔ مَیں بار بار فریڈی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ ...جاتا۔ اُس کا وزن ۲۸۴ پونڈ تھا مگر وہ بڑی مستقل مزاجی سے ...چلا جا رہا تھا۔

ہم نے اپنے سفر کا آغاز نو بجے رات کیا تھا۔ تقریباً دو بجے ...مَیں نے محسوس کیا کہ ہم اپنی اصل سمت چھوڑ کر مغرب کی طرف ...رواں دواں ہیں۔ کیپٹن فریڈی تک اپنا یہ خدشہ پہنچایا تو اُس

اُردو کے مشہور بزرگ ادیب جناب یُوسف بخاری صاحب نے بیگم شائستہ اکرام اللہ کو لفافے میں بند اپنی ایک کتاب دی اور فرمایا: "بیگم صاحبہ! اس میں آپ کی یادگار بھی ہے! اور ہاں! کتاب میں کہیں غلطی ہو تو ٹھیک کر دیجیے گا۔"

بیگم صاحبہ نے مُسکرا کر فرمایا: "ارے صاحب! آپ کی غلطی مَیں کیا نکالوں گی؛ البتہ میری یادگار... حیرت ناک بات ہے! ابھی تو مَیں زندہ ہُوں!"

یہ سُن کر بُخاری صاحب پہلے تو کچھ شرمندہ ہُوئے اور پھر لاجواب ہو گئے۔

(سیّد اوصاف علی دہلوی ــ عصمت، اگست ۸۶ء)

نے کہا کہ ہم صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ ہم غلط سمت میں جا رہے ہیں تو مَیں نے فریڈی سے کہہ کر سب کی پیش قدمی روک دی۔ جب فریڈی تک پہلا پیغام بھجوایا تھا تو اُس وقت مَیں ایک ایسے درخت کے نیچے کھڑا تھا جس پر گِدھ نے گھونسلا بنا رکھا تھا اور ایک گھنٹہ مسلسل چلنے کے بعد بھی ہم اُسی درخت کے نیچے تھے جس پر گِدھ کا گھونسلا بنا ہُوا تھا۔ اس سے یہ بات عیاں تھی کہ ہم ایک دائرے میں جنگل کے اندر بھٹک رہے ہیں۔

ہمارے پاس جو چار رہبر تھے، اُن میں سے دو سُلطانہ کے ٹولے سے تعلّق رکھتے تھے اور انھی کے ایما پر یہ پروگرام مرتّب کیا گیا تھا۔ اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ سُلطانہ کے کیمپ تک ہمیں پہنچا دیں تو اُنھیں آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ دونوں چرواہے تھے جو عرصے سے جنگلوں میں مویشی چراتے تھے اور سُلطانہ کو ہر روز دُودھ بھی مہیا کرتے۔ جب اُنھیں بتایا گیا کہ ہم صحیح سمت میں نہیں جا رہے تو اُنھوں نے صاف انکار

کردیا۔ جب اُن پر دباؤ ڈالا گیا تو اُنھوں نے جھجکتے ہُوئے کہا کہ اگر ہمیں پہاڑیوں کے متعلق علم ہو جائے تو ہم صحیح راستے کا تعین کرلیں گے۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ہمیں میل دُور واقع پہاڑیوں کو دیکھنا بالکل ناممکن تھا۔ مجبوراً پُوری سپاہ کو وہیں رُکنا پڑا۔ یہ فریڈی کے منصوبے کی ناکامی کا مُنہ بولتا ثبوت تھا۔

ہمارا ارادہ تو یہ تھا کہ ہم اپنے دُشمن کو عین اُس وقت نرغے میں لے لیں جبکہ اُس کے پاس فرار کا راستہ بھی نہ ہو اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں وہ اپنی دفاعی کارروائیاں بھی نہ کرسکتا ہو۔ ہمارے گائیڈوں نے ہمیں بتایا تھا کہ دن کی روشنی میں سُلطانہ کے کیمپ کا محاصرہ ممکن ہی نہیں کیونکہ اُس کے دو آدمی ایک اُونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھے رہتے ہیں اور دُشمن کی سرگرمیوں کے متعلق فوراً سُلطانہ کو مطلع کر دیتے ہیں۔

اب ہمارے پاس اندھیرے کا صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اُس وقت سب سے پریشان کُن بات یہ تھی کہ ہمیں یہ علم نہ تھا ہم کیمپ سے کتنے فاصلے پر ہیں اور کیمپ کس سمت میں ہے۔ تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور مَیں نے راہبروں سے پُوچھا کیا تمہیں کوئی ایسی نشانی، جیسے ندی یا چراگاہ، یاد ہے جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا تاکہ اس کی مدد سے دوبارہ سمت کا تعین کرسکیں۔ اور جب اُنھوں نے یہ بتایا کہ کیمپ کے ایک میل جنوب میں پُرانا راستہ تھا، تب مَیں نے فریڈی سے راہبری کرنے کی اجازت طلب کرلی اور پھر ہم دوبارہ اُسی ریلوے لائن کی طرف بڑھنے لگے جہاں سے سات گھنٹے پہلے اس تکلیف دہ سفر کا آغاز کیا تھا۔

اب بارش تھم چکی تھی اور مطلع صاف ہوگیا تھا۔ نسیمِ سحر چل رہی تھی اور آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی ظاہر ہونے لگی تھی جنگل میں ڈیڑھ میل چلنے کے بعد ہم ایک گہری ندی پر کھڑے تھے۔ ان ندیوں سے مجھے بڑا خوف آتا کیونکہ ان کے کنارے مَیں نے بڑے بڑے ناگ رینگتے دیکھے تھے۔ ندی کنارے اُگی ہُوئی قدِآدم گھاس میں ہمارے آدمی بڑی خاموشی سے بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ رینگنے لگے۔ اب سُورج پُوری طرح نکل آیا تھا

عین اُسی لمحے گائیڈ زمین پر لیٹ گئے اور اُس کے پیچھے والے تمام لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک گائیڈ نے ... اشاروں اشاروں میں اپنے پاس بُلایا۔

فریڈی، اینڈرسن اور مَیں ہاتھوں کے بل رینگ کر ... تک جا پہنچے اور اُن کے پہلو میں لیٹ گئے۔ اُنھوں نے ... درخت پر وہ مچان دکھائی جس پر دو آدمی بیٹھے حُقہ پی ... اس بلند مچان سے گھنے جنگل میں دُور دُور تک دُشمن پر ... رکھی جاسکتی تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ سُلطانہ کا کیمپ اس ... سے تین سو گز کے فاصلے پر ہے۔ اب تھوڑا سا واپس ... عبور کرنا اور پھر سُلطانہ کے کیمپ کے سامنے سے گزرنا ... حماقت تھی۔ عین ممکن تھا مچان پر بیٹھے ہُوئے آدمی ہماری ... سے آگاہ ہوکر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دیتے۔

فریڈی سروس ریوالور سے مسلح تھا اور اینڈرسن نہتا ... اتنے بڑے منظم گروہ میں بس مَیں ہی تھا جس کے پاس ... تھی۔ پولیس کے سپاہی بارہ بور کی بندوقیں لیے ہُوئے ... جن کی مار پچاس سے ساٹھ گز تک تھی۔ دونوں بھٹنوؤں ... مشورہ دیا کہ اپنی کارروائی جلد از جلد عمل میں آنی چاہیے کیونکہ ... پر موجود آدمیوں کی باری ختم ہونے والی ہے۔

وہ دونوں آدمی رائفلوں سے مسلح تھے۔ مجھے اپنے نشانے ... پر اتنا اعتماد تھا کہ مَیں اُن کا حُقہ یا کسی ایک کی ایڑی تک ... سکتا تھا لیکن اُن دونوں کو بیک وقت رائفل کا نشانہ بنانا ... بس میں نہ تھا۔ مَیں نے فریڈی سے کہا کہ مَیں خاموشی سے ... درخت پر چڑھ کر ان دونوں بدقماشوں پر قابو پاسکتا ہُوں مگر ... نے یہ خطرہ مول لینے کی اجازت نہ دی۔

حسبِ ہدایت ہمارے پچاس ساٹھ آدمیوں نے خالی زمین کا ٹکڑا پار کیا اور لمبی لمبی گھاس والے میدان میں آگے بڑھے۔ ہم اُس وقت کیمپ سے صرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھے۔ اس اثنا میں ہمارے دو جوشیلے نوجوانوں نے مچان پر بیٹھے ہُوئے دونوں آدمیوں کو اپنی بندوقوں کا نشانہ بنایا تو وہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ گرتے ہی وہ درخت

سے بندھے گھوڑوں پر سوار ہُوئے اور کیمپ کی طرف بھاگ نکلے۔ اب فریڈی نے اُونچی آواز سے اپنی سپاہ کو حکم دے دیا کہ وہ دھاوا بول دیں۔ بڑے منظم طریقے سے ہم کیمپ میں داخل ہو گئے مگر وہ تو خالی تھا۔

یہ کیمپ دراصل تین بڑے شامیانوں سے بنایا گیا تھا اور اُس میں ایک بہت بڑی گھنٹی بھی لگی ہُوئی تھی۔ گھاس پھُوس کی ایک کُٹیا بھی تھی جسے ڈاکو باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایک شامیانے میں آٹا، چاول، دالیں، کھانڈ، گھی کے کنستر اور دو بڑے بڑے تکونی صندوق تھے جو رائفلوں کی گولیوں سے بھرے ہُوئے تھے۔ ایک اور صندوق میں تقریباً بارہ بندوقیں تھیں۔ دوسرے دونوں شامیانے خوابگاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور اُن میں کمبل، میلی کچیلی چادریں اور کپڑے تھے۔ قریب ہی ایک درخت سے تین ذبح شدہ بکریاں لٹکی ہُوئی تھیں۔

ہم نے خیال کیا جب مچان پر بیٹھے ہُوئے دونوں آدمی کیمپ میں پہنچے ہوں گے تو یقیناً وہاں افراتفری پھیل گئی ہوگی۔ ممکن تھا کچھ ڈاکو نزدیک ہی کہیں گھاس میں چھپ گئے ہوں، اس لیے ہم نے اپنی سپاہ کو ایک لمبی قطار میں منظم کیا اور گھاس کی تلاش شروع کر دی۔ مَیں نے کیمپ کے ساتھ والے نالے میں نگاہ ڈالی تو دس بارہ آدمیوں کے نشاناتِ قدم دکھائی دیے۔ نالہ پندرہ فٹ چوڑا اور تقریباً پانچ فٹ گہرا تھا۔ مَیں، فریڈی اور اینڈرسن نے اس نالے کے ساتھ ساتھ چند سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ لمبی لمبی گھاس میں پاؤں کے نشانات گُم ہو گئے۔ کچھ دُور آگے نالے کے بائیں کنارے پر ایک بہت بڑا پھلدار درخت تھا۔ اُس کی زمین تک پھیلی ہُوئی شاخوں نے آدمیوں کے چھُپنے کا بہترین سامان مہیا کر دیا تھا۔

ہم نالے کے دوسری طرف سے ہو کر اُس درخت کے نزدیک جا پہنچے۔ عین اُس وقت کیمپ کی طرف سے بندوقیں چلنے کی آواز سُنائی دی۔ ہم فوراً اُس طرف بھاگے۔ کیمپ کے نزدیک پہنچ کر معلوم ہُوا کہ ہمارا ایک حوالدار گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ ساتھ ہی ایک ڈاکو زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں شدید زخمی تھیں، جن پر اُس نے کپڑا باندھ رکھا تھا۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے پہلو بائیں جانب گولی کا نشان تھا جہاں خُون جما ہُوا تھا۔ ڈاکو نے بوتل کھولی اور حوالدار کے مُنہ سے لگا دی مگر حوالدار نے واپس کر دی کہ جناب، ساری زندگی مَیں پرہیزگار رہا ہوں، اب اللہ کے حضور شراب کی بُو لیے جانا پسند نہیں کرتا۔ پیاس ضرور لگی ہے لیکن مَیں یہ حرام شے نہیں پیوں گا۔ پانی سے لا دیجیے۔

اُس کا بھائی اُس کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ اُس نے اپنا ہیٹ اُتارا اور نالے کے گدلے پانی سے بھر لایا۔ زخمی حوالدار نے وہ بغیر ہچکچاہٹ کے پی لیا۔ اُدھر زخمی ڈاکو نے شراب کی پُوری بوتل خالی کر دی۔ حوالدار کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ مَیں نے اُسے دلاسہ دیتے ہُوئے کہا: "حوالدار صاحب! حوصلہ رکھیے، نجیب آباد پہنچنے پر ڈاکٹر آپ کے زخم کو مندمل کر دے گا۔" اُس نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا: "جناب! کوئی ڈاکٹر مجھے موت کے مُنہ سے نہیں بچا سکتا۔"

کیمپ کی تلاشی لینے کے بعد ہم نجیب آباد کی طرف چل پڑے۔ ڈاکو تو راستے ہی میں خُون کی کمی سے مر گیا اور حوالدار ہسپتال میں چل بسا۔ افسوس یہ رہا کہ ہمارا اتنا بڑا منصوبہ صرف ایک جذباتی آدمی کی شتابی کے باعث ناکام ہو گیا۔

تین دن بعد ہمیں سُلطانہ کی طرف سے ایک پیغام موصول ہُوا جس میں اُس نے کہا کہ اگر پولیس کے لیے رائفلیں اور اسلحہ درکار تھا تو کہلا بھیجتے مَیں یہ چیزیں آپ تک پہنچا دیتا۔ آپ کو اتنے بڑے حملے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اب بھی اگر ضرورت پڑے تو میری خدمات حاضر ہیں۔ اسلحہ آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔

فریڈی کو بڑی تشویش ہُوئی کہ سُلطانہ کو یہ اسلحہ کون بہم پہنچاتا ہے۔ اُس نے احکام جاری کر دیے کہ آئندہ اگر کسی نے سُلطانہ کو اسلحہ فراہم کرنے کی کوشش کی تو اُس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ اُدھر اسلحے کے ڈیلر اس بات سے خائف تھے کہ اگر اُنہوں نے سُلطانہ کو اسلحہ فراہم نہ کیا تو وہ اُن کے گھر لُوٹ لے گا، اس لیے اُنہوں نے حکومت کے احکامات بالائے طاق رکھ دیے۔

ہمارے ناکام حملے کے بعد سُلطانہ نے بھور اور تُرائی کے جنگلوں میں لُوٹ مار کی انتہا کر دی۔ اُس نے اب اپنے گروہ کی تعداد چالیس تک محدود کر دی۔ یہ چالیس آدمی بالکل جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

فریڈی نے خیال کیا سُلطانہ کے ہتھیار ڈالنے کا اب وقت آ گیا ہے۔ حکومت سے منظوری لینے کے بعد اُس نے سُلطانہ کو ایک میٹنگ میں بُلانے کا اہتمام کیا۔ سُلطانہ نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی۔ دن، وقت اور جگہ کا تعیّن ہو گیا۔ طے پایا تھا کہ سُلطانہ اور فریڈی دونوں بالکل غیر مسلح اور اکیلے ہوں۔ مقررہ دن فریڈی ایک وسیع و عریض وادی میں ایک درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ سُلطانہ دوسری طرف سے آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑے دوستانہ ماحول میں ملے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ سُلطانہ نے فریڈی کو تربوز پیش کیا۔ بات چیت شروع ہو گئی۔ خاصی طویل گفتگو کے باوجود وہ ایک دوسرے کی شرائط پر متفق نہ ہو سکے۔ فریڈی کا اصرار تھا کہ سُلطانہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے لیکن اُسے یہ بات منظور نہ تھی۔

گفتگو جب ناکام ہو گئی تو سُلطانہ نے فریڈی سے گزارش کی کہ وہ خواہ مخواہ اُس کی گرفتاری کے لیے خطرات مول نہ لے۔ اُس نے فریڈی کو بتایا کہ دورانِ حملہ مَیں اور میرے دس ساتھیوں نے بھاگ کر نیم کے درخت میں پناہ لی۔ ہم سب مسلّح تھے جس وقت تم اور تمہارے دو ساتھی نالے کے ساتھ ساتھ اُدھر آ رہے تھے، ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تمہارے ایک آدمی نے جب درخت پر چڑھنے کی جسارت کی تو ہم سب چوکنے ہو گئے اور ہم نے اپنی رائفلیں لوڈ کر لیں۔ اگر تم اُس وقت ہمیں پکڑنے کی کوشش کرتے تو ہم تینوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیتے۔ گفتگو ختم ہُوئی اور دونوں اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے گئے۔

فریڈی نے اب اپنے دُشمن پر آخری زوردار ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے مجھے اور وائن ڈھیم کو ہردوار بُلا لیا۔ سُلطانہ اور اُس کے باقی ماندہ گروہ نے نجیب آباد کے جنگل میں ایک مویشی خانے میں بسیرا کر لیا تھا۔ فریڈی کا پروگرام یہ تھا کہ کسی چاندنی رات وہ دریائے گنگا میں سے کشتیوں کے ذریعے اپنی پُوری سپاہ جنگل میں پہنچا دے اور جاتے ہی مویشی خانے کا محاصرہ کر لیا جائے۔

مقررہ دن مَیں، فریڈی، وائن ڈھیم نے تین سو سپاہیوں کے ہمراہ کشتیوں پر اُس وقت دریائے گنگا پار کیا جب شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ دریا کے بائیں کنارے ہم نے ایک دُشوار گزار نالے میں کشتیاں ڈال دیں۔ کشتیاں نہایت سُبک رفتاری سے چل رہی تھیں مگر بتدریج نالے کا پاٹ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں کنارے چٹانی تھے جن سے کشتیاں ٹکرا جانے کا خطرہ درپیش تھا۔ پھر ہم نے بلندی سے گرتے ہوئے پانی کی آواز سُنی۔

میری کشتی سب سے آگے تھی اور پانی کے تیز بہاؤ کی زد میں آ سکتی تھی۔ اتنے میں کیپٹن نے آواز دی کہ ہماری کشتی کو چٹانی کنارے سے بچایا جائے۔ عین اُس وقت ہماری کشتی کا ملّاح اُچھل کر کنارے جا کھڑا ہُوا اور ندی کے ساتھ اُگے ہُوئے درخت سے اُس نے کشتی باندھنی شروع کر دی۔ اس طرح ایک ایک کر کے تمام کشتیاں درختوں سے باندھ دی گئیں۔

چاند نکل آیا تھا۔ اچانک ہمارا آمنا سامنا ایک دیوانے ہاتھی سے ہو گیا جس کے متعلق ہم نے پہلے ہی سُن رکھا تھا۔ اُس کی سونڈ اُوپر اُٹھی ہُوئی، کان باہر کی طرف تنے ہُوئے اور مُنہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ اب تک یہ ہاتھی کئی آدمیوں کو اپنے پاؤں تلے کُچل چکا ہے۔ ہاتھی پہلے تو سونڈ لہراتا ہُوا ہماری طرف چند گز بڑھا مگر پھر ندی کے ساتھ ساتھ جنگل میں غائب ہو گیا۔

ایک میل چلنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں نرم نرم گھاس اُگی ہُوئی تھی۔ اس نرم گھاس پر چاندنی رات میں چلنا بہت ہی پُرلطف تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہم اپنی گزشتہ

ساری تکالیف بھول گئے۔ عین اُس وقت درخت پر بیٹھے ایک مور نے خطرے کی آواز نکالی۔ چند لمحے بعد دو چیتے نمودار ہُوئے مگر وہ ہمیں دیکھتے ہی جنگل میں غائب ہو گئے۔

گھنے اور تنگ درختوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ندی کنارے پہنچے جہاں پیپل کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ گائیڈ نے ہمیں اُس درخت کے نیچے بٹھا دیا اور خود اپنے بھائی کے ساتھ آگے چلا گیا۔ بھوک ہمیں ستا رہی تھی۔ میرے سگریٹ بھی ختم ہو چکے تھے۔ صبح کے دُھندلکے میں گائیڈ نے واپس آکر بتایا کہ سُلطانہ نے اب اپنے گروہ کی تعداد کم کر کے صرف نو کر دی ہے۔ آج وہ ہردوار کے کسی گاؤں کی غارتگری کے لیے مویشی خانے سے چلے گئے ہیں اور اُن کی واپسی آج شام یا کل متوقع ہے۔ ہم نے خوراک تلاش کرنے کا ارادہ کیا تو گائیڈ نے متنبہ کیا کہ یہ علاقہ سُلطانہ کا ہے۔ نقل و حرکت ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمیں اپنی پناہ گاہ سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں جانا چاہیے۔

اس طرح دوسرا طویل اور صبر آزما دن بھی ختم ہو گیا۔ وائن ڈھیسم کے ہمارے پاس قیام کا یہ آخری دن تھا کیونکہ اُسے اگلے دن نریندر نگر کے حاکم سے ملاقات کرنا تھی۔ رات کے پہلے پہر گھاس سے لدے ہُوئے دو ریڑھے ہمارے پاس آئے۔ گھاس ہٹائی گئی تو نیچے سے بھُنے ہُوئے چنوں کی چند بوریاں نظر آئیں۔ یہ راشن مقدار میں بہت کم تھا مگر فوراً تمام سپاہیوں میں بانٹ دیا گیا۔

عین وقت مَیں نے چند سو گز کے فاصلے سے چیتے کی آواز سُنی جس نے غالباً ایک چیتل شکار کیا تھا۔ بہترین کھانا حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ مَیں فوراً اُٹھا اور فریڈی سے بندوق مانگی۔ مَیں چیتے کے شکار چیتل کی پچھلی دونوں ٹانگیں کاٹ کر لانا چاہتا تھا۔ فریڈی نے اس سے اتّفاق نہ کیا۔ میرے ساتھی جنگل اور جنگل میں رہنے والی مخلوق کے اُصولوں سے نابلد تھے۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ چیتے سے اُس کا شکار کیسے چھینا جا سکتا ہے۔ بقیہ رات کسی مزید خوف و ہراس کے بغیر گزر گئی۔ صبح ہوتے مَیں اور وائن ڈھیسم نے ہردوار کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہم نے دریائے گنگا ڈیم بنگلے کے مقام پر عبور کیا۔ وہیں مچھلی سے تیار شدہ کھانا کھایا جسے ہم کبھی نہیں بھُلا سکتے۔

اگلی صبح عین اُس وقت جب وائن ڈھیسم پروگرام کے مطابق نریندر نگر جا رہا تھا اور مَیں اپنے بھُوکے ساتھیوں کے لیے اشیائے خورد و نوش جمع کر رہا تھا، ایک ہانپتے کانپتے آدمی نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ فریڈی نے سُلطانہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ گزشتہ شام سُلطانہ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور اُس کے سب مسلح ساتھیوں نے اپنا اسلحہ اُتار کر رکھ دیا اور سو گئے تو اُس وقت نہایت خاموشی سے فریڈی رینگتا ہُوا سُلطانہ کی کُٹیا میں داخل ہو گیا۔ وہاں فریڈی کو ایک آدمی چادر اوڑھے چارپائی پر سویا نظر آیا۔ وہ فوراً اُس کے اُوپر جا کر بیٹھ گیا۔ سُلطانہ کے لیے ۲۸۴ پونڈ کا وزن ہٹا کر پھینکنا ناممکن تھا۔ وہ خودکشی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فریڈی نے اُسے کوئی بھی ہتھیار نہ نکالنے دیا۔ کُٹیا کے اندر موجود چار ڈاکو تو سُلطانہ سمیت گرفتار ہو گئے مگر باقی دو پولیس کے محاصرے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

مجھے صحیح اندازہ نہیں کہ سُلطانہ نے کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جب اُسے جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تو اُس نے فریڈی کو بُلایا اور اپنے بال بچّے نیز اپنا بہت پیارا کُتّا اُس کی سرپرستی میں دے دیے جو قلعہ نجیب آباد میں قیام پذیر تھے۔ فریڈی نے سُلطانہ کے بیوی بچّوں کا بار سر پر اُٹھایا اور جس طریقے سے اپنا وعدہ نبھایا وہ قابلِ ستائش ہے۔

چند ماہ بعد فریڈی کو عہدے میں ترقّی مل گئی اور بادشاہ سلامت نے اُسے سی آئی ای بنا دیا۔ ایک دن مراد آباد میں سالانہ ہفتۂ پولیس کے موقع پر پریڈ کا معاینہ کر رہا تھا کہ اُس کا اردلی نہایت اہم خبر لے کر آ گیا۔ وہ مراد آباد کے ریلوے اسٹیشن پر چہل قدمی کر رہا تھا جب ایک گاڑی آ گئی اور اُس میں سے مسافر اُترنا شروع ہُوئے۔ دو آدمی اُس کے نزدیک اُترے۔

...ہی اُنھوں نے اپنے مُنہ پر نقاب چڑھا لیے۔ اُس نے ...دونوں آدمیوں پر نگاہ رکھی جو اپنا سامان اُتارنے میں مصروف ...سامان اُتار لینے کے بعد وہ مسافر خانے میں آرام کرنے ... اردلی نے اسٹیشن ماسٹر کو تاکید کہ ان دونوں آدمیوں ...ہیں نہ جانے دیا جائے اور خود فریڈی کی طرف بھاگا۔ ...دراصل یہ دونوں آدمی سُلطانہ کے وہ دو مفرور ساتھی تھے ... کے وقت پولیس کے نرغے سے بچ نکلے تھے۔ اُن کے ...اور پہلوان تھے۔ فرار ہوتے وقت اُن میں سے ایک ...پر زخم آ گیا تھا۔ اُس نے نجیب آباد کے اسپتال سے ...علاج کرایا اور بہانہ بنایا کہ یہ زخم دراصل کُتّے کے کاٹنے ...کا ہے۔ پولیس کے ایک آدمی نے پہچان لیا تھا کہ یہ زخم گولی ...۔ صوبے بھر کی پولیس چوکنا کر دی گئی تھی کہ اُس آدمی کو فوراً ...است لایا جائے جس کے ناک پر زخم کا نشان ہے۔ یہ ...مفرور ملزم بھی قتل کے بہت سے مقدمات میں ملوث ...

فریڈی اپنے اردلی کی یہ کہانی سُنتے ہی فوراً اپنی کار میں ...پولیس اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ اُس نے اسٹیشن کے ...راستوں پر پہرہ لگا دیا اور خود مسافر خانے میں چلا گیا۔ وہاں ...آدمیوں سے پُوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ اُنھوں ...ہم سوداگر ہیں اور بریلی سے پنجاب جا رہے ہیں۔ اس ...فریڈی نے سوال اُٹھایا کہ اگر اُنھوں نے پنجاب ہی جانا تھا ...گاڑی کا انتخاب کیوں کیا جسے مراد آباد اسٹیشن پر آ کر ...۔ اُنھوں نے جواب دیا: "جناب! ہم بریلی اسٹیشن پر ...وہاں پر دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ہم غلطی سے اس گاڑی ...سوار ہو گئے۔" جب فریڈی کو پتہ چلا کہ دوسری گاڑی پر سوار ...کے لیے اُنھیں ایک رات قیام کرنا ہو گا تو فریڈی نے ...مہمان بنانے کی پیش کش کی۔ ایک لمحہ تو وہ ہچکچائے مگر پھر ...ہی جواب دیا: "جیسے آپ کی مرضی، جناب!"

اُس نے دونوں آدمی کار میں بٹھا لیے اور کار آہستہ آہستہ ...شروع کر دی۔ راستے میں فریڈی نے اُن سے بے شمار سوالات کیے مگر اُنھوں نے ہر سوال کا فوراً اور برجستہ جواب دیا۔ پھر اُنھوں نے فریڈی سے پُوچھا: "کیوں جناب! یہاں کی یہی روایت ہے کہ افسر یہاں آکر چکّر لگائیں اور مہمانوں کو ساتھ لے جائیں جبکہ اُن کا سامان اسٹیشن پر موجود اور آدمی لُوٹ کر لے جائیں۔" فریڈی کے ذہن میں بار بار یہ سوال اُٹھتا کہ یہ دونوں آدمی اگر سوداگر ہیں اور سُلطانہ کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تو ان کی گرفتاری بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ وہ انھی خیالات میں غرق تھا کہ گاڑی بنگلے جا پہنچی۔

فریڈی اور کُتّوں سے بہت پیار تھا اور کُتّوں کو فریڈی سے بڑا اُنس تھا۔ جونہی گاڑی بنگلے میں داخل ہُوئی تمام کُتّوں نے بھاگ کر اُس کا والہانہ استقبال کیا۔ ان کُتّوں میں سُلطانہ کا کُتّا بھی شامل تھا۔ اُس نے اُن دونوں آدمیوں کو دیکھا تو بھاگ کر اُن کے قدموں میں گر گیا۔

ایک لمحہ فریڈی اور دونوں آدمیوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پھر پہلوان، جو اپنے انجام سے فوراً آگاہ ہو گیا تھا، نیچے جُھکا اور کُتّے کو پیار سے تھپتھپایا، پھر بولا: "اس سچے گواہ کے سامنے جھُوٹ بولنا کس کام کا؟ ہم ہی وہ آدمی ہیں جن کے متعلق آپ قیاس آرائیوں میں کھوئے ہُوئے ہیں۔" اس پر اُنھیں باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔

سُلطانہ پر مقدمہ چلایا گیا جس میں وہ قصوروار نکلا اور اپنے جُرم کی پاداش میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کاش! حکومت سُلطانہ کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر گلیوں اور بازاروں میں نہ پھراتی اور ایسے لوگوں کو اُس بہادر آدمی پر آوازے کسنے کا ہرگز موقع نہ دیتی جو اُس کا نام سُن کر ہی تھر تھر کانپ اُٹھتے تھے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ اُسے اتنی سخت سزا بھی نہ دی جاتی، کیونکہ اُس نے کبھی کسی غریب کو تنگ نہیں کیا تھا۔ مَیں سُلطانہ کا آج تک ممنون ہُوں کہ اُس نے ہم پر اُس وقت گولی نہ چلائی جب مَیں نیم کے درخت پر چڑھنے کی جسارت کر رہا تھا، حالانکہ وہ بڑی آسانی سے ہم تینوں کو اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔ ●●

روشن چہرے

صبرِ جمیل کی کہکشاں

آنکھوں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے مناظر دیکھے جنھوں نے قرونِ اُولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔

حافظ افروغ

عبد اللہ طاہر سیال کے ماں باپ منڈی صادق آباد میں مقیم ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اس نے اپنے ماموں زاد بھائی حمید احمد کو اپنے ساتھ صادق آباد چلنے پر آمادہ کر لیا۔ پروگرام کے مطابق دونوں بھائی، ۲۷ ستمبر کو علی الصبح ساڑھے چار بجے لاہور سے روانہ ہُوئے۔ کار وہ خود چلا رہے تھے۔ دس بجے کے قریب کبیر والا پہنچے۔ یہاں طاہر کے چچا محمد نواز سیال رہتے ہیں۔

کبیر والا میں دونوں بھائیوں نے آرام کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور دو بجے کے قریب پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب اُن کی کار دُنیا پور کے قصبے کے چوراہے کے قریب پہنچی تو بائیں جانب سے سامان سے لدا ہُوا ایک تیز رفتار ٹرک آیا۔ ٹرک اور کار کی پوزیشن اُس لمحے کچھ ایسی تھی کہ اُن میں تصادم یقینی تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے کار کو حادثے سے بچانے کے لیے ایک دم بریک لگا دی۔ بریک لگاتے ہی ٹرک ایک سمت دھماکے کے ساتھ اُلٹ گیا اور اُسی کار پر جا گرا جسے بچانے کے لیے ڈرائیور نے بریک لگا کر ایک ہولناک خطرہ مول لیا تھا۔

یہ ناگہانی تصادم اتنا خوفناک تھا کہ کار میں سوار دونوں نوجوان موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ کار بُری طرح کچلی گئی تھی اور اُس میں جسم جھلس اور پھنس گئے تھے۔ مقامی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ گاڑی کے کاغذات سے اُسے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ حادثے میں ہلاک ہونے والے نوجوان کون ہیں اور اُن کا تعلق کس خاندان سے ہے؛ چنانچہ حادثے کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون اہلِ خاندان کو لاہور بھی دے دی گئی اور صادق آباد میں بھی۔

یہ سانحہ اتنا درد انگیز تھا کہ اس کی خبر سُنتے ہی انسان تڑپ کر کانپ اُٹھتا تھا۔ تقریباً شام سات بجے اس کی اطلاع عزیزم سعادت اعجاز نے مجھے اچھرے میں دی۔ سنتے ہی تمام جسم لرز گیا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ کی مشینری نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ رگوں میں خُون کی گردش رُک گئی ہے اور تمام اعصابی نظام معطل ہو گیا ہے۔

عبد اللہ طاہر سیال جو اکتیس سالہ نوجوان تھا، انجنیئرنگ میں اُس کی قابلیت اور مہارت قابلِ رشک تھی۔ قدرت نے اسے ذہانت و فطانت کی نعمتوں سے فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔ بہت دل[illegible] اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ چہرے پر سیاہ مگر نُورانی ڈاڑھی ساتھ ساتھ متانت اور سنجیدگی کار فرما رہتی۔

یہ نوجوان اللہ بخش سیال کا لختِ جگر، ڈاکٹر اسرار احمد کا بھانجا اور اُن کے چھوٹے بھائی اقتدار احمد کا داماد تھا۔ اللہ [illegible] پانچ بچے بھی عطا کر دیے تھے۔

دوسرا نوجوان حمید احمد جس کی عمر صرف چوبیس ۲۴ سال تھی، اقتدار [illegible] کی آنکھوں کا نُور اور ڈاکٹر اسرار احمد کا داماد تھا۔ ننھے منّے دو معصوم [illegible] کی پرورش و تربیت کی ذمّے داری بھی ربِّ کریم نے اُس کے سپرد کر [illegible] تھی۔ یہ نوجوان اعلیٰ درجے کی ذہنی، فکری، علمی اور فنی صلاحیتوں [illegible] آراستہ اور اسلامی اخلاق کی دلنواز خوبیوں سے پیراستہ تھا۔ چہرے [illegible] چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی دل کے اُس جذبۂ صادق کی علامت تھی کہ [illegible] رسول ﷺ کی اتباع ہی ایک مسلمان کی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس [illegible]

اس دلگداز المیے کی خبر سُن کر مَیں فوراً برادرِ محترم حاجی گُل حسن صاحب کے ہمراہ اقتدار احمد کے مکان افغانی روڈ سمن آباد پہنچا۔ وہاں خاندان کے سبھی افراد جمع تھے۔ ان سوگواروں میں مرحوم حمید احمد کے والد، تایا، چچا اور بھائی بھی موجود تھے، صبر کا دامن تھامے ہوئے مشیّتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے۔ کرب و اضطراب اور غم و اندوہ کے آثار چہروں پر نمایاں ضرور تھے، مگر کیا مجال کہ زبان سے بے چینی اور بےقراری کا ایک لفظ بھی ادا ہُوا ہو یا کوئی اضطراری حرکت سرزد ہوئی ہو۔

غم و کرب کی یہ سیاہ اور تاریک رات گھر والوں نے جس طرح گذاری اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تقریباً چار بجے صبح نوجوانوں کی لاشیں گھر پہنچیں۔

یہ وہی وقت تھا جب یہ دونوں نوجوان ایک دن پہلے اپنے گھر سے خوشی خوشی سفر پر روانہ ہوئے تھے اور آج چوبیس گھنٹوں بعد واپس آئے تو پورا ماحول سوگوار تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل بےقرار تھا۔ ایسے موقع پر بڑے بڑے حوصلہ مند انسانوں کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے ــــــ مگر گھر والوں نے جس جرأت و تحمل اور صبر و تسلیم کا مظاہرہ کیا وہ ایک عام آدمی کے لیے حیرت انگیز بھی تھا اور سبق آموز بھی۔

ان جواں مرگ نوجوانوں کی میتوں کو اُن کے بزرگوں اور عزیزوں نے خود غسل دیا۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے نزدیک یہی پسندیدہ اور مستحسن طریقہ ہے۔ حادثے کی شدت نے جسم بُری طرح کچل دیے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھے۔ غم کی شدت سے کلیجے مُنہ کو آ گئے۔ رنج و الم کی بے پایاں تپش سے دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگے مگر زبانیں خاموش تھیں اور غسل دینے اور کفنانے کے سارے مراحل پُورے سکون و قرار سے پُورے ہُوئے۔

تقریباً صبح سات بجے طاہر سیال کے ماں باپ بھی پہنچ گئے۔ یہ پہلے صادق آباد میں اپنے بیٹے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ پہنچا تو اُسے ملنے خود لاہور آ گئے۔ وہ صرف ملنے ہی نہیں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے آئے تھے، کیونکہ اُس کے مالک نے اُسے واپس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور امین کا کام ہی یہ ہے کہ جب اُس سے امانت واپس طلب کی جائے تو اسے ادا کرنے اور واپس دینے میں کسی قسم کے عذر اور ہچکچاہٹ سے کام نہ لے۔

عبد اللہ طاہر سیال کے والد اللہ بخش سیال سے ملاقات ہُوئی۔ جوان بیٹے کی اچانک اور حادثاتی موت کے اس کرب ناک اور دردناک موقع پر صبر و قناعت اور توکل علی اللہ کے مومنانہ طرزِ عمل نے اُن کے چہرے کو نُورانی بنا دیا تھا۔

ساڑھے نو بجے اس گھر سے بیک وقت دو نوجوانوں کے جنازے اُٹھے۔ یہ وقت قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر گھروں میں محشر سا بپا ہو جاتا ہے۔ گریہ و زاری، آہ و بکا اور نالہ و شیون کا ایک ایسا شور اُٹھتا ہے کہ پتھروں کے دل بھی پھٹ پڑتے ہیں مگر اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں نے اس نازک اور جان لیوا موقع پر جس ضبط و تحمّل، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا ثبوت دیا وہ دیدنی بھی تھا اور قابلِ اتباع بھی۔ آہوں کا شور نہ شکوہ و شکایت کی فلک شگاف چیخیں۔ ماتم کی صدائیں نہ سینہ کوبی کی آوازیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امانتیں مالک کے حوالے کرنے کا عمل بڑے سلیقے اور وقار سے انجام پا رہا ہے۔

اس گھر کی خواتین نے جو مثالی کردار ادا کیا وہ قابلِ تحسین ہے اور لائقِ رشک بھی۔ ان غمزدہ اور سوگوار عورتوں میں اللہ کو پیارے ہو جانے والے نوجوانوں کی مائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ خالائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ بیویاں بھی تھیں اور پھوپھیاں بھی۔ ان سب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں اُمڈا ہُوا تھا جو درد و غم سے چُور دلوں کا ترجمان تھا۔ وہ سب کی سب مجسمۂ صبر اور پیکرِ تسلیم و رضا بنی ہُوئی تھیں۔

صبر و ضبط اور تحمل و بُردباری کے محیّر العقول واقعات تاریخ کے اوراق میں پڑھے ضرور تھے مگر آنکھوں سے ایسے مناظر دیکھنے کا موقع کم ہی ملا تھا۔ ماتم کی مجلس میں ایمان پرور مناظر دیکھ کر اس یقین میں پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی کہ اسلام کے نظریے، اُس کے فلسفے اور اُس کے عقیدے میں ایک ایسی معجزانہ قوت ہے کہ جو اسے سوچ سمجھ کر اپنا لیتا ہے تو اُس کی رُوح میں وہ بالیدگی، اُس

کے دل میں وہ ہمت و وسعت، اُس کے ذہن میں وہ ارجمندی اور اُس کے جسم میں وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر وہ سخت سے سخت آزمائش اور شدید سے شدید مصائب کا پامردی اور حوصلہ جُرأت سے مقابلہ کرنے کی اپنے اندر سکت بھی پاتا ہے اور سلیقہ بھی۔ کچھ یہی حالت اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں کی تھی۔

صبرِ جمیل کی اس بے مثل کیفیت پر دل کی آنکھیں کسی حجاب کے بغیر یہ مشاہدہ کر رہی تھیں کہ قرآن مجید کی بشارت ان گھر والوں کی بلائیں لے رہی ہے اور مدبھرے سُروں میں بلند ترین مراتب و انعامات کا مژدہ سُنا رہی ہے۔ کتنی پیاری اور جاں نواز ہے یہ بشارت!

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ اُنہیں خوشخبری دے دو، اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔" (سورہ بقرہ)

اس موقع پر دل کی گہرائی سے یہ دُعا نکل رہی تھی کہ الٰہ العالمین جس طرح ان نوجوانوں کے لواحقین نے صبرِ جمیل کا دامن مضبوطی سے تھام کر تیری رحمت کو دعوت دی ہے، اسی طرح تُو ان کی اچانک اور ناگہانی موت کو شہادت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اور اعزاز عطا فرما اور جنت الفردوس کی نُورانی اور شاداب بہاروں کو ان کا مسکن بنا جیساکہ شہدائے کے متعلق خود تیرا اعلان ہے:

"جو شخص اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، اُنہیں مُردہ نہ کہو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان اُن کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، اُن کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اُس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور اُن کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع

اگر حضورؐ نے بطور عتاب بھی کوئی کلمہ فرمایا تو روایت کرتے وقت صحابہؓ وہ لفظ بھی بطور لذّت نقل کیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا وَ اِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ یعنی جو مَیں کہہ رہا ہُوں بات اسی طرح ہے اگرچہ اس سے ابُوذر کی ناک خاک میں رگڑی جائے۔ حضرت ابوذرؓ جب یہ حدیث روایت کرتے تو ان الفاظ کو بھی خُوب مزے لے لے کر بیان کرتے۔
(حُجّیتِ حدیث ــــ مولانا محمدؐ ادریس کاندھلوی)

نہیں کرتا۔" (سورہ آلِ عمران)

اسلام کے سایۂ عاطفت میں آجانے والا خوش قسمت انسان اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت و رہنمائی کے لیے جس ذات کی طرف دیکھتا ہے وہ اللہ کے محبوب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ بابرکت ہے۔ غم ہو یا خوشی، امن کا دَور ہو یا میدانِ کارزار، خاندان اور رشتہ داروں کے معاملات ہوں یا قومی سطح کے سیاسی امور، ہر معاملے اور ہر شعبے میں اسی ذاتِ اقدس کی تعلیم اور ہدایت سرچشمۂ فیض و برکت ہے۔ اسی در سے دلوں کو سکون و قوت اور عملی زندگی کو راستی و ہمواری نصیب ہوتی ہے۔

انسانیت کے اس محسنِ اعظم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی ایسے اتفاقات رُونما ہُوئے جب موت نے آپؐ کے چہیتے عزیز اور دل کے ٹکڑے آپ سے چھین لیے، آپ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایسے مواقع پر آپؐ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اور اپنی اُمّت کے سامنے جو نمونہ پیش کیا اُس کی اتّباع پُوری اُمّت کے لیے موجبِ سعادت اور باعثِ رحمت ہے۔ ان کی چند جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں:

حضرت حمزہؓ کی شہادت

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے چچا، ہم عمر اور دُودھ شریک

بھائی تھے۔ غزوۂ احد میں خدا کی راہ میں بہادری اور جرأت سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ دُشمنوں نے شقاوت اور بدبختی کی حد کر دی۔ بجوشِ انتقام میں آپ کے جسم کا مُثلہ کیا اور کلیجہ چبا لیا۔ حضورؐ اپنے محبوب چچا کے جسم کی یہ حالت دیکھ کر شدّتِ غم سے حُزن و ملال کی تصویر بن گئے۔

حضرت صفیہؓ کو اپنے بھائی کی شہادت اور لاش کے ساتھ کافروں کے بہیمانہ سلوک کی اطّلاع ملی تو وہ مدینے سے خود میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ حضورؐ نے اُن کے بیٹے حضرت زبیرؓ کو ہدایت کی کہ بہن اپنے بھائی کی لاش نہ دیکھنے پائے۔ آپؐ کا یہ پیغام سُن کر بولیں کہ مجھے اپنے بھائی کے متعلق تمام حالات کا علم ہو چکا ہے لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ کی طرف سے اجازت ملنے پر لاش پر گئیں۔ خُون کا جوش تھا، پیارے بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہُوئے تھے۔ فرطِ الم سے تڑپ اُٹھیں لیکن زبان سے صرف اتنا کہا:

"ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔"

اس جنگ میں حضورؐ کے ستر جاں نثار ساتھی کام آئے تھے، اس لیے آپؐ جب تشریف لائے تو پُورا شہر ماتم کدہ بنا ہُوا تھا۔ آپؐ جس طرف سے گزرتے ماتمی چیخ پکار کی آوازیں گھروں سے آتی ہُوئی سُنتے۔

عرب کا دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتیں، کپڑے پھاڑ ڈالتیں، چہروں پر تھپیڑ مارتیں اور چیخیں چلّاتیں۔ ماتم کا یہ دل دوز منظر دیکھ کر رقّت کے جوش میں حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا:

"حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔"

انصارِ مدینہ یہ سُن کر تڑپ اُٹھے۔ اُنہوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ حضورؐ کے دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کریں۔ آپؐ گھر تشریف لائے، دیکھا دروازے پر عورتوں کی ایک بھیڑ جمع ہے اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند ہے۔

حضورؐ نے اُن کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

"عرب کے قدیم رواج کے مطابق ماتم کرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ آج سے کسی مُردے پر ماتم نہ کیا جائے۔" (بخاری)

تمام محدثین کا اس بات پر اتّفاق ہے کہ اُسی دن سے مُردے پر نوحہ و بین اور ماتم کی پُرانی رسم بند ہو گئی۔

سیّدہ رقیہؓ کی وفات

حضورؐ ابھی بدر ہی کے میدان میں تھے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی حضرت رقیہؓ چیچک کی بیماری سے رحلت فرما گئیں۔ جب اُن کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی عین اُس وقت حضرت زیدؓ بن حارثہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینے میں داخل ہُوئے۔

رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی لختِ جگر کی وفات کی خبر پا کر بہت مغموم ہُوئے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؐ اپنی بیٹی کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"عثمان بن مظعون جا چکے ہیں۔ اب تم بھی اُن سے جا ملو۔"

حضرت عثمانؓ بن مظعون پہلے مہاجر تھے جنہوں نے مدینے میں آ کر وفات پائی تھی۔

حضورؐ کے یہ رقّت آمیز الفاظ سُن کر عورتوں نے ماتم کا ایک کہرام برپا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں روکنا چاہا۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"عمر! انہیں رونے دو۔ دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں، البتہ نوحہ اور بین سے بچنا چاہیے۔"

حضرت فاطمہ الزہراؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر سے اُن کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

سیّدہ اُمِ کلثومؓ موت کی آغوش میں

شعبان ۹ھ میں آپؐ کی محبوب بیٹی حضرت اُمِ کلثوم، جو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، پیامِ اجل کو لبیک کہتے ہُوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اُن کے کفن کے لیے حضورؐ نے اپنی

چادر عنایت فرمائی۔ خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپؐ کی اجازت سے حضرت علیؓ، حضرت ابوطلحہؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت فضلؓ بن عباسؓ نے سیّدہ کو قبر میں اُتارا۔ جب سیّدہ اُمّ کلثوم کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا اُس وقت حضوؐر قبر کے پاس موجود تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔

حضوؐر کا نواسہ عالمِ نزع میں

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیّدہ زینب کا بچہ بیمار ہُوا اُس کی حالت غیر ہوگئی۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی۔ آپؐ اپنی بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت سعدؓ بن وقاص آپؐ کے ہمراہ تھے۔ بچہ آپؐ کے پاس لایا گیا۔ اس پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ لختِ جگر کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ! یہ کیا؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ رحمت و شفقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ خدائے رحیم اپنے انہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو مہربان، شفیق اور رحمدل ہوتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

حضوؐر کا نورِ چشم، موت کے دروازے پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہُوئے۔ آپؐ کو اُن کی ولادت کی اتنی خوشی ہُوئی کہ پیدائش کی خبر لانے والے ابورافع کو بطورِ انعام ایک غلام عطا فرمایا اور اُن کی دایہ یعنی دُودھ پلانے والی اُمِّ بردہ کو کھجوروں کا ایک باغ بخشا۔ حضرت ابراہیم کی عُمر ابھی ۱۶ ماہ ہی ہُوئی تھی کہ مالکِ حقیقی کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ بیمار ہُوئے حضوؐر کو خبر ملی اور اپنے بچے کے پاس گئے۔ اُن پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ حضوؐر نے اُنہیں اپنی گود میں لیا اور اُس نازنین نے اپنے عظیم باپ کی آغوشِ شفقت میں دم توڑا۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو حضوؐر کے پاس موجود تھے، عرض کی "یا رسول اللہ! رونے سے تو آپ نے منع فرمایا تھا۔ آپ روئیں گے تو مسلمان بھی روئیں گے۔" جب آپ کے آنسو تھمے تو ارشاد فرمایا:

"یہ گریہ و زاری تو رحمت ہے۔ جو دوسروں پر رحم محسوس نہیں کرتا اُس پر رحم کیا بھی نہیں جاتا۔ میں نے لوگوں کو جو روکا ہے وہ بے جا نوحہ و زاری ہے اور اس بات سے کہ وہ مُردے کی ان صفات پر نالہ و زاری کریں جو اُس میں نہ ہوں۔"

پھر اپنے دل کے ٹکڑے ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"ہم جانتے ہیں کہ موت تو امرِ حق ہے اور وقت پر اس کا آنا یقینی ہے۔ ہم اس امر سے بھی واقف ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے بھی پہلے جانے والوں کے ساتھ جا ملیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے جانے کا غم اور بھی زیادہ ہوتا۔ آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں، دل غمزدہ ہے مگر ہماری زبان سے وہی نکلے گا جو ہمارے رب کو پسند ہے۔ اے ابراہیم، ہم تمہاری جُدائی سے غمگین ہیں۔" (بخاری)

❁

مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم پر تقریر کرنے کی سرکاری بندش تھی بمشکل اُن کے ایک دوست کی کوشش سے نمازِ جمعہ پڑھانے کی اجازت مل گئی۔ مولانا تقریر کرنے پہنچے تو علاقے کے تھانیدار بھی وہاں آدھمکے اور کہا کہ تازہ ترین احکامات کے تحت مولانا یہاں تقریر نہیں کر سکتے۔ اُسے قائل کرنے کی بہتیری کوشش کی گئی مگر بے سود۔ منتظمین کی وساطت سے مولانا نے تھانیدار سے پُوچھا کہ دُعا کرنے کی تو اجازت ہے۔

تھانیدار نے کہا: "ہاں دُعا کر لیجیے۔"

اب مولانا نے انتہائی رقت آمیز انداز میں حکمرانوں کی اصلاح، مُلک میں نظامِ اسلام کے قیام اور پاکستان کی فلاح و استحکام کے لیے بیس منٹ تک دُعا کی۔ اس دُعا پر حکومت کے کل پُرزوں کو بھی آمین کہتے ہی بنی۔

(ایشیا - ۹ رنومبر ۸۶ء)

جدید تاریخ کا ایک باب

پاشا سلاطین

یورپ کی پُراسرار انقلابی شخصیت جس کا نام بہت معروف اور کارنامے بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔

احمد الدین مارہروی

میں نیا نیا دارالحکومت بنا تھا اور دھلی ۱۹۱۱ء برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کے ...کی تیاریاں جوش و خروش سے جاری تھیں کہ اخبار ٹائمز نے ...عنوان سے یہ خبر شائع کی کہ اس موقع پر سوڈان کے ہیرو سر ...طین پاشا بھی شرکت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائیں ...ندوؤں کو تو اس نام سے کوئی دلچسپی تھی نہ اُس کے کارناموں ... البتہ برِصغیر کے مسلمان مہدی سُوڈانی اور انگریزوں کی معرکہ ...ے سلسلے میں اُس کا نام اکثر سُنتے رہے تھے لیکن تفصیلات ...ناواقت ہونے کے باعث اُن کا خیال تھا کہ ہر پاشا کی طرح ...کا تعلق بھی ترکی سے ہوگا یا مصر سے۔ ترکی اُس وقت سلطان ...کے زیرِ نگین تھا جو اسلامی دُنیا کے خلیفۃ المسلمین کہلاتے تھے، ...لیے وہاں کا ہر باشندہ اُن کے نزدیک واجب الاحترام تھا ...مصر میں انگریزوں نے قدم گاڑ رکھے تھے۔ خدیوِ مصر صرف ...کے فرمانروا تھے ورنہ مُلکی سیاست، غیر مُلکی تعلقات، فوج اور ان سب سے بڑھ کر مالیات پر انہی غیر مُلکیوں کا تسلط تھا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ابھی وجود میں نہیں آئی تھی مگر سرسید کا قائم کردہ ایم اے او کالج اُن کے جانشینوں نواب محسن الملک اور وقار الملک کی سربراہی میں قوم کی سیاست کا مرکز بن چکا تھا۔ انگریز کی حکومت بہت مضبوط تھی اور وہ رعایا کو اپنی ہوشیاری اور حکمتِ عمل سے باغیانہ خیالات کا کم ہی موقع دیتا لیکن دُنیائے اسلام میں اگر کوئی طوفان خیز لہر اُٹھتی تو اس سے قوم بالخصوص علی گڑھ کے نوجوانوں کی پیشانیوں پر لازماً شکن پڑ جاتی۔

۱۹۱۱ء ہی میں اٹلی نے طرابلس پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کے جذبات بُری طرح مجروح کر دیے تھے؛ چنانچہ ایم اے او کالج علی گڑھ کا انگریز پرنسپل اس صُورتِ حال سے خاصا پریشان تھا۔ اس خبر کے سُنتے ہی اُس نے وائسرائے سے درخواست کی سلاطین کے پروگرام میں ایک دو دن علی گڑھ کا دورہ ضرور شامل کیا جائے تاکہ وہ اپنی مقناطیسی شخصیت کے اثر سے ان نونہالوں

کے برانگیختہ جذبات ٹھنڈے کر کے اُنھیں ازسرِ نو تاجِ برطانیہ کا وفادار بنا دے۔

ادھر مُلکی اخبارات نے سلاطین پاشا کے متعلق متضاد قسم کے بیانات شائع کرنے شروع کر دیے۔ ٹائمز آف انڈیا نے جو بمبئی سے شائع ہوتا تھا، اُس کی شاندار تصویر مصر کے فوجی لباس میں شائع کی اور اُسے ایک جانباز جنرل، عسکری مدبّر اور پابندِ صوم و صلوٰۃ مسلمان کی حیثیت سے پیش کیا جبکہ کلکتے کے اخبار اسٹیٹسمین نے اُس کا ایک ایسا فوٹو شائع کیا جس میں وہ چہرے مُہرے اور لباس سے بعینہٖ انگریز نظر آتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ بھی تحریر کیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے نہ ترک بلکہ وسطی یورپ کے کسی ملک کا ایک طالع آزما ہے جس نے پہلے مصری فوج میں ملازمت اختیار کی اور پھر عوام اور حکومت میں قدر و منزلت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔

دوسری طرف سے اس مضمون کا مُنہ توڑ جواب دیا گیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اُردو اخبارات نے اُس کے کارنامے بیان کرنے شروع کیے تو ہندو روزنامے اُس کی مخالفت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ اُس کی شخصیت انتہائی متنازع فیہ بن گئی۔ اب یہ حکومتِ ہند کے ایما پر ہُوا یا خود سلاطین پاشا ہی نے مصلحت سمجھی کہ اس موقع پر اُسے ہندوستان نہیں جانا چاہیے۔ اس خبر سے مسلمانوں پر تو جیسے اوس پڑ گئی لیکن ہندوؤں نے خوب بغلیں بجائیں۔

☆

سلاطین کا خاندان یورپ کے اُس علاقے سے تعلق رکھتا تھا جسے آجکل چیکوسلاویکیا کہا جاتا ہے۔ اُس کا پردادا فکرِ معاش میں آسٹریا کے دارالحکومت وی آنا آیا اور تجارت کا معزز پیشہ اختیار کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہ لوگ تقریباً عیسائی تھے لیکن تُرکوں کے زیرِ اثر رہنے کے باعث اُن پر اسلامی تمدن و معاشرت کا گہرا اثر تھا حتّٰی کہ نام بھی سارہ، صاحبہ، یوسف، سلطان، نبی وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ سلاطین اُن کا خاندانی نام تھا۔

وی آنا میں قیام کرنے کے بعد اُن پر عیسائیت کی چھاپ گہری ہونے لگی۔ سلاطین پاشا کے باپ نے جو ایک [illegible] تھا کیتھولک مذہب اختیار کر لیا اور بچّوں کے مسیحی نام [illegible] لگے۔ یہ اپنے ماں باپ کا پانچواں بیٹا تھا اور اس کا نام [illegible] میں رڈولف سلاطین اور تاریخِ پیدائش ۱۸۵۷ء [illegible] برس کی عمر میں اس نے پڑھنا شروع کیا لیکن تاریخ [illegible] سوا کسی مضمون سے دلچسپی نہ ہُوئی۔ زبانیں البتہ کئی سیکھ [illegible] میں بخوبی لکھ پڑھ لیتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے سولہ برس کی [illegible] نے میٹرک کیا۔ اب سوال پیدا ہُوا کہ پیشہ کونسا اختیار کر[illegible] ہُوا کہ اُس میں کسی کی بھی اہلیت نہیں۔ خود اُس کا رجحان [illegible] کی جانب تھا۔

انھی دنوں اتّفاقاً ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ قاہرہ [illegible] کُتب فروش کو ایسے نوجوان کی ضرورت ہے جو مختلف [illegible] خط کتابت کر سکتا ہو۔ رڈولف سلاطین نے اس پر لبیک [illegible] کے لیے روانہ ہو گیا۔ اب ساری دُنیا اُس کے سامنے [illegible] ملک اور طبقے کے لوگ دُکان پر آتے جاتے تھے۔ انھی [illegible] جرمن سیّاح بھی تھا جو بحیرہ احمر کے ساحل کا جائزہ [illegible] روانہ ہونے والا تھا۔ سلاطین نے اپنے جغرافیائی علم [illegible] اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اُسے اپنے ہمراہ لے جانے [illegible] ہو گیا۔

جرمن سیّاح تو موت کا شکار ہو گیا لیکن سلاطین [illegible] سفر جاری رکھا۔ کچھ راستہ دریائے نیل پر کشتی کے ذریعے [illegible] کیا اور پھر اونٹ کی سواری کرتا ہُوا سوڈان کے دارال[illegible] پہنچ گیا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک یہودی ڈاکٹر سے [illegible] چل کر امین پاشا کے نام سے مشہور ہُوا۔ سوڈان پر اُنھی دنوں [illegible] تسلط ہُوا تھا۔ جنرل گورڈن گورنر جنرل تھا اور اُسے کچھ [illegible] افسروں کی ضرورت تھی۔ امین پاشا نے سلاطین کی [illegible] اُس وقت تک وہ وطن واپس آ کر مُلکی فوج میں بحیثیت [illegible] لیفٹیننٹ بھرتی ہو چکا تھا۔ جب اُسے تقرر کا [illegible] خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب اُسے عسکری قواعد و ضوابط [illegible] ایک سال بعد ہی چُھٹّی مل سکتی تھی۔ کسی کی بھی رائے نہ تھی [illegible]

[illegible] نوکری چھوڑ کر غیر مُلکی ملازمت اختیار کرے مگر سلاطین تو ہمیشہ سے اپنی مرضی کا بادشاہ تھا۔ گھر بار، ماں باپ، بہن بھائی [illegible] کو الوداع کہہ کر گورڈن کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ فوراً ہی اُسے [illegible] باشی (میجر) کا رینک دے کر صوبائی انسپکٹرِ مالیات بنا دیا گیا۔

اُس وقت صُورتِ حال یہ تھی کہ مصر پر انگریزوں نے اپنی سیادت قائم کر رکھی تھی اور خدیو اسمٰعیل سیاسی، اقتصادی دونوں اُمور میں ان غیر ملکیوں کی مشاورت کا پابند تھا اور اُنھی کے مشورے پر اُس نے ۱۸۲۰ء میں سوڈان پر فوج کشی کر کے اُس کے بیشتر حصّے پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریز افسران اس کا نظم و نسق سنبھالے ہُوئے تھے۔ جنرل گورڈن مصری فوج کا سپہ سالار بھی تھا اور سُوڈان کا گورنر جنرل بھی۔ پس ماندگی، سامانِ معیشت کے فقدان اور شدید گرمی کے باعث صرف مُہم جُو یورپی ہی وہاں ملازمت اختیار کرنے پر آمادہ ہوتے اور اکثر اس خاک میں دفن ہو جاتے۔ سلاطین کی ابتدائی تنخواہ صرف اٹھائیس مصری پونڈ تھی لیکن جلد ہی اُسے اچھی کارگزاری کے صلے میں ترقّی دے کر سرحدی علاقے دارفور کا گورنر بنا دیا گیا جہاں اُسے نظم و نسق کے علاوہ مقامی بغاوتوں کی سرکوبی کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے۔ ایک سال تو اُسے پینتیس معرکے سر کرنے پڑے۔ اُنھی میں سے ایک میں اُس کی انگشتِ شہادت بھی مجروح ہو کر ناکارہ ہو گئی۔

ابھی وہ باغی سرداروں کا پُوری طرح قلع قمع کرنے میں کامیاب نہ ہُوا تھا کہ یکایک ملک میں ایک عبرتناک انقلاب برپا ہو گیا۔ ایک مذہبی رہنما محمد احمد نے مہدی ہونے کا دعوٰی کر کے غیر مُلکی کافروں یعنی انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کا اعلان کر دیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ساری قوم اُس کی آواز پر لبیک کہہ کر میدان میں اُتر آئی اور سرفروشی پر آمادہ ہو گئی ہے۔ لاٹھیوں، ڈنڈوں اور بانسوں سے مسلّح نوجوان مصری فوج کو گھیرے میں لے کر بزن بول دیتے اور اُنھیں شکست دے کر ہتھیاروں پر قبضہ کر لیتے۔ جنرل ہکس کو اُس کی گرفتاری پر مامور کیا گیا لیکن مجاہدوں کے ہاتھوں اُس کا ایک سپاہی بھی جان بچا کر نہ لوٹ سکا۔ رسد اور کمک کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ سلاطین ان حالات میں

سلاطین پاشا ۱۹۳۰ء میں

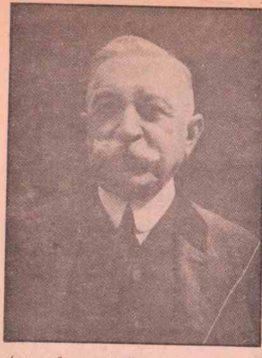

بھی دو سال مقابلے پر ڈٹا رہا مگر تابہ کے۔ جب اُس نے دیکھا کہ فوج کے مقامی شمشیر زن ایک ایک کر کے مہدی سے جا ملے اور وہ یکہ و تنہا رہ گیا ہے تو مجبوراً اُسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

☆

اب وہ مہدی کے زیرِ نگرانی الرّہد کے کیمپ میں ایک فوجی قیدی تھا جہاں خرطوم پر قبضہ کرنے اور جنرل گورڈن کو شکست دینے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ سلاطین برائے نام ہی عیسائی تھا۔ سُوڈان آ کر جب اُسے مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے اور اسلام کے زرّیں اصول سمجھنے کا موقع ملا تو اُسے تثلیث کے مقابلے میں وحدت کا پلّہ کہیں زیادہ وزنی لگا اور ایک روز اُس نے قاضیٔ شہر کے رُوبرُو حاضر ہو کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں خود مہدی سُوڈانی نے اُس کا نام عبدالقادر تجویز کیا جو آج بھی سرکاری کاغذات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سلاطین نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'آگ اور تلوار' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے قبولِ اسلام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان فوج ایک مشرک سپہ سالار کی قیادت پسند نہ کرتی تھی اور جیسے ہی

مَیں نے اسلام قبول کیا، وہ سب میرے حلقہ بگوش ہو گئے۔ مسیحی دُنیا، بالخصوص اُس کے اہلِ خاندان نے یہ حقیقت کبھی تسلیم نہ کی اور وہ اُسے آخر تک عیسائی ہی کہتے اور سمجھتے رہے۔ اس طرح اُس کا مذہب ایک متنازع فیہ مسئلہ بنا رہا؛ حالانکہ اُس نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک سچا مسلمان ہی ظاہر کیا۔

۱۸۸۴ء میں مہدی کی فوج ظفر موج نے خرطوم پر حملہ کر کے اُس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں گورنر جنرل گورڈن نے مصری فوج کے ساتھ سخت مقابلہ کیا۔ سلاطین ایک جنگی قیدی تھا لیکن ہر ایک کو علم تھا کہ وہ گورڈن کا منظورِ نظر ہے، اس لیے مہدی نے یہ ناممکن فریضہ اُس کے سپرد کیا کہ کسی طرح جنرل کو ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ کرے۔ بات کچھ آگے بھی بڑھی لیکن کسی نے اُس کے اسلام لانے کا ذکر کر دیا اور گورڈن نے اُسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تم اور مہدی ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہو۔ مَیں آخر تک مقابلہ کروں گا۔ محاصرہ جاری رہا حتّٰی کہ شہر فتح ہو گیا۔ گورڈن مارا گیا اور مصری افواج کو سوڈان خالی کر دینا پڑا۔

مہدی کی قید میں سلاطین کے علاوہ مصری جنرل ابراہیم پاشا، دو اطالوی پادری، ایک جرمن تاجر اور ایک اطالوی باشندہ بھی تھا لیکن سلاطین کو یہ لوگ پابندِ صوم و صلوٰۃ ہونے کی وجہ سے مخصوص رعایتوں کا حقدار سمجھتے تھے۔ چند روز کے بعد خلیفہ (نائبِ مہدی) نے اُسے اپنے محافظ دستے میں شامل کر کے امیرِ تشریفات کا عہدہ سپرد کر دیا۔ وہ دربان یا داروغے کی طرح دروازے پر بیٹھا رہتا اور صرف اُسی کے توسط سے دربار میں باریابی ہو سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کو خلیفہ کے مزاج میں اتنا دخل ہو گیا کہ سیاسی معاملات میں اُسی سے مشورہ کیا جانے لگا۔ یُوں بین الاقوامی امور میں اُس کی بصیرت بہت گہری ہو گئی۔

اُسے ایک سرکاری مکان ملا ہُوا تھا جس سے ملحق ہرا بھرا باغیچہ اور اُسے سیراب کرنے کے لیے پختہ کنواں بھی تھا۔ اُس نے ایک سُوڈانی عورت سے شادی کر لی تھی جس کا نام حسینیہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک حبشی کنیز بھی اُس کے حرم میں تھی جو گھرداری اور صفائی کا کام کرتی۔ تنخواہ کوئی مقرر نہ تھی اور جیب خرچ کے نام سے جو تھوڑی بہت رقم ملتی، وہ ضروری اخراجات کے لیے بھی ناکافی تھی۔ دو تین مرتبہ چھپ چھپا کر گھر سے کچھ رقم منگائی تب کہیں خرچ پُورا ہُوا۔ مصر کے محکمۂ سراغرسانی نے اپنے کچھ جاسوس چھوڑ رکھے تھے جو اُس سے خُفیہ طور پر ملاقات کرتے۔ انھی کے ذریعے وہ ماں باپ سے خط کتابت کرتا اور یہاں کی اہم خبریں ارسال کرتا۔ اس حال میں بارہ برس کا عرصہ گزر گیا۔ بیچ میں موقع پا کر دونوں پادری اور پھر دوسرے غیر مُلکی اسیرانِ جنگ اپنی حکومتوں کی مدد سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن سلاطین نے وہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کی یا جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، خود مصری حکومت اور انگریزوں کی مصلحت کوشی کا تقاضا تھا کہ فی الحال وہ سُوڈان ہی میں رہے اور وہاں کے تازہ کوائف سے اُنہیں آگاہ کرتا رہے۔

عیسائی پادریوں اور جرمن تاجر نے سُوڈان کے حالات سے اخبارات کو مطّلع کیا جس کے بعد اُن کے بیانات کتابی صورت میں شائع ہُوئے۔ اُنہیں پڑھ کر یورپ میں گویا آگ سی لگ گئی۔ مہدی کا انتقال ہو چکا تھا اور اب اُس کی جگہ خلیفہ عبداللہ حکمرانی کر رہا تھا۔ انگلستان میں جنرل ہکس اور گورڈن کے انتقام کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا اور برطانوی حکومت مصر کے تعاون سے سُوڈان پر دوبارہ قابض ہونے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ اس سلسلے میں انہیں ایک واقف کار اور چابکدست مشیر کی خدمات درکار تھیں اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے اُنہیں سلاطین سے بہتر شخص میسّر نہ آ سکتا تھا۔ لے دے کر نظریں بار بار اُسی کی طرف اُٹھتیں، اس لیے نہایت خُفیہ طور پر اُس کے فرار کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

عام گزرگاہیں، دریا اور میدان چھوڑ کر سنگلاخ پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں سے ہوتا ہُوا برہنہ پا، چیتھڑے لگا، فاقہ زدہ سلاطین جب مصر کی سرحد میں داخل ہُوا تو ہر شخص نے اُسے اِک بھکمنگا فقیر ہی سمجھا لیکن جب وہ قاہرہ پہنچا تو ساری خلقت اُس کی ایک جھلک دیکھنے سڑکوں پر نکل آئی۔ دُنیا بھر کے پریس رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کی اُس کے گرد ایسی یورش ہُوئی کہ پولیس بھی اُنہیں

[قا]بو میں نہ رکھ سکی۔ ایک طرف برطانوی اور دوسری جانب آسٹروی اخبارات نے اُس کے متعلق مضمون اور اداریے لکھے اور تصاویر شائع کیں اور خدیو نے اُس کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں پاشا کا [مع]زز ترین خطاب عطا کر کے میرِ میران یعنی میجر جنرل کے عہدے [پر] فائز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بارہ برس کی تنخواہ بھی ادا کر دی گئی۔

مصر آ کر اُس نے اپنی ڈائری اور یادداشت کی مدد سے معرکۃ الآرا تصنیف 'فائر اینڈ سورڈ' لکھی جس نے تمام دُنیا [با]لخصوص یورپ اور امریکہ میں تہلکہ مچا دیا۔ کتاب جرمن زبان میں لکھی گئی تھی لیکن ساتھ ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوتا رہا۔ عوام کے لیے اس کا ایک مختصر ایڈیشن بھی ترتیب دیا گیا جو اتنا مقبول ہُوا کہ ۱۹۳۰ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔ بعد میں فرانسیسی، اطالوی اور عربی زبانوں میں اس کے تراجم نہایت کامیاب ثابت ہُوئے۔

سلاطین پاشا کو وطنِ عزیز سے رُخصت ہُوئے سترہ برس کا طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔ بہن بھائیوں سے ملنے آیا تو وی آنا میں بھی اُس کا بڑا شاندار خیر مقدم اور استقبال ہُوا۔ اخبار نویسوں نے جب تک سُوڈان کے حالات [پر] جامع اور مفصل ایک مختصر سی کتاب تصنیف نہ کرا لی اُسے چین سے [بیٹھ]نے نہ دیا۔ آسٹریا کے شہنشاہ جوزف نے اُسے دربار میں طلب کر کے 'رِٹر' سے نوازا تو یورپ کی مختلف جغرافیائی سوسائٹیوں نے لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔

★

واپسی پر سلاطین پاشا فوج کے شُعبہ مُخبری میں اعلیٰ عہدے پر تعینات کیا گیا اور اُسی کے مشورے سے طے پایا کہ سُوڈان پر دوبارہ فوج کشی کی جائے اور کچنر کو (جو لارڈ کرزن کے زمانے میں ہندوستان کا کمانڈر ان چیف اور بالآخر برطانیہ کا وزیرِ جنگ مقرر ہُوا) اس مُہم کی سربراہی سپرد کی جائے۔ اُسے اس خطۂ ملک اور وہاں کے لوگوں کے عادات و خصائل سے پُوری پُوری آگاہی تھی، اس لیے میدانِ جنگ کا نقشہ تیار کرنا اور جنرلوں کو

کراچی میں
گلف ہوٹل
صدر کے بارونق علاقے میں
اوّل درجے کا
سنٹرلی ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل
اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کی تمام سہولیات مثلاً جدید ترین لفٹ، پُرسکون کمرے جو بہترین آرام دہ فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ ہر کمرے میں ٹیلیفون، ٹیلیکس سروس، سواری کی سہولت ہر وقت مہیا رہتی ہے۔ اوّل درجے کا ایئرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ، کشادہ لابی اور سب سے بڑی بات یہ کہ کرایہ انتہائی مناسب
gulf hotel
FRERE STREET SADAR
KARACHI
PAKISTAN
Telephones:515831_39
TELEX : 25125

مفید مشورے دینا بھی اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ ۱۸۹۸ء میں انگریز سوڈان پر دوبارہ قابض ہو گئے اور کچنر کے ساتھ سلاطین کو بھی اس فتح کا ہیرو قرار دیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنی تصویر تحفتہً اُسے بھیجی اور اُس کی شبیہہ طلب کی جس پر خوشی کا اظہار کرتے ہُوئے اُس نے اپنی کتاب ملکہ ہی کے نام سے مُعنون کر دی۔

اُسے ملازمت اختیار کیے بیس برس ہو چکے تھے اور قاعدے کے مطابق اُسے فوج سے سبکدوش ہو جانا تھا۔ اس موقع پر خدیو نے اُسے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دے کر چھ سو پندرہ پونڈ سالانہ پنشن مقرر کر دی اور ملکہ وکٹوریہ نے حُسنِ کارگزاری کے صلے میں سر کا خطاب عطا کیا۔

سلاطین کی عمر اُس وقت اکتالیس برس تھی اور جس قسم کی زندگی بسر کرنے کا وہ عادی تھا اُس میں بیکاری موت کے مترادف تھی۔ مُہم جُوئی کے طور پر اُس نے ایک ایسی کمپنی میں شراکت اختیار کر لی جو سوڈان کے پہاڑوں میں سونے کی متلاشی تھی۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا لیکن طبقات الارض کے مضمون سے اُسے دلچسپی تھی نہ لگاؤ۔ دوسرے لوگوں کا بھی یہی حال تھا ــــ اسے اس مقصد میں تو کامیابی نہ ہو سکی؛ البتہ اپنے پُرانے ساتھیوں سے ضرور ملاقات ہو گئی۔

اُن دنوں سوڈان کی نئی حکومت کو مشاورت کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش تھی۔ سلاطین، سوڈانی عربی کا ماہر اور اہلِ ملک کی رگ رگ سے واقف تھا اور سب سے بڑھ کر بہ حیثیتِ مسلمان رشتۂ اخوت میں بھی منسلک تھا حتّٰی کہ ضرورت کے وقت اذان بھی کہتا اور امامت بھی کر سکتا تھا، چنانچہ قرعۂ فال اُس کے نام نکلا اور اُسے دو ہزار پونڈ سالانہ معاوضے پر انسپکٹر جنرل مقرر کر کے گورنر جنرل کا مشیرِ خصوصی بنا دیا گیا۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۴ء تک اُس کی زندگی ایسی گوناگوں مصروفیتوں میں گزری کہ سر اُٹھانے کی مہلت نہ مل سکی، ابتدا میں مہدی کے پیروؤں کی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ پھر غلاموں اور کنیزوں کی آزادی کا مسئلہ پیدا ہُوا جو مقامی روایات اور شخصی آزادی سے متصادم ہو گیا، کیونکہ اُن کی معاشرت اور معیشت دونوں کا انحصار اس پر تھا۔ انگریز چاہتا تھا کہ یہ لعنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے جبکہ سوڈانی اُسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سلاطین نے آگے بڑھ کر افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا اور کامیاب ہُوا۔

اب عیسائی مشنریوں نے تبلیغ کے لیے زور لگانا شروع کیا۔ خرطوم میں جدید اسکول اور کالج کا قیام عمل میں آیا اور پادری گلی کوچوں میں وعظ کہنے لگے۔ اس مسئلے پر خود اربابِ حکومت میں پھوٹ پڑ گئی کہ حکومت کو اُن کی پشت پناہی کرنی چاہیے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ سلاطین نے بہ حیثیت ایک مسلمان اس کی سخت مخالفت کی اور اس معاملے میں بھی وہ ایک متنازع فیہ شخصیت بن گیا۔ مصر اور اسلامی دُنیا میں اُس کی واہ واہ ہُوئی لیکن یورپی اخبارات اُس کے خلاف اپنے کالم سیاہ کرتے رہے۔

ایک اور مصروفیت دوسری ہی نوعیت کی تھی۔ افریقہ کو ہمیشہ سے تاریک براعظم کہا جاتا تھا۔ مصر سے آگے سوڈان کا تو لوگوں نے سُن رکھا تھا لیکن مغربی دُنیا وہاں کے اندرونی حالات سے بالکل نابلد تھی۔ مہدی کے جہاد نے اس خطۂ ارضی کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا۔ اب جو یہ ملک برطانیہ کے تسلط میں آیا تو اُمرا ہی نہیں بلکہ بعض سربراہانِ ممالک نے بھی سیر و تفریح اور شکار کی غرض سے ادھر کا رُخ کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف آسٹریا اور ہنگری کے بادشاہ، سلاطین کے ایما پر اس علاقے کا دورہ کرنے آئے اور دوسری جانب امریکی صدر روزویلٹ برطانوی حکومت کی دعوت پر وہاں کے حیوانات و نباتات کا جائزہ لینے پہنچ گیا جن سے اُسے خاص دلچسپی تھی۔

انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے یہ امر بھی اُس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ غیر ملکی معزز مہمانوں کی خاطر تواضع کا حسبِ مراتب انتظام کرے، دَوروں کا پروگرام بنائے اور تحفظ کی خاطر دن رات اُن کے ہمراہ رہے۔ اس میں تکلیف تو ضرور ہوتی لیکن اس طرح ان سربراہانِ ممالک سے اُس کے ذاتی تعلقات استوار ہو گئے اور بعض کی طرف سے اُسے قیمتی تحفے بھی عطا ہُوئے۔

حالات بہتر ہُوئے تو وہ ہر سال اپنے وطن جانے لگا۔ ایک ماہ کی چھٹی لے کر یورپ کے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ کچھ روز وی آنا میں عزیز و اقارب کے ساتھ گزارتا۔ اُس کا بڑا بھائی آسٹریا کی حکومت میں ایک بڑا افسر تھا۔ تینوں بہنیں کنواری تھیں اور جھیل کنارے خوبصورت سے بنگلے میں رہا کرتیں۔ یہاں اُس کا زیادہ وقت سواری اور تیراکی میں صرف ہوتا۔ شاہ جوزف اُسے ہر تقریب اور ضیافت پر مدعو کرتا جہاں وہ میجر جنرل کی وردی میں ایک نمایاں شخصیت معلوم ہوتا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب شاہِ برطانیہ ایڈورڈ ہفتم اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ پہلے ۱۹۰۴ء میں اُسے سی وی او یعنی کمانڈر وکٹورین آرڈر کا خطاب عطا کیا۔ پھر ۱۹۰۸ء میں کے سی وی او اور ۱۹۱۲ء میں جی سی وی او کے اعزازات ملے۔ غالباً اُنھی کے زیرِ اثر مصری حکومت نے بھی اُسے لیفٹیننٹ جنرل کے اعزازی عہدے پر سرفراز کر دیا۔ ان سب مواقع پر انگریزی فرانسیسی اور مصری اخبارات نے اداریے لکھے اور ضمیمے شائع کیے جن کا برِصغیر کی صحافت میں بھی چرچا ہوتا رہا اور یہاں کا مسلمان طبقہ اُس کے کارناموں سے بخوبی واقف ہو گیا۔

ازدواج

جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا، سوڈان میں اسلام قبول کرنے کے فوراً بعد سلاطین پاشا نے ایک مقامی دوشیزہ سے شادی کر لی تھی اور ایک حبشی کنیز بھی اُس کے حرم میں داخل تھی لیکن خلیفہ کی حراست سے فرار ہونے کے بعد یہ تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اب وہ مجرّد زندگی گزار رہا تھا کہ نہ معلوم کس طور پر ایک جرمن جنرل کی بیٹی ایلس پر فریفتہ ہو گیا۔ دونوں ہی شادی کی عمر سے متجاوز ہو چکے تھے۔ سلاطین ستاون سال کا تھا اور ایلس اکتالیس برس کی۔ اس تفاوتِ عمر کے علاوہ مذہب اور عقائد میں بھی بُعد المشرقین تھا۔ وہ کٹر کیتھولک تھی اور یہ بندۂ اسلام۔ مگر وہ جو کہتے ہیں عشق نہ پُوچھے ذات پات، ایک سال تو دونوں ہی نانا کرتے رہے، پھر ایک روز رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ سوڈان کی رہائش دونوں ہی کو مرغوب تھی لیکن گرمی کا موسم وہ سوئٹزرلینڈ کے مرغزاروں میں گزارتے تھے۔

زندگی کے ایام بخوبی کٹ رہے تھے اور یہ ابھی یورپ ہی میں تھے کہ بالکل غیر متوقع طور پر پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا اور کوڑھ پر کھاج یہ کہ آسٹریا اور انگلستان حریفوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ایک سلاطین کا آبائی وطن تھا تو دوسرا ولی نعمت۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر پاتے بین الاقوامی راستے مسدود ہو گئے۔ جو بھی سرحد عبور کرنے کی کوشش کرتے، واپس کر دیے جاتے۔ مجبور ہو کر دونوں وی آنا میں ٹھہر گئے۔ سوڈانی حکومت اور انگریزوں کو پوری طرح احساس تھا کہ اُنھیں اس موقع پر سلاطین جیسے ہوشیار، وفادار اور آزمودہ کار جنرل کی کتنی اشد ضرورت ہے اور اُنھوں نے اُسے بُلانے کے لاکھوں ہی جتن کر ڈالے مگر کامیابی نہ ہو سکی، چھٹیاں ختم ہُوئیں تو اُس نے قاعدے کے مطابق اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جس کے جواب میں اُسے لکھا گیا کہ جنگ کے اختتام تک تمہاری چھٹی منظور کی جاتی ہے۔

اس کے بعد اُس نے اپنی خدمات آسٹروی حکومت کو پیش کر دیں جہاں فوجی رجسٹروں میں اُس کا نام ابھی تک سب لیفٹیننٹ کے زمرے میں لکھا ہُوا تھا۔ اس پر حکومت کی طرف سے اُسے شکریے کا خط بھی موصول ہُوا لیکن پھر خاموشی چھا گئی۔ وہاں سب کو علم تھا کہ وہ برطانیہ کا حامی اور طرفدار ہے اور اُس کی وفاداریاں ہمیشہ مشتبہ رہیں گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انگریز اُس سے جاسوسی کا کام لیتے۔ اس کے علاوہ ایک لیفٹیننٹ جنرل کو بہ حیثیت سب لیفٹیننٹ بھرتی کرنا بھی اصولی طور پر غلط تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ گھر پر بیکار بیٹھا رہا۔ جنگ کی ہولناکیاں بڑھتی جا رہی تھیں، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گرانی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یورپ کی سردی اور گرم کپڑوں کے فقدان سے اُس کی صحت تباہ ہو رہی تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر بیکاری تھی جس کا وہ عادی نہ تھا۔ اس دوران میں اُن کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام ماں نے مَیری تجویز کیا لیکن باپ اُسے مریم کہہ کر پکارتا۔

جنگ ختم ہُوئی تو ساری دُنیا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ مصر کو انگریزوں نے باقاعدہ سلطنتِ برطانیہ میں شامل کر لیا تھا۔ سوڈان میں بھی نئے دَور کا آغاز ہُوا۔ پُرانے افسر یا تو خود ہی واپس چلے گئے یا علیحدہ کر دیے گئے اور سلاطین کی وہاں صرف

یادگاریں ہی باقی رہ گئیں جن میں ایک شاہراہ اُس کے نام سے موسوم تھی یا ایک مسجد۔ سُوڈان کے لیے اُس نے جو خدمات انجام دی تھیں اور عیسائی پادریوں کی چیرہ دستی سے جس طرح وہاں کے مسلمانوں کو محفوظ رکھا تھا، مقامی اخبارات کے صفحات اس کی شہادت دے رہے ہیں اور بڑے بُوڑھوں کے دلوں میں اُس کی یاد آج تک تازہ ہے۔

۱۹۲۰ء کے اوائل میں یورپ کے حالات قدرے پُرسکون ہُوئے تو سلاطین پاشا نے لندن پہنچ کر اپنے پُرانے دوستوں سے ملاقات کی۔ دورانِ جنگ آبائی مکان، جو نہایت خوشنما اور فراخ تھا اور جس میں اُنہوں نے زندگی کے پچّیس برس نہایت آسائش و اطمینان سے گزارے تھے، فروخت ہو چکا تھا۔ برطانیہ قحط سالی کا شکار تھا اور لوگ فاقوں مر رہے تھے۔ اُس نے شاہ جارج پنجم سے مل کر تمام حالات بیان کیے لیکن بے سُود۔ وہاں ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ بہت دوڑ دھوپ کی تب کہیں جا کر اتنا ہُوا کہ برطانوی حکومت کی سفارش پر مصر سے اُس کی پنشن کا دوبارہ اجرا ہو گیا اور اب دن بافراغت بسر ہونے لگے۔

سلاطین پاشا کی آرزو تھی کم از کم ایک مرتبہ سُوڈان کو اُس کی موجودہ حالت میں دیکھ آئے۔ گورنر جنرل سر جان میفے کو جب اس کا علم ہُوا تو اُس نے سلاطین کو بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیا۔ قاہرہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں سعد زاغلول پاشا نے اُس سے ملاقات کی اور بعض نازک سیاسی مسائل پر اُس سے طویل گفتگو کی۔ خیال یہ ہے کہ وہ مصر کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کی فکر میں تھا اور اس سلسلے میں سلاطین سے امداد چاہتا تھا۔

سُوڈان کی حالت پہلے سے بہتر تھی لیکن مسلمانوں کے متعلق حکومت کی معاندانہ پالیسی پر اُس نے سخت اعتراضات کیے اور صاف کہہ دیا کہ اگر یہی لیل و نہار رہیں تو وہ دن دُور نہیں جب یہ ایک مرتبہ پھر بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ اہلِ اسلام مذہبی امور میں کسی کی رعایت نہیں کرتے۔ شاہ فواد کے متعلق بھی اُس نے کہا کہ وہ ناکارۂ محض ہے اور وہ دن دُور نہیں [illegible] اُسے نکال باہر کیا جائے گا۔

اسی طرح جب لارڈ بالفور نے فلسطین میں اسرائیل [illegible] کے قیام کا اعلان کیا تو سلاطین کا اس کے خلاف ردِّعمل [illegible] سخت تھا۔ اُس نے اپنے دوست ونگیٹ سے، جو اُس کا [illegible] بھی رہ چکا تھا، کہا کہ یہودی حکومت کرنے کے لیے نہیں [illegible] گیا۔ اُس کا وطن تو ہر وہ ملک ہے جہاں وہ دوسروں کا [illegible] چُوس کر دولت سے کھیلے، جہاں اس پر مظالم نہ ہوں اور وہ آسُودہ زندگی بسر کر سکے۔ زمامِ حکومت کبھی اُس کے ہاتھ آئی [illegible] ہے نہ وہ اس کا اہل ہے۔ اُس کی مملکت اگر قائم ہُوئی تو [illegible] کے لیے ناسُور بن جائے گا۔

یہ تینوں پیشگوئیاں کتنی صحیح ثابت ہُوئیں، دُنیا مان گئی [illegible] کہ وہ کتنا صائب الرائے تھا۔

جنگِ عظیم کے بعد اُس کی عملی زندگی تقریباً ختم ہو چکی [illegible] لیکن جس ملک میں بھی وہ جاتا، بڑی آؤ بھگت ہوتی اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ انگلستان کے شاہی محل میں اُس کی دعوت ضرور ہوتی اور ملکہ و بادشاہ دونوں ہی اُس کی باتیں بڑی دلچسپی [illegible] سُنتے۔ اپنے ملک آسٹریا کی بھی ہر سرکاری تقریب میں ضرور مدعو کیا جاتا۔ فوجی جنرل بالخصوص اُس سے ہاتھ ملانے میں فخر محسوس کرتے اور ضروری معاملات میں اُس سے مشورہ بھی کرتے [illegible] انگریز دوستی کے باعث مسلمان اُس سے کھنچے کھنچے رہتے اور بعض تو کُھلم کُھلا کہنے لگے تھے کہ سلاطین بس نام ہی کا مسلمان ہے۔ [illegible] باتیں جب اُس کے کان میں پڑتیں تو وہ سرد آہ بھر کر کہتا کہ میں نے اپنی جان پر کھیل کر سُوڈان میں اسلام کی جو خدمت کی، اُسے لوگ ابھی سے بھُولتے جا رہے ہیں۔ آئندہ کا مؤرّخ شاید ہی میرے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس کے باوجود یہ بھی امرِ واقع ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی ایک متنفّس بھی اُس کا دوست نہ تھا۔ اُس کے تمام یارِ غار انگریز ہی تھے۔

حالات کچھ بہتر ہونے لگے تھے کہ یکایک ایلس پر کسی

[illegible] معلوم مرض کا حملہ ہُوا جس کی آسٹریا میں تشخیص ہو سکی نہ انگلستان [illegible] اور جب ہُوئی تو پانی سر سے اُونچا ہو چکا تھا۔ کینسر آج کی [illegible] اُس زمانے میں بھی لاعلاج سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی اس سے [illegible] نہ ہو سکی۔ کہاں تو وہ اپنے لیے مکان تعمیر کرنے کا ارادہ کر [illegible] تھا، کہاں گھر ہی اُجڑ گیا۔ لڑکی تو اُس نے ایک آیا کے ساتھ [illegible] بھیج دی جہاں اُس کے دوست احباب تعلیم و تربیت کی [illegible] کرتے رہے، اور خود پانچ سال ہوٹلوں میں گزار دیے۔ پھر [illegible] میں ایک مکان کرایے پر لے کر وہاں مقیم ہو گیا۔ کبھی کبھار [illegible] بھائیوں سے ملنے آسٹریا چلا جاتا۔

۱۹۳۲ء میں جب اس کی صحت جواب دینے لگی تو ایک مرتبہ [illegible] سوڈان کی یاد ستانے لگی اور عجیب بات یہ ہے کہ اس طولانی اور [illegible] دہ سفر کے باوجود اُس کی طاقت پھر عود کر آئی اور وہ بیٹی [illegible] ملنے سیدھا لندن پہنچ گیا۔ یہاں اُس کا شاہانہ استقبال ہُوا۔ [illegible] زادہ فلپ نے محل میں اپنا کمرہ اُس کی رہائش کے لیے خالی کر دیا۔ بادشاہ اور ملکہ نے دعوتیں کیں۔ اخبار نویسوں نے اُسے [illegible] نرغے میں لے لیا اور جب تک حکومت نے پابندی عائد [illegible] کر دی، اخبارات اُس کے انٹرویو شائع کرتے رہے۔

اس دوران میں کئی پُرانے ساتھی داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ اُن سب کا مختصر حال اپنی ڈائری میں لکھتا رہا اور کبھی انّا للہ اور کبھی اللہ کریم کے الفاظ پر ختم کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیہم صدمات نے اُس کا دل نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آخر احباب نے اُسے اسپتال میں داخل کرا دیا جہاں اُس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ موت دروازے تک آ پہنچی ہے تو وہ وطن میں دفن ہونے کے خیال سے وی آنا پہنچا جہاں ۴؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اُس کا انتقال ہو گیا۔ بدقسمتی سے اُس وقت تمام شہر میں کوئی ایک مسلمان بھی نہ تھا جو اُس کی اسلامی طریقے پر تجہیز و تکفین کرتا اس لیے اہلِ خاندان نے اُسے عیسائیوں ہی کی طرح آبائی قبرستان میں دفن کر دیا۔ اتنا البتہ ہُوا کہ مسلمان ہونے کی بنا پر کسی پادری نے اُس کے لیے اپنے انداز میں دُعائے مغفرت نہ کی۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر اُس کی شخصیت متنازع فیہ بن گئی۔

جنازے کے ساتھ ایک جمِ غفیر شریکِ ماتم تھا جس میں صدرِ مملکت، وُزرا، جج اور عسکری سب ہی شامل تھے۔ انگلستان کا سفیر بھی موجود تھا۔ جھنڈا تو سرنگوں نہیں کیا گیا لیکن دفاتر میں عام تعطیل کر دی گئی اور تاجروں نے اپنی دُکانیں خود ہی بند کر دیں۔

اب ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اُس کی لڑکی کا کیا بنا۔ اس خیال سے کہ کسی کو صدمہ نہ ہو، اُس نے اُسے بسترِ مرگ پر بُلایا نہ موت کی اطلاع ہونے دی۔ ماں کے بعد اُس کی پرورش ایک عیسائی گھرانے میں ہوتی رہی۔ اسکول میں اُس کا نام مریم سلاطین ہی درج کیا گیا لیکن کوئی اُسے یہ بتانے والا نہ تھا کہ تم مسلمان ہو۔ باپ کے گھرانے سے اُس کا کبھی تعلق نہ رہا، لہٰذا وہ اسلام کے نام تک سے بے بہرہ رہی۔ لاہور کی احمدیہ جماعت کے مبلّغ آفتاب الدین نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا تھا کہ ہماری تنظیم نے ایک مرتبہ اُسے مسلمان ثابت کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن قانونی پیچیدگیاں راہ میں ایسی حائل ہُوئیں کہ اُن کے سامنے ہمیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کا انجام کیا ہُوا۔

"تجارت کی حیثیّت ثقافت سے زیادہ بین الاقوامی ہے، اس لیے آپ کا فرض ہے کہ وہ طرزِ عمل اختیار کریں جس سے پاکستان کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی تجارت کاروباری دیانت کے اعلیٰ معیار قائم کرنے کا بہت مؤثّر ذریعہ ثابت ہو گی۔ اگر ہم اپنے مُلک کی چیزوں کا نام پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدا ابھی سے ہونی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا کی تجارتی منڈیوں میں لفظ 'پاکستان' مال کی عمدگی اور اعلیٰ معیار کا مترادف ہو جائے۔"

(قائدِ اعظم — ۲۷ اپریل ۴۸ء — ایوانِ تجارت کراچی میں)

اودے پور کے راجے مہاراجے

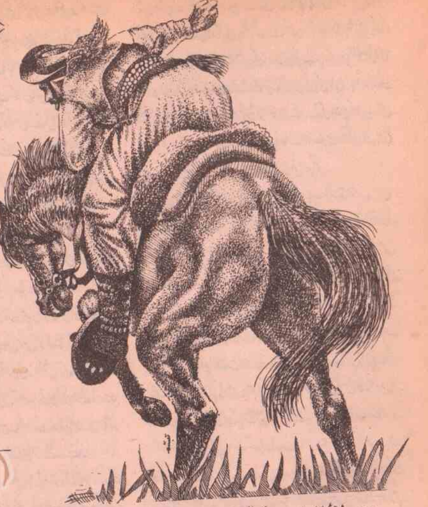

تحریر: جی ای سی ویکفیلڈ
ترجمہ: فضل قدیر

ہزہائی نس مہاراجہ فتح سنگھ جی والئ اودے پور نے جب یہ سنا کہ میں ٹونک چھوڑنا چاہتا ہوں تو مجھے باؤنڈری سیٹلمنٹ افسر کے عہدے کی پیشکش کی۔ ۱۹۰۳ء میں اُن کی ملازمت میں داخل ہُوا۔ میں نے اُن کے ساتھ چھ سال گزارے جو گوناگوں واقعات اور خوش کُن یادوں سے لبریز ہیں۔ ہزہائی نس ایک بہترین شخصیت و کردار کے انسان تھے؛ تاہم وہ کسی بات کا فیصلہ کرنے میں خاصے سُست تھے۔ اُنھیں ہمیشہ یہ تذبذب رہتا تھا کہ کہیں وہ کوئی غلط فیصلہ تو نہیں کر رہے۔

مجھے اُن کا یہ مشورہ یاد ہے کہ "فیصلے جلد بازی سے نہ کرو۔ اگر فائلوں کو جُوں کا تُوں پڑا رہنے دیا جائے تو اکثر وہ اپنا فیصلہ خود کر لیتی ہیں۔"

ہزہائی نس نے مجھے ہندی سیکھنے کے لیے کہا۔ جب میں ہندی سیکھ گیا تو اُنھوں نے مجھے جُملہ کانفیڈنشل کام سونپ دیا۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ جب مہارانا کی خدمت میں لارڈ کرزن کے تحریر کردہ خط کا ترجمہ لے کر گیا جس میں اُنھوں نے ہزہائی نس کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ اس دورِ جدید کے بادشاہ عوام کے خادم ہوتے ہیں، عوام بادشاہ کے خادم نہیں تو ہزہائی نس جُملہ سُن کر اپنی کُرسی سے اُچھل پڑے اور کہا کہ وہ یہ باور نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ایسی احمقانہ بات پر یقین رکھتا ہو۔

٭

جب بھی مہارانا کا گزر کسی سواری یا گھوڑے پر عوام کے درمیان ہوتا تو سڑکوں کے دورویہ پلّو پھیلائے عورتیں گاتی ہوئی اُن کا استقبال کرتیں۔ اُن کے دو سردار ہتھیلیوں میں چاندی کے سکّے لیے دونوں طرف چلتے۔ ہر سکّے کی مالیت دو آنے بھر ہوتی۔ سردار بڑی ہُنرمندی سے پھیلی ہُوئی چادروں پر سکّے پھینکتے۔ عورتیں سکّے سمیٹ کر محل جاتیں جہاں اُن کے بدلے ایک سیر اناج دے دیا جاتا۔

ہزہائی نس بڑے قدامت پرست اور وہمی تھے۔ کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ شاید اس عدمِ اعتماد ہی کی بنا پر اُنھوں نے دو اشخاص کو بطور اپنا وزیرِاعظم مقرر کر رکھا تھا۔ ہم لوگ اُنھیں "جڑواں" کہہ کر پکارتے تھے۔

اب میرے فرائض کی بات بھی سُنیے۔ میں بیک وقت باؤنڈری سیٹلمنٹ افسر، کانفیڈنشل سیکرٹری، نظامِ آبپاشی کا سپرنٹنڈنگ انجینئر اور ولی عہد بہادر کا اتالیق تھا۔ ان فرائض کے علاوہ میرے ذمّے گھوڑوں کی خریداری، کلکتہ سے شادیوں کے لیے اشیا منگوانا اور ریاست میں تشریف لانے والی عظیم شخصیتوں کے دعوتوں وغیرہ کے متفرق کام بھی شامل تھے۔ ان کثیر نوعیتوں کی ذمّہ داریوں کی بجا آوری میں بعض دلچسپ واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ اچانک مجھ سے کہا گیا کہ میں ایک خُفیہ فائل ریذیڈنٹ کے پاس لے جاؤں جو اُن دنوں شیر کے شکار میں مصروف تھے۔ میں نے سیلانہ تک جو وسطِ ہند میں ہے ریل سے سفر کیا۔ گاڑی سے اُترتے ہی مجھے ایک خوبصورت سیاہ گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا جسے دو آدمی بڑی مشکل سے قابو میں کیے ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ریذیڈنٹ کا کیمپ یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے صرف اس پر سوار ہونا ہے باقی کام گھوڑا خود انجام دے گا۔

بڑی مشکل سے میں گھوڑے پر سوار ہُوا جُوں ہی اس بھونچال کو چھوڑا گیا یہ بیان کردہ صفات کے مطابق طوفان بن کر دوڑا اور کہیں رُکے منزلِ مقصود پر جا کر دم لیا۔ راستے میں میں نے اُس کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی مگر لاحاصل۔

ریذیڈنٹ کے کیمپ میں میری آمد غیر متوقع تھی پھر بھی مجھے ٹھنڈا مشروب اور برف میں لگے آم پیش کیے گئے جن کا لُطف چلچلاتی گرمی ہی میں صحیح طور پر لیا جا سکتا ہے۔

معلوم ہُوا کہ ریذیڈنٹ کوئی ایک میل دُور مصروفِ شکار ہیں۔ ایک رہبر اور نیا تازہ دم گھوڑا لے کر میں اُن کی طرف چل دیا۔ جُوں ہی ہم گھنے جنگل میں پہنچے، میرے کانوں میں شیر کے ہانکے کے لیے ڈھول تاشوں کی آوازیں اور شور پڑا۔ گردن موڑ کر رہبر کو دیکھا تو معلوم ہُوا کہ وہ بھاگ چھُوٹا ہے۔ آخر اُتر کر گھوڑے کو ایک جھاڑی سے ڈِھیلا سا باندھا کہ اگر شیر اس راہ سے گزرے تو وہ اپنے آپ کو آزاد کر کے بھاگ جائے اور خود ایک نزدیکی پیڑ پر چڑھ گیا۔

اُس وقت گرمی انتہائی شدید تھی اور میرا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو کچھ دُور ایک اور شخص پیڑ پر لٹکتا نظر آیا۔ اب مجھے اندازہ ہُوا کہ وہ فائرنگ کے علاقے کی نشانی کے طور پر پیڑ پر بٹھایا گیا ہے اور میں اس وقت بندوقوں کی زد میں ہُوں۔

پیڑ سے مجھے ایک تالاب نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس شخص کو اشارے سے بُلایا اور اپنا ہیٹ دے کر پانی لانے کے لیے بھیجا۔ جلد ہی وہ شخص ہیٹ کو پانی سے بھر لایا۔ اس اثنا میں میں نے ایک واحد فائر کی آواز سُنی۔ ریذیڈنٹ نے شیر مار لیا تھا۔

جب میں اس مقام پر ریذیڈنٹ کو مبارک باد دینے پہنچا تو وہ میری اچانک آمد سے ہکّا بکّا رہ گئے۔

ایک مرتبہ شیر کے شکار کے دوران ایک ہاتھی مست ہو گیا۔ اُس نے اپنا ہودہ نوچ پھینکا۔ اُس پر سوار تمام افراد دھڑام دھڑام نیچے گرے۔ وہ تیز رفتار سے بھاگتا پہاڑ پر چڑھ گیا۔ دو آدمی اُس کے دونوں طرف لمبے لمبے بَلَم لیے دوڑ رہے تھے اور اپنی چیخ پکار سے اُسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اپنی ترنگ میں برابر اُوپر کی طرف دوڑتا ہُوا آخر پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی پر چڑھ گیا۔ ۲۴ گھنٹے تک اُسے وہیں کھڑا رہنے دیا گیا۔ پھر بڑی مشکل سے قابو کر کے نیچے لایا گیا۔

٭

باؤنڈری سیٹلمنٹ افسر کی حیثیت سے مجھے ایک خاص تنازع آج تک یاد ہے۔ یہ اُودے پور کے دو بڑے ٹھاکروں کے درمیان ایک قطعۂ اراضی سے متعلق تھا۔ فریقین میں سے کسی کے پاس ملکیت کا کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ معمول کے مطابق اُن میں سے ہر ایک نے جھوٹی شہادتوں کے انبار لگا دیے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں اس مقدمے کا کیا فیصلہ دُوں۔

ایک دن میں اُن دونوں ٹھاکروں کو شکار پر لے گیا۔ جب ہم ایک اُونچے شکار مینار پر جو راجپوتانہ میں عام ہیں، بیٹھے تو میں نے شکاری ہونے کی حیثیت سے اُن سے کہا: "آپ دونوں صاحبان خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ میں سے کسی کے پاس زمین کے اس ٹکڑے کی ملکیت کی کوئی حقیقی شہادت موجود نہیں۔ میں آپ کو کھلاڑی اور شکاری جذبے سے ایک پیشکش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں دیا سلائی کے اس بکس سے دو تیلیاں نکال کر ایک کی لمبائی قدرے کم کر دوں گا۔ آپ دونوں بطور قرعہ ایک ایک تیلی اُٹھائیں جو فرد لمبی تیلی اُٹھائے گا، متنازع اراضی اُسے دے دی جائے گی۔

میں نے اُن پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اس بنجر اور اُفتادہ زمین کی خاطر بندوبست کا وسیع کام رُکا ہُوا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دونوں نے میری تجویز قبول کر لی۔

✽

مجھے اس نوع کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ جب میں حد بندی کے سلسلے میں دُونوں فریق کے نمائندوں کی معیت میں گھوڑے پر سوار موقع معاینہ کے لیے گیا تھا۔ اثنائے راہ میں مجھے نمک بنانے کے دو کڑھاؤ نظر آئے۔ راجپوتانہ کے اس علاقے میں زمین شور زدہ ہے اور لوگ استعمال کا نمک خود تیار کرتے ہیں۔ کڑھاؤ دیکھتے ہی مَیں نے کہا "یقیناً کوئی شخص ان پر بھی اپنی ملکیت ثابت کر سکتا ہو گا۔ مَیں چاہتا ہُوں وہ ایسا کرے کیونکہ اس سے کسی فیصلے پر پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔

مَیں نے دیکھا کہ ایک فریق کے نمائندوں نے جھینپ کر سر جھکا لیے جبکہ دوسرے فریق کے نمائندوں نے بناوٹی انداز میں مُسکرانا شروع کر دیا۔

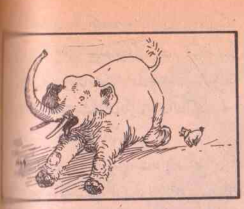

کیمپ واپس آ کر میں نے اس طرزِ عمل کے متعلق کھو...
تو یہ دلچسپ کہانی سُنی کہ کچھ سال قبل راجپوتانہ کی ریاستوں...
حکومتِ ہند کا یہ سرکلر پہنچا تھا کہ وہ اپنے علاقوں میں...
کیے جانے والے نمک کی قیمت سے حکومت کو آگاہ کر...
متذکرہ ریاست میں ایک وزیر کچھ ضرورت سے زیادہ...
اور فہیم تھے۔ اُنھوں نے اپنے حکمران کے کان میں یہ...
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی تیار شدہ نمک پر حکومت کوئی...
عائد کرنا چاہتی ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ ہم نمک کی سالا...
کم دکھائیں۔

ریاست والوں کے ہوش اُس وقت اُڑے جب...
نے اُنہیں اپنے اس فیصلے سے مطلع کیا کہ آئندہ وہ نمک کی...
بند کر دیں جو سالانہ رقم اُنھوں نے نمک کی پیداوار کی ظاہر کی...
اُس کے مطابق اُنہیں ہمیشہ معاوضہ ملتا رہے گا۔

نمک کے متعلق یہ واقعہ ایک لطیفہ بن گیا اور متعلقہ...
کو نمک کے کڑھاؤں کی ملکیت ظاہر کرتے انتہائی شرم...

✽

دَورے کے ایّام میں ایک دن گھوڑے پر سوار جا...
میری نظر ایک زمیندار پر پڑی جو سیاہ و سفید رنگ کی...
کرتے ہُوئے اُسے کنکریاں مار رہا تھا۔ اُس چڑیا کو راجپو...
رُوپاریل کہتے ہیں۔ میں نے پُوچھا بھئی یہ کیا کر رہے...
کہنے لگا: "دیکھیے صاحب، مجھے آج عدالت میں پیش ہونا ہے...
چڑیا کا بائیں طرف سے گزرنا سخت نحوست کی علامت ہے...
اسے بھگا کر دائیں طرف کر رہا ہُوں۔ اگر میں اس میں کامیاب...

...تو مجھے مقدمہ ہار جاؤں گا۔"

✽

بندوبست کے کام میں میرے مشاہدے میں یہ بات ...آئی کہ بعض اوقات اراضیات کی حد بندی کا فیصلہ بکرے کی ...سے بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے بکرے کو آگے کے ...دوڑاتے ہیں جو راستہ وہ اختیار کرتا ہے فریقین اُسے مینڈھ ...تسلیم کر لیتے ہیں۔

✽

ریاست میں اپنے دَوروں کے دوران مجھے ناتھ دوارہ جانے ...کا بھی اتفاق ہُوا جو ہندوستان کے امیر ترین مندروں میں سے ...ایک ہے۔ اُس کے مہا پروہت کو گوسائیں جی کے لقب سے ...پکارا جاتا ہے۔ وہ اس درجہ مقدس ہیں کہ کسی کو ہاتھ ملانے کی ...اجازت نہیں دیتے۔ شاید اسی لیے ملاقات کے دوران گوسائیں جی ...قالین سے جس پر میری کرسی بچھی تھی پرے ایک دوسرے قالین ...پر ڈال کر بیٹھے۔

...یہاں مورتی کے آگے جو کھانا رکھا جاتا ہے وہ مندر کے ...دو ہزار متوسلین کی خوراک کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ایک وسیع ...بڑے بڑے مرتبانوں میں مختلف قسم کے اچار اور ...جو بھگوان کے بھوجن میں کام آتی ہیں، بھری رکھی ہیں۔ ...مورت کا لباس روزانہ نئی پوشاک سے بدلا جاتا ہے اور ...ہُوئے کپڑے معزز زائرین کو تبرک کے طور پر تقسیم کیے ...ہیں۔

✽

اچانک مجھے بمبئی جا کر تقریباً ایک سو آسٹریلوی گھوڑوں کو ...اُس زمانے میں وِیلرز کہا جاتا تھا خریدنے کا حکم ملا۔ کچھ ...مہارانا کو اپنے لیے بھی درکار تھے۔

ہز ہائی نس نے مجھے ایک پُرانی قلمی کتاب جس میں مُوقلم سے ...پینٹ کی گئی تھیں دکھائی۔ کتاب میں گھوڑوں کے سعد و نحس ...نشانات جو مشرق میں گھوڑوں کے حُسن و قبح کی خاص علامات ...کیے جاتے ہیں نمایاں کر کے دکھائے گئے تھے۔

ہز ہائی نس نے گھوڑوں کو پرکھنے کے لیے اپنا منظورِ نظر چابک سوار، سائیسوں کی ایک پلٹن اور ایک بُوڑھے تجربہ کار ٹھاکر کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ روانگی کا دن جُوں جُوں قریب آتا گیا میں ٹھاکر صاحب کو برابر یاد دلاتا رہا کہ بمبئی میں گھوڑوں کا سودا چکانے کے لیے روپے کا بر وقت انتظام ہونا چاہیے۔ اُنھوں نے کہا: "صاحب! اس کے متعلق ایک مرتبہ عرض کر چکا ہُوں۔ اب دوبارہ عرض کرنے کی جُرأت نہیں، تاہم آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ٹھاکر صاحب اپنے آقا کے مزاج شناس تھے۔ اُن کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ ہر اُس دوا کی پہلی خوراک نوش کریں جو مہارانا کے لیے تجویز کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کا اقرار کرتے ہُوئے اُنھوں نے بتایا تھا: "جب جُلّاب لینا ہوتا ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

خدا خدا کر کے آخر روانگی کا دن آ پہنچا۔ روپے پیسے کی سُن گُن لیے بغیر ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ چلی لیکن یکایک ایک شور و غل بپا ہُوا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکلنے سے پہلے ہی اُسے واپس اسٹیشن پر لا کھڑا کیا گیا۔ عین اُس وقت محل کا ایک ہرکارہ مجھے ایک چھوٹا سا صندوقچہ تھما کر رُخصت ہو گیا۔ مجھ سے کوئی رسید طلب کی نہ مہارانا کی کوئی ہدایت دی۔

گاڑی دوبارہ چلی تو میں نے صندوقچہ کھولا۔ اُس میں ایک لاکھ روپے کے نوٹ اور ایک پستول تھا۔ بمبئی پہنچنے پر اسٹیشن سے سیدھا بنک گیا اور منیجر سے ملاقات طلب کی۔ جب میں نے کہا مَیں ایک لاکھ روپے کے نوٹ جمع کروانا چاہتا ہُوں تو منیجر صاحب نے مجھے بڑے شک کی نظر سے دیکھا اور خاصی دیر تک انتظار کروایا۔ شاید اس عرصے میں وہ یہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے کہ کہیں یہ نوٹ چوری کے تو نہیں تھے؟

وہ زمانہ میری نوجوانی کا تھا۔ مَیں اس سے قبل کبھی اُن سِکھے وِیلروں کی خرید کے لیے بمبئی نہیں گیا تھا۔ یہ گھوڑے بالکل ہی جنگلی تھے۔ پھر بھی مَیں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ ہر گھوڑے پر خود سوار ہو کر دیکھوں گا۔ اس مقصد کے لیے اگلی صبح ہوٹل لاؤنج میں گھڑ سواری

کے بُوٹ پہن کر پہنچا۔

میری خوش قسمتی کہ اچانک کرنل جم کروفٹس جن کی کچھ کہانیاں مجھے سُنائی ہیں، ٹکر گئے۔ اُنہوں نے مجھے سمجھایا کہ جو گھوڑے دیکھنے جا رہے ہیں اُن پر کبھی کاٹھی نہیں کسی گئی۔ اُن پر سوار ہو کر ناحق کیوں ناک سر تُڑوانے کے درپے ہو۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

تقریباً تین دن ہمیں گھوڑوں کے انتخاب میں لگے۔ جب مہارانا کے استعمال کے گھوڑوں کے انتخاب کی باری آئی تو چابک سوار نے اُن پر سوار ہونے کا اصرار کیا۔ مَیں نے اُسے باز رکھنے کے لاکھ جتن کیے مگر کچھ پیش نہ گئی۔ وہ نوخیز وحشی بچھیروں میں سے ایک اُچھلتا کُودتا بچھیرا پکڑتا، کچھ دُور اُسے پیدل لے کر چلتا، پھر اُس پر کاٹھی کس کر آرام سے سواری کرتا۔ اصطبلوں میں موجود تمام آسٹریلین یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ہر جانور اُس کے ہاتھوں میں بھیڑ بن جاتا ہے۔

میرا خیال ہے یہ اس لیے ممکن ہُوا کہ بُڈھا ہمہ وقت افیم کے نشے میں ڈوبا رہتا تھا اور اس حالت میں اُسے کسی قسم کا ڈر یا خوف لاحق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب خریداریاں مکمل ہو گئیں تو مَیں نے بِل طلب کیے اور ادائیگی نوٹوں سے کی جو مَیں نے ایک دن قبل بنک سے نکلوائے تھے۔ آسٹریلوی سوداگر نے کہا ہمیں تو آپ سا گاہک درکار ہے جو ایک ہاتھ میں لگام تھام کر دوسرے سے پیسہ دینا جانتا ہو۔

شہنشاہ اکبر اور اُس کے مشہور وزیر بیربل کے متعلق ایک دلچسپ کہانی بیان کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے ایک سوداگر کے گھوڑے معاینہ کرنے کے بعد اُس سے پُوچھا کہ وہ اچھے قسم کے گھوڑے کیوں نہیں لایا؟ سوداگر نے جواب دیا جہاں پناہ! اس کے لیے میرے پاس مناسب رقم نہیں تھی۔ اگر حضور ایک لاکھ روپیہ پیشگی عنایت فرما دیں تو آئندہ اعلیٰ ترین جانور ملاحظہ کے لیے پیش کروں گا۔

شہنشاہ نے حکم دیا اس سوداگر کو ایک لاکھ روپیہ پیشگی دیا جائے۔ جب یہ فرمان بجا لایا گیا تو بیربل کے ایک دُشمن نے شہنشاہ سے عرض کی کہ بیربل نے اپنے روزنامچے میں حضور کو ا... لکھ دیا ہے۔

بادشاہ کو بہت غصّہ آیا۔ بیربل کو طلب کر کے فوراً روز... پیش کرنے کو کہا تو وہاں عین اُسی جگہ لکھا تھا: "بادشاہ احمق..."

شہنشاہ نے کہا: "تمہیں وفادار سمجھنے میں ہمیں دھوکا ... تم اس کی وضاحت کرو ورنہ تمہاری گردن مار دی جائے گی۔"

بیربل نے عرض کی: "عالی جاہ! وہ روزنامچہ نجی تھا مگر ... میرے دشمنوں نے یہ طوفان کھڑا کر دیا ہے تو اب مَیں اس کی وضاحت پیش کرتا ہُوں۔ پچھلے دن حضور نے گھوڑوں کے ایک اجنبی سوداگر کو جسے شاید ہم کبھی نہیں دیکھیں گے ایک لاکھ رو... پیشگی عطا فرمایا۔ یہ فعل مجھے نہایت احمقانہ معلوم ہُوا۔ یہی اس کی توضیح ہے۔"

شہنشاہ نے کہا "تم لوگوں کے کردار کا اندازہ لگانے کے قابل نہیں ہو۔ یہ صرف بادشاہوں کا وصف ہے۔ بتاؤ اگر ... نے میرے اعتماد کو مجروح نہ کیا اور اگلے سیزن پر بہترین گھوڑ... کر دیے پھر تم کیا کرو گے؟"

"یہ تو بہت سہل کام ہے۔ مَیں حضور کا نام مٹا کر اُس کا نام لکھ دُوں گا۔" بیربل نے جواب دیا۔

کرنل جم کروفٹس آئی ایم ایس راجپوتانہ میں اُن دنوں ایک ... مشہور و معروف شخصیت تھے۔ وہ کوئی ۶ فٹ ۶ انچ لمبے اور ... مناسبت سے تن و توش کے مالک تھے۔ اُن کے بہت ... مشہور تھے۔

ایک مرتبہ اُنہوں نے اشتہار دیا:

"ضرورت ہے، غصیلے، تُند اور شریر ولیر گھوڑوں کی۔ ... کم دی جائے گی۔" اُس زمانے میں آسٹریلیا کے گھوڑے بڑے ... شریر اور عیبی ہوتے تھے۔ جلد ہی اُن کے پاس ویلروں کا خاصا بڑا گلّہ اکٹھا ہو گیا جنہیں اُنہوں نے سدھا کر بڑے اچھے داموں فروخت کر دیا۔

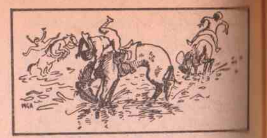

گھوڑے سدھانے میں اُن کا طریقہ کار بھی لاجواب تھا۔ گدگرے ... گھوڑوں کو وہ کمر تک پانی میں دُھلکوا دیتے جہاں ایک کے بعد ایک سائیس تواتر سے اُن پر سوار ہوتا وہ اُسے پانی میں ... لیتے رہتے مگر اس عمل سے سائیسوں کو کوئی گزند نہ پہنچتی۔ ... عرصے بعد گھوڑے تھک کر چُور ہو جاتے اور اُچھل کُود کا کھیل ختم ہو جاتا۔

جو اکھڑ اور ہٹیلے گھوڑے اس عمل سے ٹھیک نہ ہوتے اُن کے لیے کرنل صاحب نے ایک آہنی پنجرہ بنوایا تھا جو لوہے ... کے سریے پر کس دیا گیا تھا۔ یہ وصفی رہٹ کی طرح ... والی ایک چرخی سے جڑی ہُوئی تھی۔ گھوڑے کو پنجرے ... اُسے تیز تیز گھمیٹے دیتے کہ گھوڑا ایسا چکراتا کہ اُسے کھڑا ... دشوار ہو جاتا۔ جب وہ اس حال پر پہنچ جاتا تو باہر نکال کر ... اری کی جاتی۔ غریب کا سر اس بُری طرح چکرایا ہُوا ہوتا کہ وہ ... شوخیاں بھُول جاتا اور خاموشی سے چلتا رہتا۔

جم کروفٹس کے ایک موٹے سے بٹلر سے شناسائی تھی۔ اُس ... بتایا کہ جب جم کروفٹس صاحب بہادر نے یہ پنجرہ بنوایا تو ... میں ڈال کر تجربتاً چکر دلوائے۔ بٹلر کو گھمنی چڑھی اور ... طبیعت بگڑنے لگی تو کروفٹس صاحب پنجرے کی کارکردگی ... طرح مطمئن ہو گئے۔

جم کروفٹس تین بھائی تھے۔ تینوں دیوپیکر تھے۔ سب سے چھوٹا بی بی اینڈ سی آئی ریلوے میں ڈاکٹر تھا۔ موصوف کا قد ۶ فٹ پانچ انچ تھا۔

ایک شام کھانے کے بعد سگریٹ نوشی کے اثرات پر بات چلی تو کروفٹس نے اپنے مخصوص آئرش لہجے میں کہا کہ مَیں نے ۵ برس کی عُمر میں سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی کیونکہ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ اس سے تمہاری بڑھوتری رُک جائے گی۔

گھوڑوں کو بمبئی سے اُودے پور آئے ہُوئے کچھ ہی عرصہ ہُوا تھا کہ ہز ہائی نس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ مَیں محل جا کر یہ گھوڑے اُنہیں دکھاؤں۔ اس موقع پر اُنہوں نے کمال ہوشیاری سے یہ اُگلوا ہی لیا کہ میرے نزدیک کون سا گھوڑا بہترین ہے۔ کوئی ایک ماہ بعد وہ گھوڑا میرے بنگلے کے احاطے میں اُن کی طرف سے بطور تحفہ پہنچا دیا گیا۔

مہارانا اُودے پور ایک عظیم شکاری تھے جنہیں جنگلی سؤر کو بَلم سے شکار کرنے کا بھی شوق تھا۔ اُن کے ماتھے پر ایک گہرا نشان اسی شغل میں ایک حادثے کی بدولت پڑا تھا۔

مَیں اُن کے ہمراہ ناہر ماگرا شکارگاہ میں گھوڑے پر سوار ہانکے کے علاقے میں جا رہا تھا۔ اس دوران مَیں نے اُنہیں بتایا کہ میرے ایک دوست ٹی سی ایڈورڈز نے مجھے پیدل سؤر مارنے کا ایک طریقہ سکھایا ہے جس میں دو آدمی سؤر کی طرف زاویۂ قائمہ بناتے ہُوئے بڑھتے ہیں۔ جب وہ اُن میں سے ایک پر حملہ آور ہوتا ہے تو ایک شخص اُس کا حملہ بَلم سے روکتا ہے۔ اس اثنا میں دوسرا شکاری جھپٹ کر پاکھے کے نیچے سے بَلم اُس کے دل تک اُتار دیتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نے ایک سؤر کا پیچھا کر کے اُس کو گھائل کر دیا۔ اُس نے کانٹوں دار جھاڑی کی آڑ لے لی۔ مہارانا نے کہا "مَیں چاہتا ہُوں کہ آپ اسے پیدل مارنے کا مظاہرہ کریں۔" وہ یقیناً یہ بھُول گئے تھے کہ مَیں نے اس قسم کے عمل کے لیے دو آدمیوں کا ہونا ضروری بتایا تھا۔

اب اچانک اتنے سارے آدمیوں کے سامنے میں نے اس بات کی وضاحت کرنا مناسب نہ سمجھا اور تن بہ تقدیر گھوڑے سے اُترا۔ میرا دل بُری طرح اُچھل رہا تھا، تاہم سؤر کی طرف بڑھا۔ قسمت نے یاوری کی وہ پہلے ہی اتنا شدید گھائل تھا کہ اُس میں اب جھپٹ کر حملہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

میں نے پاکھے کے پیچھے بلّم گھونپ کر اُسے مار دیا۔ اس کے بعد میں نے ہزہائی نس کو یاد دلایا کہ اس قسم کے شکار کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوراً یہ بات اُنہیں یاد آ گئی اور اُنہوں نے ندامت اور خجالت سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہُوئی بعرصہ تک جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی وہ اس واقعے پر افسوس ظاہر کرتے رہے۔

❁

ناہر ماگرا یعنی شیر کی پہاڑی کے قریب جنگل میں ایک چھتری بنی ہُوئی ہے۔ یہاں ایک راجپوت سردار کی ارتھی پھونکی گئی تھی۔ یہ گزرے وقت کی بات ہے کہ مہارانا اُودے پور اور اُن کے خاص باج گزار راول آف سلامبر کے درمیان عداوت کے پیچ پڑے ہُوئے تھے اور تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ ایک موقع پر مہارانا ناہر ماگرا پر خیمہ زن تھے کہ سلامبر کے راول کی ڈیوٹی اُن کی مصاحبت کے لیے لگی۔ مہارانا نے اچانک اُنہیں اپنے ساتھ جنگل میں چہل قدمی کی دعوت دی۔ راول اُن کے ساتھ ہو لیے۔

کچھ دُور نکل کر مہارانا نے یکایک اُن کے مقابل آ کر اپنی ہتھیلی ... دو سفید گولیاں پیش کیں اور اُنہیں مخاطب کرتے ہُوئے کہا ... درمیان یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکتی۔ تم ایک ... اُٹھا لو۔ ایک میں۔ ایک گولی زہریلی دوسری بے ضرر ہے۔" راول نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے سردار ہیں۔" پھر اُس ... دونوں گولیاں جھپٹ کر نگل لیں اور اپنی زندگی ختم کر لی۔ اس ... کی یاد میں یہ یادگار چھتری آج بھی ایستادہ ہے۔

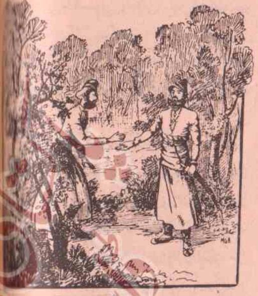

❁

اُودے پور میں دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ... ہے جو دارالحکومت سے کوئی ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس ... کناروں پر گھنا جنگل اور درمیان میں ایک پہاڑی جزیرہ ... پتھر کا وہ بند جو تقریباً سو فٹ گہرے پانی کو جھیل میں ... ہُوئے ہے زمانہ گزرا ایک بڑے قحط کے دوران تعمیر کیا گیا ... اس کی دیوار پر جو کتبہ لگا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ قحط ... تھا کہ آدمی کو آدمی کھا رہا تھا۔

مہارانا اکثر از راہِ مہربانی مجھے جھیل جے سمند میں ا... شکار کھیلنے مدعو کر لیا کرتے تھے۔ اُن کے شکار گاہ کا نظام ... تھا۔ ہر صبح تقریباً ۹ بجے میر شکار حاضر ہو کر ایک نقشہ پیش ... جو مختلف حصّوں میں منقسم ہوتا تھا۔ نقشے میں ہر بلاک کو ایک نمبر ...

...شکار ہر حصّے میں موجود جانوروں کے نام ایک فہرست سے ...ہوتا۔ اُس کے لیے یہ رپورٹ دینا اس لیے ممکن تھا کیونکہ ...گاہ کے ہر حصّے کے گرد ریتیلے راستے بنے ہُوئے تھے۔ یہ ...کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ علی الصبح گھوڑے پر سوار ہو کر علاقے کا ...لے کر یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ کس قطعے کے ریتیلے راستوں پر ...ن جانوروں کے پیروں کے نشانات بنے ہُوئے ہیں۔

مہارانا رپورٹ سُننے کے بعد یہ فیصلہ کرتے کہ کس قطعے کا ہانکا ...یا جائے۔

❁

سینکڑوں برس گزرے، اُودے پور کی ایک راجکماری بڑی ...ن و جمیل تھی۔ دو نہایت طاقت ور مہاراجے اُس کا آنچل تھامنے ...ئلی تھے۔ اُس زمانے کے مہارانا کچھ زیادہ طاقت ور حیثیت ...کے مالک نہیں تھے۔ اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ کس کو شرفِ دامادی ...ا جائے، بڑی اُلجھن کا سودا تھا۔ اگر ایک کو بیٹی دیتے ہیں تو دوسرے ...دشمنی کا سامنا ہے۔ بہت لوگوں سے مشورہ کیا گیا مگر کسی نے بھی ...کوئی موزوں حل نہ بتایا۔ آخر دربار کے ایک بوڑھے بُزرگ نے ...مشورہ دیا کہ راجکماری کو قتل کر دیا جائے۔ یہی اس مسئلے کا حل ہے۔ ...ٹک آ کر مہارانا نے اپنی ابدی رسوائی کا سامان کر ہی لیا اور ...اری کو زہر دے دیا گیا۔

ریاست میں ایک سن رسیدہ امیر دارالحکومت سے چند میل ...رہتے تھے۔ اس بُزدلانہ مشورے کی خبر جب اُنہیں ہُوئی تو ...ی اور طوفان کی طرح اُڑ کر اُنہوں نے راجکماری کے اس انجام ...نے کی کوشش کی مگر اُن کے پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو ...قسمت کا لکھا پُورا ہُوا۔ رنج و غم میں امیر نے حکمران خاندان کو ...دی کہ اب اُن کے تخت کو کوئی براہِ راست وارث نصیب ...گا۔ آخری تخت نشینی سے پہلے تک جس میں سر بھوپال سنگھ جی ...والد سر فتح سنگھ جی کے تختِ سلطنت کے وارث ہُوئے یہ ...حقیقت بنی رہی۔

ایک دن نصف شب محل سے بُلاوا آیا اور مجھے مہارانا ...سنگھ جی کے رُوبرو حاضر کیا گیا۔ اُس وقت وہاں اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اُنہوں نے اس ناوقت زحمت دینے پر معذرت کی اور اپنے عمومی مہربان لہجے میں کہا: "ایک مشورہ درکار ہے اگر آپ چاہیں تو آپ کو آزادی ہے نہ دیں۔" پھر مہارانا نے بددُعا کے متعلق وہی کہانی سُنائی جو میں اُوپر بیان کر چکا ہُوں۔ اس کے بعد بولے: "خدا کے کرم سے اب میں ایک بیٹے کا باپ ہُوں اور اسی اُمید پر زندہ ہُوں کہ یہ بددُعا ختم ہو جائے گی مگر اب یہی فرزند سخت بیمار ہے اور ریذیڈنسی سرجن نے آج یہ الٹی میٹم دیا ہے کہ اگر بچّے کا کل صبح ۹ بجے تک آپریشن نہ کیا گیا تو اس کی زندگی کی وہ کوئی ذمّے داری نہیں لے سکتے۔"

مہارانا نے کہا: "یہاں دوسرا کوئی ڈاکٹر نہیں۔ سوچیے داؤ پر کیا لگا ہُوا ہے! میں چاہتا ہُوں دوسرا کوئی ڈاکٹر بھی موجود ہو۔ میں نے اپنے پُرانے دوست کرنل پینک کو جو جے پور کے ریذیڈنسی سرجن ہیں تار دیا تھا۔ مگر اُنہیں بخار ہے اس لیے نہیں آ سکتے۔ اب صاحب، آپ صلاح دیجیے کیا کیا جائے۔"

چونکہ اُس رات میں نے ریذیڈنسی میں کھانا کھایا تھا اس لیے میں ہزہائی نس کو یہ بتانے کے قابل ہُوا کہ کرنل پینک نے ایک اور تار سے اطلاع دی ہے کہ وہ ایک اسپیشل ٹرین سے تشریف لا رہے ہیں۔

بالآخر کرنل پینک تشریف لائے۔ محل کا ایک کمرہ آپریشن تھیٹر میں تبدیل کر دیا گیا۔ آپریشن کی میز پر ہندوستان کے ایک انتہائی قدیم ہندو خاندان کی تمناؤں کا چراغ اور سینکڑوں سال بعد ایک مہارانا کا پہلا لڑکا پڑا تھا۔

اس لمبے کمرے کے ایک کونے پر پردے آویزاں کر دیے گئے تھے جن کے پیچھے مہارانا اور اُن کے کچھ اُمرا پُورے درباری لباس میں سکتے کے عالم میں خاموش کھڑے تھے۔

ریذیڈنسی سرجن میجر وُولبرٹ نے آپریشن کر کے ولی عہد کی جان بچا لی۔ آپریشن کے دوران لاشعوری طور پر وہ اپنی بھونڈی آواز میں "میری ہیڈ اے لٹل لیمب" (میری کے پاس تھا ایک ننھا سا میمنا) گاتے رہے۔

کچھ عرصے بعد مجھ سے کہا گیا کہ کسی طرح میجر وُولبرٹ کو فوٹوگراف

مشین پر جو ہمارے آج کے گراموفون کی پیشرو تھی، وہی گیت گانے پر راضی کر لوں تو بات ہے۔ انہیں پھسلانے میں مجھے بڑا وقت لگا کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ انہیں گانا نہیں آتا اور وہ یہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھے کہ کبھی اُنہوں نے "میری ہیڈ اے لٹل لیمب" والا گیت گایا تھا۔

آخر میں اُنہیں راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وولبرٹ کے گیت کا ریکارڈ بھرا گیا جسے محل میں ایک قیمتی شے کی طرح محفوظ کر لیا گیا۔

کچھ برس گزرنے کے بعد جب میرا دوبارہ اُودے پور جانا ہوا تو میں نے ریکارڈ کے متعلق دریافت کیا تو سُرخ مخمل کی ایک تھیلی میں وہ میرے سامنے لایا گیا۔ سخت گرمی کے باعث یہ چٹخ گیا تھا۔ جب اُسے بجایا گیا تو میجر وولبرٹ کی بھونڈی آواز نے کہا "میری ہیڈ اے لٹل لیمب۔"

پھر جب وہ دوسرے مصرع یعنی "اِٹس فلیس (اُس کی اُون) پر پہنچے تو ریکارڈ کی درز کے باعث اس کی تکرار ہونے لگی۔ اٹس فلیس ... اِٹس فلیس ... حتیٰ کہ ایک بوڑھے راجپوت نے جو ولی عہد کا اردلی تھا سوئی درز سے ہٹائی تو میجر وولبرٹ نے ہمیں بتایا کہ "اٹس فلیس واز وہائٹ ایز سنو" (یعنی اُس کی اُون برف کی طرح سفید تھی)

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض ایک تجسّس نہ تھا جس نے ڈاکٹر کی آواز ریکارڈ کروانے پر اصرار کیا بلکہ یہ اس ایقان کے تحت تھا کہ اس گیت میں کوئی رُوحانی طاقت تھی جس نے اس آپریشن کو کامیاب بنایا۔

مہارانا سر فتح سنگھ جی حقیقت میں ایک شاہانہ مزاج رکھتے تھے۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی تاجِ برطانیہ کے انتہائی وفادار تھے۔ مہارانا سروپ سنگھ جی نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں قریبی نیمچ چھاؤنی کے تمام انگریز عورتوں اور بچّوں کو "جگ مندر" میں جائے امان مہیا کی تھی۔ جگ مندر اُن خوب صورت محلوں میں سے ہے جو اودے پور کی جھیل پچولا کے خوابناک پانیوں کے درمیان جزیروں پر ایستادہ ہیں۔

اُودے پور اُن ہندوستانی ریاستوں میں سے ایک جو مالی نقصان کے باوصف اپنے سکّے خود ڈھال کر اپنی آن قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اُودے پور کے سکّوں پر دوستی لندن کا روایتی فقرہ کھدا ہوا ہے۔

ایک مرتبہ برطانوی شاہی خاندان کے ایک شہزادے اُودے پور تشریف لائے۔ اتفاقاً بن مُرغیوں کے شکار کے دوران اُن کی گولی ایک قُلی کے پھیپھڑے کے پار ہو گئی۔ شہزادے کے ذاتی افسر نے قُلی کو پانچ روپے بطور انعام عطا کیے۔ جب مہارانا کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو اُنہوں نے قُلی کو بلوا کر ۵۰۰ روپے یہ کہہ کر انعام دیے کہ ۵۰۰ روپے کے بجائے پانچ روپے غلطی سے دے دیے گئے تھے۔

تاریخ شاہد ہے اُودے پور کے شاہی گھرانے نے کبھی باجگزاری یا چاپلوسی میں کسی کی وفاداری کی ہامی نہیں بھری۔

ایک سے زائد مرتبہ جب اس قلعے کی مدافعت اُن کے لیے ممکن نہ رہی تو اُنہوں نے اپنی عورتوں کو خود ختم کر دیا اور دروازے کھول کر باہر نکل کر لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہزاروں عورتیں مہارانی کی سربراہی میں بہترین پوشاکیں اور زیورات زیبِ تن کر کے اُس لمبی سرنگ میں داخل ہوئیں جو محل کو اُس چشمے سے جسے گیؤمکھ کہا جاتا ہے ملحق کرتی تھی۔ اُس چشمے پر کبھی وہ پردے میں غسل کیا کرتی تھیں۔ یہاں اُن کے مردوں نے دیواریں چُن کر اُنہیں محبوس کر دیا اور وہ آج بھی وہیں ہیں۔ اس بدقسمت چھتی ہوئی گزرگاہ کے پاس کھڑے ہو کر میری طرح آپ بھی صدیوں پہلے گزری اس قربانی کی رُوح سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

جب حکومتِ ہند نے مہارانا پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے ولی عہد کی تعلیم کا معقول بندوبست کریں تو اُنہوں نے

دُوسرے کی حکمت پر عمل پیرا ہو کر مجھے باؤنڈری سیٹلمنٹ افسر، سپرنٹنڈنگ افسر محکمہ آبپاشی، کانفیڈنشل سیکرٹری وغیرہ کی ذمّے داریوں کے علاوہ ولی عہد کی اتالیقی بھی سونپ دی۔

تین سال تک میں نے ولی عہد کو جنہیں اُودے پور کے عوام پیار سے باپ جی پکارتے ہیں پڑھایا۔ وہ میرے سب سے ذہین شاگرد ہیں۔ اب مہارانا سر بھوپال سنگھ جی ہیں۔

جب ہندوستان کے ہندو راجاؤں میں صرف اُودے پور کے مہارانوں نے تنہا مسلمان شہنشاہوں سے ٹکر لی تو اُس وقت اُنہوں نے قسم اُٹھائی تھی کہ وہ جب تک چتوڑ گڑھ واپس نہ لے لیں گے کبھی دہلی نہیں جائیں گے کیونکہ دہلی جانا اس زمانے میں اطاعت کی علامت تصوّر کیا جاتا تھا نیز یہ کہ وہ چٹائی پر سوئیں گے اور پتل پات کھائیں گے۔

عظیم بادشاہ شاہجہان کا ولی عہدی کے دَور میں جب اپنے باپ سے جھگڑا ہوا تو اُس نے اپنے خاندان کے پشتینی دُشمن مہارانا اُودے پور کے ہاں پناہ لی۔

مہارانا نے باغی شہزادے کو عزّت و احترام سے جھیل پچولا میں ایک جزیرے پر بنے محل جگ مندر میں ٹھہرایا۔ اُودے پور کی روایتی مہمان نوازی کے جذبات سے سرشار ہو کر مہارانا نے شہزادے کے لیے جزیرے میں خاص طور پر ایک مسجد تعمیر کروائی۔ یہ مسجد آج بھی ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت جب اس خوبصورت جھیل کا پانی خامشی اور سکون کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو شہزادے کی سجدہ ریزیوں کی یاد میں مسجد سے نقارے کی صدا بلند ہوتی ہے۔

حقیقت میں اُودے پور ہی وہ مقام ہے جہاں جہانگیر کی وفات کی خبر پہنچتے ہی شاہجہان کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ یہیں جذبۂ دوستی و تشکّر کے اظہار کے طور پر شاہجہان نے مہارانا سے پگڑی بدلی۔ آج نہایت حفاظت سے یہ پگڑی اُودے پور کے عجائب گھر کی زینت ہے۔

تخت نشین ہونے کے کچھ عرصہ بعد شاہجہان نے دہلی سے اُس وقت کے مہارانا اُودے پور کو لکھا کہ وہ اپنے دربار میں اُودے پور کے دوستوں کی غیر موجودگی کو بُری طرح محسوس کرتا ہے۔ اُس نے بڑی ملاطفت سے مہارانا کو اپنے ولی عہد کو دہلی بھیجنے کی تاکید کی۔ یہ ایک بڑی سیاسی چال تھی۔ شاہجہان جیسے طاقتور بادشاہ کی استدعا کو ٹھکرانا ممکن نہیں تھا، اس لیے بڑی حیص بیص کے بعد اُس زمانے کے باپ جی دہلی بھیج دیے گئے۔

اس واقعہ کو صدیاں بیت چکی ہیں مگر آج بھی اُودے پور کے دربار میں اس قدیم خاندان کے کسی ولی عہد کے لیے نشست کا انتظام محض اس لیے نہیں کیا جاتا کہ ایک ولی عہد دہلی گیا تھا۔

کوئی مہارانا کبھی دہلی نہیں گیا تھا۔ لارڈ کرزن کو بڑا اشتیاق تھا کہ آنجہانی مہارانا سر فتح سنگھ جی ۱۹۰۲ء کے عظیم دربارِ دہلی میں شمولیّت کریں۔ اس کے لیے ذاتی طور پر وہ مہارانا سے درخواست کر چکے تھے۔ باوصف اس کے کہ مہارانا کے لیے اُودے پور سے دہلی تک کا سفر انتہائی پُرصعوبت تھا کیونکہ قدیم انداز کے ہندو ہونے کے باعث لازم تھا کہ وہ ٹرین سے اُتر کر دھرتی ماتا پر قدم رکھ کر مُنہ ہاتھ دھوئیں، کپڑے تبدیل کریں اور کھانا تناول فرمائیں، اُنہوں نے دربار میں شرکت کی ہامی بھر لی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اُن کے والد دربارِ دہلی منعقد ہونے سے کچھ ہی پہلے فوت ہو گئے۔ اُودے پور کے رسم و رواج کے مطابق چالیس دن تک وہ اُودے پور سے باہر نہیں جا سکتے تھے مگر لارڈ کرزن نے ایک اور راجپوت حکمران سے مشورہ کر کے مہارانا کی حاضری پر زور دیا۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس حکمران سے مشورہ لیا گیا ہے وہ مہارانا اُودے پور کا پشتینی دُشمن ہے۔ بہرحال مہارانا کو حکم ماننا پڑا۔

دہلی پہنچنے پر مہارانا پر بخار کا شدید حملہ ہوا جس کی تصدیق اُن دو ڈاکٹروں نے کی جنہیں لارڈ کرزن نے اس کام کے لیے متعین کیا تھا۔ آخر الامر مہارانا بہ نفسِ نفیس دہلی پہنچ کر بھی دربار میں شریک نہ ہو سکے۔ ●●

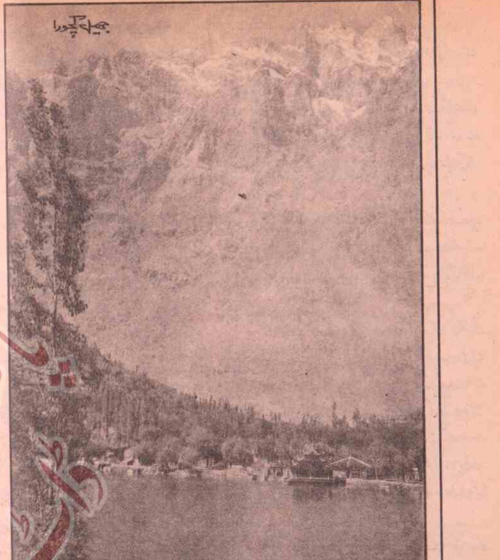

بدلا بدلا بلتستان

پاکستان کے حساس شمالی علاقوں کا ایک جیتا جاگتا سفر جو ایک انوکھی اور طلسمی دنیا سے آشنا کرتا ہے۔

پروفیسر محمد سلیم

رمضان شریف کو رخصت ہوئے تین چار دن ہوئے تھے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سیاحت کلب کا اجلاس طے پایا۔ سبھی ارکان فرصت دار اور وقت کے پابند نکلے۔ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ وادیٔ کاغان اور گلگت و ہنزہ کے بعد اب کہاں کا سفر کیا جائے۔ بیشتر ارکان کی خواہش تھی کہ سیاحت کا ویزا لے کر چین کی سیر کرلی جائے۔ چین ہمارا ہمسایہ ملک ہے اور وہ ایک نئے معاشرے کی تعمیر کا تجربہ کر رہا ہے۔ اس لیے وہاں کی عوامی زندگی کا مطالعہ کرنا اہلِ فکر کے لیے بہت ضروری ہے۔

میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ سفرِ چین کے متعلق پہلے مصدقہ معلومات حاصل کی جائیں یعنی اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ چین کا ویزا کہاں سے ملتا ہے۔ کتنے روز چین میں ٹھہرا جا سکتا ہے اور اس سفر کے اخراجات کا تخمینہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے سیاحت کلب کے روحِ رواں اور مینیجنگ ڈائریکٹر پروفیسر عظمت کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ ٹورازم ڈیپارٹمنٹ سے یہ ساری تفصیلات معلوم کریں۔ ساتھ ہی اس بات کا فیصلہ بھی ہوا کہ کلب کے جن ممبران نے ابھی تک اپنا پاسپورٹ نہیں بنوایا وہ فی الفور پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کرادیں۔

عظمت صاحب کی تگ و دو کے نتیجے میں پتہ چلا کہ ویزا چینی سفارتخانے سے مل سکتا ہے جو اسلام آباد میں واقع ہے لیکن ساتھ ہی یہ انکشاف ہوا کہ سفر کے لیے پانچ سو ڈالر کا زرِ مبادلہ حکومتِ چین کے پاس جمع کرانا پڑے گا جو خنجراب سے آگے ہمارا دورہ کنڈکٹ کرے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فی کس ساڑھے آٹھ ہزار روپے تو حکومتِ چین کو ادا کرنے پڑیں گے اور باقی اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے ——— نیز ہمارا یہ سفر آزاد نہیں ہوگا بلکہ سفر کا پورا پروگرام حکومتِ چین مرتب کرے گی۔ گاڑیاں بھی اُسی کی ہوں گی اور ہوٹل کا انتخاب بھی اُسی کی صوابدید پر ہوگا یعنی وہ ہمیں جہاں لے جانا چاہے گی جانا ہوگا جس سے ملانا چاہے گی اُس سے ملنا ہوگا جہاں ٹھہرانا چاہے گی وہیں ٹھہرنا ہوگا۔ اس قسم کے سفر کا ہمیں لطف نہیں آتا۔ ہم تو آزاد پنچھیوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں۔ جس جگہ جتنے دن جی چاہے قیام کرتے ہیں۔ جب دل بھر جائے تو اگلی منزل کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ جس ہوٹل میں جی چاہے قیام کرتے ہیں۔ کھانا تمام ہوٹلوں کا ٹیسٹ کرتے ہیں جس ہوٹل کا اچھا لگے وہیں سے کھا لیتے ہیں۔ مقامی لوگوں سے پوچھ پوچھ کر قابلِ دید جگہوں کے لیے رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔ ہمیں وہ سفر کیسے قبول ہو سکتا تھا جس میں ہمارے انتخاب کی گنجائش ہی موجود نہ ہو؟ لہٰذا چین جانے کا ارادہ منسوخ ٹھہرا۔

سوال پھر اُٹھا کہاں چلا جائے؟ پاکستان کے شمالی علاقے سیاحوں کی جنت کہلاتے ہیں۔ گلگت اور ہنزہ ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ اب بلتستان اور چترال باقی رہ گئے تھے۔ چترال کی سب سے بڑی کشش کافرستان کی وجہ سے ہے جہاں پہنچ کر اکثر لوگوں کا دل کافر ہو جانے کو چاہتا ہے لیکن احباب کا خیال تھا کہ فی الحال ایمان خطرے میں نہ ڈالا جائے، اس لیے قرعۂ فال بلتستان کے حق میں نکلا۔ بلتستان پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ یہ علاقہ بہت دشوار گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادی لحاظ سے بھی نہایت پسماندہ شمار ہوتا ہے۔ سیاحت کے شوقین اسے "ٹھنڈی جنت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں کے پُر فضا مقامات انتہائی دلکش ہیں۔ مشرق میں اس کی سرحد لداخ سے ملتی ہے۔ مغرب میں گلگت واقع ہے۔ شمال میں چین کا صوبہ سنکیانگ آباد ہے اور جنوب میں مقبوضہ کشمیر۔ اسے تبتِ صغیر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن تبت کے باشندوں سے ملتا جلتا ہے۔

بلتستان کا تعارف

بلتستان کا کل رقبہ ۲۶۱۹۴ مربع میل اور آبادی دو لاکھ کے قریب ہے جو سو فیصد مسلمان ہے۔ یہاں ملک بھر میں سب سے زیادہ سردی پڑتی ہے۔ سردیوں میں درجہ حرارت منفی ۲۰ درجے سنٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ سال کے چھ مہینے برفباری کا موسم رہتا ہے اور لوگوں کی زندگی گھروں تک محدود ہو جاتی ہے۔ اسکردو ضلعی صدر مقام ہے جو سطحِ سمندر سے ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بلتستان پانچ سر سبز وادیوں پر مشتمل سرزمین ہے۔ پہلی وادی اسکردو ہے۔ دوسری کا نام شگر ہے۔ تیسری خپلو (خپلو) کہلاتی ہے جو سطحِ سمندر سے ۸۴۰۰ فٹ بلند ہے۔ چوتھی وادی کا نام روندو ہے اور پانچویں کھرمنگ کہلاتی ہے۔ بلتستان میں دنیا کی نمبر ۲ بلند ترین چوٹی کے ٹو واقع ہے۔ علاوہ ازیں یہ عظیم گلیشیروں کی سرزمین بھی ہے جن میں بلتورو، بیافو اور سیاچن بہت مشہور ہیں۔ سیاچن گلیشیر آج کل پاکستان اور بھارت کے درمیان

وجہ نزاع بنا ہُوا ہے اور یہاں دونوں ممالک میں کئی جھڑپیں ہو چکی ہیں۔

اسکردو جانے کے دو ذریعے ہیں۔ سڑک کے ذریعے جانا چاہیں تو آپ راولپنڈی سے ناٹکو (ناردرن ایریا ٹرانسپورٹ کارپوریشن) کی بس پر سوار ہوں گے جو سولہ گھنٹوں میں شاہراہ ریشم کے راستے گلگت پہنچا دے گی۔ اس رُوٹ پر اب پرائیویٹ ویگنیں بھی چلنے لگی ہیں، اس لیے ٹکٹ حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ گلگت سے آگے بس یا ویگن میں آپ چھ سات گھنٹوں میں اسکردو پہنچ سکتے ہیں۔ گویا مجموعی سفر میں چوبیس گھنٹے لگتے ہیں۔

شاہراہ ریشم بہت کشادہ اور آرام دہ ہے لیکن گلگت سے آگے اسکردو تک سڑک اس پایے کی نہیں۔ اسکردو جانے کا دوسرا ذریعہ ہوائی جہاز ہے۔ اس کے لیے آپ کو لاہور یا راولپنڈی سے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے جو ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ اس ہوائی راستے پر فوکر جہاز چلتے ہیں جن میں بیس پچیس مسافروں سے زیادہ سفر نہیں کر سکتے۔ بالعموم دو پروازیں چلتی ہیں۔ یک طرفہ کرایہ ۱۷۰ روپے ہے اور عرصۂ سفر ایک گھنٹہ دس منٹ ہے۔ کرایے میں حکومت نے رعایت دے رکھی ہے۔ اس لیے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بذریعہ جہاز سفر کرے۔ جب طیارے اور بس کا کرایہ تقریباً برابر ہو اور بس میں نسبتاً بیس گنا زیادہ وقت لگتا ہو تو کون یہ آرزو نہیں کرے گا کہ وہ جہاز کے ذریعے اسکردو جائے۔ لیکن ہوائی سفر کا انحصار موسمی حالات پر ہے۔ موسم اچھا نہ ہو تو پرواز منسوخ کر دی جاتی ہے۔ اس طرح بعض لوگوں کو پرواز کے انتظار میں کئی کئی روز راولپنڈی میں مقیم رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے جن لوگوں کے پاس وقت محدود اور راولپنڈی میں ہوٹلوں کے زیر بار ہونے کی گنجائش نہ ہو، وہ بس کے ذریعے چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے لوگوں کی اقتصادی حالت میں نمایاں فرق نظر آنے لگا ہے۔ اب درمیانہ طبقے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی گرمیوں میں شمالی علاقہ جات کا رُخ کرتے ہیں، خصوصاً کالج اساتذہ کی آمدنی میں اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ وہ ہر سال سیر و تفریح کے لیے ہزار دو ہزار روپے بآسانی فراہم کر سکتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بعض مُہم جُو نوجوان موٹر سائیکلوں پر گلگت اور ہنزہ سے آگے درۂ خنجراب تک ہو آئے ہیں۔ پشاور کے چند نوجوان اپنی موٹر کار میں اسکردو تک جا پہنچے۔

ہماری میٹنگ میں جب چین کا ارادہ متروک ٹھہرا تو قرعۂ فال اسکردو کے نام نکلا۔ ایم ڈی پروفیسر عظمت کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہُوئے راولپنڈی سے اسکردو کے ٹکٹ حاصل کریں۔ پروفیسر صاحب بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ دس بارہ سال سے تفریحی دَوروں کا بندوبست کرتے آ رہے ہیں۔ ہر کہیں اُن کا کوئی نہ کوئی شاگرد کسی عہدے پر فائز نکل آتا ہے۔ وہ قاری بھی ہیں اور قرآن بڑے خوبصورت لحن سے پڑھتے ہیں، اس لیے دورانِ سفر ہمارے پیش امام بھی وہی ہوتے ہیں، حتّٰی کہ نماز کے بعد باقاعدہ درسِ قرآن بھی دیتے ہیں۔

اُن کا مضمون معاشیات ہے، اس لیے ہمارے سیکرٹری مالیات بھی وہی ہیں۔ ہوٹل کا انتخاب، کھانے پینے کے لیے ریستوران کا چناؤ، ٹیکسی رکشا کی فراہمی، غرضیکہ ہر کام اُنہی کے ذمّے ہوتا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ عمدہ سے عمدہ کھانا کھانے اور اچھے سے اچھے ہوٹل میں قیام کے باوجود ہمارا خرچ ناقابلِ یقین حد تک تھوڑا ہوتا ہے۔

جُون کی سترہ تاریخ تھی اور بُدھ کا دن۔ مَیں صُبح تین بجے سے پہلے اُٹھ بیٹھا کیونکہ ایم ڈی پروفیسر عظمت کا حکم تھا کہ نمازِ فجر پڑھتے ہی فلائنگ کوچ کے اڈّے پر پہنچ جائیں۔ مَیں تیار ہو کر اسٹیشن پہنچا تو ڈاکٹر سرور، پروفیسر اصلاحی اور ایم ڈی وہاں پہلے سے موجود تھے۔

فلائنگ کوچ سوا پانچ بجے روانہ ہُوئی۔ شہر سے باہر نکلنے میں اُسے پون گھنٹہ لگا۔ شاہدرہ سے آگے جا کر خالی سڑک پر کلانچیں بھرنے لگی۔ سفر شروع ہونے سے پہلے ہم نے دُعائے سفر بھی پڑھ لی تھی۔ یہ ہمارے ایم ڈی کا تاکیدی حکم بھی ہے کہ اس سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔

گیارہ بجے کے قریب ہم پنڈی کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ اگرچہ دس پندرہ منٹ کے لیے ہماری فلائنگ کوچ راستے میں رُکی بھی تھی جہاں مسافروں نے ناشتہ وغیرہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود پورے پانچ گھنٹوں میں ہم لاہور سے پنڈی پہنچ گئے۔

پی آئی اے کے نخرے

گیارہ بجے کوچ راولپنڈی پہنچی اور ہم لوگوں نے مری روڈ کی راہ لی جہاں پی آئی اے کا ریزرویشن آفس ہے۔ باقی تین احباب تو ایئرکنڈیشنڈ ہال میں جا بیٹھے جبکہ ایم ڈی صاحب چاروں ٹکٹ لے کر متعلقہ کاؤنٹر پر حاضر ہُوئے۔ وہاں صرف رپورٹ کرنا تھی کہ ہم آ گئے ہیں۔ خاصی دیر بعد بھی ایم ڈی صاحب واپس نہ آئے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ایک ایک کر کے ہم سب کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ اسکردو فلائٹ کا انچارج مُصر تھا کہ کل کے لیے تو کوئی سیٹ نہیں؛ البتہ پرسوں کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ بہتیرا کہا کہ ہم لاہور سے آئے ہیں اور یہاں پنڈی میں ایک دن سے زیادہ نہیں رُک سکتے مگر فلائٹ انچارج مشورہ دے رہا تھا کہ اس صورت میں آپ بائی روڈ چلے جائیں۔ ناچار ہم نے اپنا پریس کارڈ دکھایا اور بتایا کہ ہمارا تعلق ایک اخبار سے ہے اور واپسی پر ہم سفرنامہ لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر فلائٹ انچارج کچھ ڈھیلا پڑتا نظر آیا بلکہ اُس نے درخواست بھی کی کہ سفرنامے میں پی آئی اے کا ذکر ذرا اچھے لفظوں میں آنا چاہیے اور میرا نام لکھنا بھول نہ جائیے گا نہیں۔

کاؤنٹر انچارج نے ہمارے ٹکٹ رکھ لیے اور دو بجے آنے کو کہا۔ ہم نے اپنے بیگ اُس کے پاس جمع کرا دیے اور خود کھانا کھانے نکل کھڑے ہُوئے۔ ایک قریبی ہوٹل میں کھانا کھا کر ظہر کی نماز کے لیے مسجد کا رُخ کیا۔ ابھی جماعت میں دیر تھی۔ ایم ڈی نے اپنی جماعت کھڑی کر دی۔ نماز کے بعد آرام کی خاطر تھوڑا سا لیٹ گئے۔ باہر شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ مسجد ٹھنڈی تھی۔ چھت سے پنکھے بھی لٹک رہے تھے، اس لیے کمر سیدھی کرنے میں بڑا مزا آیا۔ لیکن اس اثنا میں اِکّا دُکّا نمازی آنا شروع ہو گئے۔

اسکردو فلائٹ کے انچارج کی 'ٹوہر' دیکھنے کے لائق تھی۔ کوئی اِدھر سے سفارشی رقعہ پیش کر رہا ہے، کوئی اُدھر سے ٹیلیفون کرا رہا ہے۔ سیٹیں کم تھیں اور مردماں بسیار۔ فلائٹ انچارج بار بار کچھ اس طرح وضاحت پیش کرتا: "یار! کیا کروں؟ وزیرِ اعظم سیکرٹریٹ سے فون آیا ہے کہ پہلی فلائٹ سے پانچ سیٹیں محفوظ رکھو۔"

اب تو پی آئی اے نے ہفتے میں دو مرتبہ بوئنگ کی پروازیں شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُمید ہے اس سے صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ سڑک کے ذریعے سفر کرنے میں پُورا دن ضائع ہوتا ہے اور کمر الگ اکڑ جاتی ہے جبکہ پی آئی اے ایک گھنٹے میں اسکردو یا گلگت پہنچا دیتا ہے، لہٰذا اکثر لوگ ہوائی سفر کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔

پی آئی اے کا ریزرویشن آفس اگرچہ ایئرکنڈیشنڈ تھا لیکن یہاں واٹر کولر کام کر رہا تھا نہ بیت الخلا قابلِ استعمال تھا۔ واٹر کولر

خوشبو کے سب رنگ
نورس
لذّت کے سب رس
قومی مشروب

میں خُدا جانے کیا خرابی تھی؛ البتہ باتھ رُوم زیرِ مرمت تھا لیکن پی آئی اے متبادل انتظام تو کر سکتا تھا۔

کابل تکہ شاپ

ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد ہم ٹیکسی میں اسلام آباد کی طرف روانہ ہُوئے۔ ڈاکٹر سرور کے کسی عزیز کا ایک فلیٹ اسلام آباد میں خالی پڑا تھا۔ ہم نے اُس پر جا قبضہ کیا۔ وہاں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی؛ البتہ ایئر کنڈیشنر نہیں تھا جس کی وجہ سے فلیٹ دوپہر کے وقت جہنم کا نمونہ بنا ہُوا تھا۔ نہانے کے لیے باتھ رُوم کی ٹونٹی کھولی تو کھولتا ہُوا پانی ٹب میں جمع ہونے لگا۔ بہرحال جُوں تُوں کر کے دن کا باقی حصّہ گزارا۔ ہمارے ایم ڈی ایک دُکان سے ایک پُرانے شاگرد سیّد مبین محمود کو فون کر آئے جو اسلام آباد میں سعودی پاک لمیٹڈ میں پراجیکٹ آفیسر ہیں۔ ہم قریبی مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر آئے تو سیّد مبین اپنی گاڑی لیے ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔

سیّد مبین ہمیں دامنِ کوہ کی سیر کو لے گئے۔ یہ سیر ہم اس سے پہلے کئی مرتبہ کر چکے تھے لیکن اب جو سیر کی اُس کا رنگ ہی مختلف تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ریسٹورنٹ دامنِ کوہ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے لیکن مبین صاحب ہمیں کار میں بہت اُوپر لے گئے۔ ہم پیر سوہاوہ جانے والی سڑک پر دس کلومیٹر تک گئے جہاں سے آگے اُترائی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جگہ سطحِ سمندر سے ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے اور نہایت پُرفضا۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھی۔ وہاں سے اسلام آباد کی روشنیاں قابلِ دید تھیں۔ قطار اندر قطار دُودھیا بلب اور ٹیوب لائٹیں عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

واپسی پہ رات کا کھانا اسلام آباد میں واقع کابل تکہ شاپ سے کھایا جسے افغان مہاجرین چلا رہے تھے۔ ہوٹل کا ماحول خالص کابلی تھا۔ وہی دو دو فٹ لمبے نان، گوشت جلنے کی اشتہا انگیز بُو کا ہلکا ہلکا دُھواں۔ ہوٹل میں خاصا رش تھا۔ ایک بارُعب صورت کا افغانی مہاجر بھی کھانا کھا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی غیر ملکی اخبار نویس چپٹا ہُوا تھا۔ افغانی مہاجر کی بڑی بڑی آنکھیں، اُس کی عجیب و غریب ڈاڑھی کے ساتھ مل کر ہوٹل کے ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھیں۔ کھانے کے بعد کابلی قہوہ اور افغان مٹھائی چلی۔ بل بادل ناخواستہ ... نے ادا کیا۔

رات چھت پر سوئے مگر اسلام آبادی مچھروں نے کاٹ کاٹ کر بُرا حال کر دیا۔ ساڑھے تین بجے کا الارم لگا رکھا تھا لیکن اُسے جگانے کی تکلیف نہ کرنا پڑی۔ مچھر خود ہی رات بھر الارم بجاتے رہے۔ بہرحال ساڑھے تین بجے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور ایم ڈی کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ سیّد مبین اپنی گاڑی لے کر آ گئے۔ دُعائے سفر پڑھ کر اُس میں بیٹھے اور وقت سے پہلے راولپنڈی ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ سامان چیک ہُوا، بورڈنگ کارڈ ملے اور پھر جسمانی تلاشی لینے کے بعد لاؤنج میں داخل ... فوکر سامنے کھڑا تھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے یکہ کھڑا ہو ... دیر بعد جہاز میں سوار ہونے کا اعلان ہُوا۔ الحمدللہ کہ اب ہم ... مراحل طے کر کے جہاز کے اندر بیٹھے تھے۔ اتنے میں پائلٹ آ گئے۔ جہاز کے انجن گڑگڑائے۔ مسافروں نے پیٹیاں کس لیں مگر اُس کی اُڑان اتنی پُرسکون تھی کہ پیٹی باندھنا تکلّف ... ثابت ہُوا۔ کوئی جھٹکا نہ دھکا۔ بس جہاز تھوڑا سا دوڑا، کچھ تیز ... اور پھر زمین سے بلند ہونا شروع ہو گیا۔ پیٹیاں کھٹ سے ... گئے۔ ایئر ہوسٹس اخبارات تقسیم کرنے لگی۔

جہاز میں کُل چودہ پندرہ مسافر تھے۔ باقی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ جہاز پر زیادہ لوڈ نہیں ڈالا ... علاوہ ازیں فلائٹیں صبح سویرے ہی جاتی ہیں۔ گرمی بڑھ جائے تو اسکردو اور گلگت کی فلائٹیں بند کر دی جاتی ہیں کیونکہ فوکر جہاز ... تیز دھوپ میں شاید پرواز نہیں کر سکتا یا انجن گرم ہو جاتا ہو گا۔

نانگا پربت کا نظارہ

اتنے میں ایئر ہوسٹس نے چائے پیسٹری سرو کرنا شروع کر دی لیکن چائے سے زیادہ پُرلطف نیچے کا نظارہ تھا۔ اسلام آباد ... شہر مکھیوں کا چھتہ معلوم ہوتا تھا۔ چمکتی ہُوئی چھتیں، لکیر کی طرح ... سڑکیں اور اُن پر دوڑتی ہُوئی موٹر گاڑیاں جیسے بچوں کے کھلونے ...

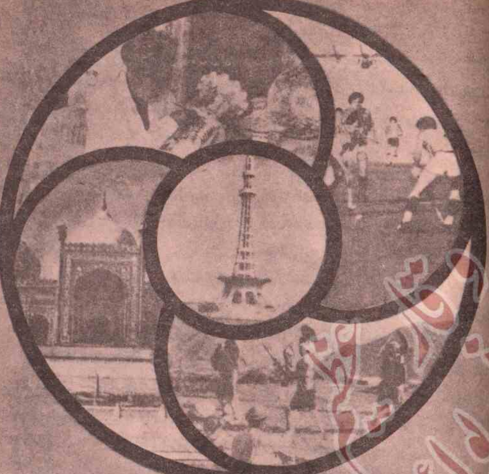

تہذیبی روایتیں اور ثقافتی ورثہ ہماری اصل پہچان ہیں!

نیشنل بینک آف پاکستان نے اس نکتہ نظر کو اپنے آغازِ سفر میں ہی اپنا لیا تھا۔ فن، تہذیب اور لوک ورثہ کی حفاظت کے علاوہ علم و تحقیق کے فروغ اور کھیلوں کے قومی سطح پر احیا کو اس قومی بینک نے ہمیشہ وہی اہمیت دی ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی اور تجارت کے فروغ کو حاصل ہے۔

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-37/86

پھر طیارہ پہاڑوں پر پرواز کرنے لگا۔ ندی نالے بل کھاتی چمکتی لکیروں کی صورت نظر آتے تھے۔

اتنے میں پروفیسر عظمت کی آواز آئی: "وہ دیکھو نیچے جھیل سیف الملوک!"

سب ساتھی دائیں جانب کھڑکیوں کے باہر نیچے دیکھنے لگے۔ جو لوگ دوسری سیٹوں پر تھے وہ بھی اٹھ کر ادھر کھڑکیوں کے پاس اُمڈ آئے۔ اس سے جہاز ذرا سا دائیں طرف ڈولنے لگا تو کچھ ساتھی گھبرا کر واپس اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ جھیل سیف الملوک نیلے پانی کے ایک بہت بڑے پیالے کی طرح پہاڑوں کے درمیان چمک رہی تھی۔ اب کے پہاڑوں پر بہت زیادہ برف باری ہوئی تھی، اس لیے گلیشیئر جھیل کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

اس ہوائی راستے میں دنیا کی تیسری بلند ترین چوٹی نانگا پربت بھی آتی ہے جس کی بلندی سطحِ سمندر سے ۲۶۶۶۰ فٹ ہے۔ نانگا پربت کو انگریزوں نے "سلیپنگ بیوٹی" یعنی "حسنِ خوابیدہ" کا نام دے رکھا ہے۔ ہوائی جہاز سے اس کا نظارہ اس قدر دلکش ہے کہ بہت سے غیر ملکی سیاح یہی دیکھنے پاکستان آتے ہیں۔ نانگا پربت کے اردگرد بے شمار اونچی نیچی برف پوش چوٹیاں عجب منظر پیش کرتی ہیں۔ اگر آپ نے میدانِ عرفات میں حاجیوں کے سفید خیمے دیکھے ہوں تو اس نظارے کا کسی قدر تصور کر سکتے ہیں۔ لامتناہی برف کے سفید خیمے، اونچے نیچے ہر طرف نوکیلی چوٹیاں، بیچ میں ذرا سا ہموار میدان جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ غرض قدرت کی عجیب و غریب صناعی نظر آتی ہے۔ جہاز ان پہاڑوں کے اوپر سے پرواز کرتا ہے۔ ایک گھنٹہ دس منٹ کی یہ پرواز بوئنگ کے ذریعے صرف پچاس منٹ کی رہ جاتی ہے۔ دنیا کی خوبصورت پروازوں میں شمار ہوتی ہے۔

اب گلگت ایئرپورٹ قریب آ رہا تھا۔ برف پوش پہاڑ کم ہوتے اور ان کی جگہ سیاہ اور بھورے رنگ کے بے برگ و گیاہ پہاڑ بڑھتے جا رہے تھے۔ جہاز کی بلندی بتدریج پستی میں تبدیل ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ رن وے پر اُتر کر دوڑنے لگا۔

○

ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ہوائی جہاز وادیِ اسکردو میں داخل ہوا۔ پائلٹ کی طرف سے یہ اعلان کہ "انشاء اللہ ہم چند لمحوں میں اسکردو ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں" نہایت پسند آیا ورنہ پی آئی اے کو ایسے سربراہ بھی نصیب ہو چکے ہیں جنہوں نے لفظ "انشاء اللہ" کو توہم پرستی کا مظہر قرار دے کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔

پہاڑوں میں ریگستان

اسکردو ایئرپورٹ کا رن وے جس قدر وسیع تھا، عمارت اتنی ہی مختصر تھی۔ ایئرپورٹ کا ہمارا پہلا تاثر گلاب کے پھولوں کا تھا جو عام پھولوں سے چار گنا بڑے تھے۔ سرخ، سفید، عنابی، غرضیکہ مختلف رنگوں کے گل پوش تختے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اسکردو کا دوسرا تاثر ریت کا تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت۔ سطحِ سمندر سے ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ریگستان واقعی عجیب سی بات تھی۔ ایئرپورٹ کے اردگرد جتنے پہاڑ نظر آ رہے تھے تمام کے تمام چٹیل اور بے شجر تھے۔ روئیدگی صرف میدان میں نظر آتی تھی۔ سیاہ اور بھورے پہاڑ چٹانوں کے نہیں بلکہ ریت کے بنے ہوئے نظر آتے تھے۔

ایک سادہ سے مسافر لاؤنج میں کچھ انتظار کے بعد ہمارا سامان آ گیا۔ ٹیگ دکھا کر اپنا اپنا بیگ وصول کیا اور ایئرپورٹ بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ سامنے کتنی ہی سوزوکیاں کھڑی تھیں جو مسافروں کو شہر لے جا رہی تھیں۔ ہم سب سے پہلے کالج پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ ہمارے پاس ایک پروفیسر صاحب کے نام تعارفی خط تھا؛ چنانچہ ایک سوزوکی وین میں بیٹھ گئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سے مقامی مسافر اس کے پیچھے لٹک کر کھڑے ہو گئے۔ یوں ہم باہر کا نظارہ نہ کر سکے۔

ہوائی اڈا شہر سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور سڑک صاف ستھری ہے، اس لیے پندرہ بیس منٹ میں ہم کالج پہنچ گئے۔ اسکردو شہر کیا ہے؛ بس گلگت اسکردو روڈ کے

دونوں طرف دکانیں بنی ہوئی ہیں جن میں اکثر مقفل رہتی ہیں، شاید موسمِ گرما ہی کے لیے استعمال ہوتی ہوں۔ انہی دکانوں کے شروع میں کالج گیٹ آ جاتا ہے۔ جب سوزوکی وین کالج میں داخل ہوئی، گراؤنڈ میں طلبہ والی بال کھیل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر والی بال کا کھیل چند لمحوں کے لیے رُک گیا۔ طلبہ سے ہم نے متعلقہ پروفیسر صاحب کا پوچھا تو وہ ہمیں پرنسپل صاحب کے پاس لے گئے جو شاید گرمی کے باعث کالج کے برآمدے میں دفتر لگائے ہوئے تھے۔

جواں سال پرنسپل خواجہ مہرداد نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ بڑے خوش اخلاق اور بذلہ سنج آدمی نکلے۔ بعد میں علم ہوا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے ہیں۔ رہنے والے بھی شمالی علاقہ جات کے ہیں۔ چند ہی روز پہلے گلگت سے تبدیل ہو کر یہاں آئے تھے۔ ہمارا پروگرام کالج میں ٹھہرنے کا نہ تھا لیکن پرنسپل صاحب کے اصرار پر ہم نے وہیں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وفاقی حکومت نے کالج کے احاطے میں ایک نیا ہاسٹل تعمیر کیا ہے جس کا قبضہ ابھی کالج کو نہیں ملا تھا۔ اس کے دو کمرے پرنسپل صاحب نے ہمیں دے دیے۔ چارپائیاں اور بستر بھی مہیا ہو گئے۔ ابھی ہاسٹل میں بجلی نہیں تھی۔ پرنسپل صاحب اور کالج کے دیگر افراد نے بجلی کے عارضی تار کمروں اور غسل خانوں تک پہنچا دیے۔

تاریخ کے پروفیسر تاج صاحب، جو ہنزہ کے رہنے والے ہیں، ہاسٹل ہی میں قیام پذیر تھے۔ بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی زبان سے اردو سن کر بڑا لطف آتا ہے۔ ہاسٹل اور کالج سے باہر نکلیں تو سو پچاس قدم پر ہوٹل شروع ہو جاتے ہیں، اس لیے کھانا کھانے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

اسکردو سطحِ سمندر سے اگرچہ مری جتنا بلند ہے لیکن سردی وہاں نام کو بھی نہ تھی۔ پہلی رات ہم کمروں کے اندر سوئے۔ کھڑکیاں اور دروازے اگرچہ کھلے تھے، اس کے باوجود کچھ گرمی محسوس ہوتی رہی۔ کالج والوں نے بتایا کہ گرمی کی یہ لہر چند روز سے آئی ہوئی ہے ورنہ سویٹر کے بغیر دن اور رضائی کے بغیر رات مشکل سے گزرتی ہے۔ گرمی کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ سارا شہر ریت سے اٹا پڑا ہے۔ پکی سڑک سے نیچے اُتریں تو قدم ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ اردگرد کے پہاڑ بھی زیادہ تر بھُربھُری مٹی یا ریت کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہاں دوپہر کے وقت باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ دھوپ میں سر جلنے لگتا مگر نل میں ٹھنڈا یخ پانی آ رہا تھا کیونکہ وہ پگھلے ہوئے گلیشیئروں کا تھا۔ یہ ریت صرف اسکردو ہی تک محدود نہیں بلکہ جب ہم تئیس کلومیٹر دور وادیِ شگر دیکھنے گئے تو راستے میں دس پندرہ میل طویل ریگستان عبور کرنا پڑا جس میں حدِ نظر تک ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی۔ اسے ہمارے ایک دوست نے "صحرائے گوبی" کا نام دے ڈالا۔

اسکردو بہت بڑا شہر نہیں۔ ۱۹۷۵ء میں اس کی مجموعی آبادی سات ہزار تھی۔ دس برس میں زیادہ سے زیادہ دگنی ہو گئی ہو گی اور وہ بھی گرمیوں میں کیونکہ سردیوں کے موسم میں یہاں برف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کئی کئی فٹ برف پڑتی ہے۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے خاصا نیچے چلا جاتا ہے، اس لیے سردیوں میں صرف وہی لوگ یہاں باقی رہ جاتے ہوں گے جو کہیں نہیں جا سکتے۔ سیاحوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر مقامی لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھا۔ چھوٹا گوشت یہاں عنقا ہے۔ بڑا گوشت بھی اچھا نہیں ملتا۔ سبزی بھی زیادہ تر پنجاب سے آتی ہے۔ ہوٹل والے مرغی اور انڈا بھی مہیا کر دیتے ہیں لیکن گاہک کے اسپیشل آرڈر پر۔

اُن دنوں اسکردو کے بازار میں پھل دستیاب نہ تھے۔ پنجاب سے آئے ہوئے آم بک رہے تھے مگر جھرّیوں سے داغدار اور خاصے مہنگے۔ خوبانی اور سیب یہاں کے خصوصی پھل ہیں لیکن ابھی وہ بالکل کچے تھے۔ گندم کی ہری کچور فصل کھیتوں میں کھڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگست میں کٹائی ہو گی۔ شہتوت البتہ پکے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں اِکا دُکا تربوز بھی دکھائی دیے۔ سٹرابری کے بارے میں سُنا ضرور مگر کہیں دیکھا نہیں۔

شیشے کا ریستوران

دوسرے دن جھیل ست پارا دیکھنے کا پروگرام تھا۔ یہ جھیل

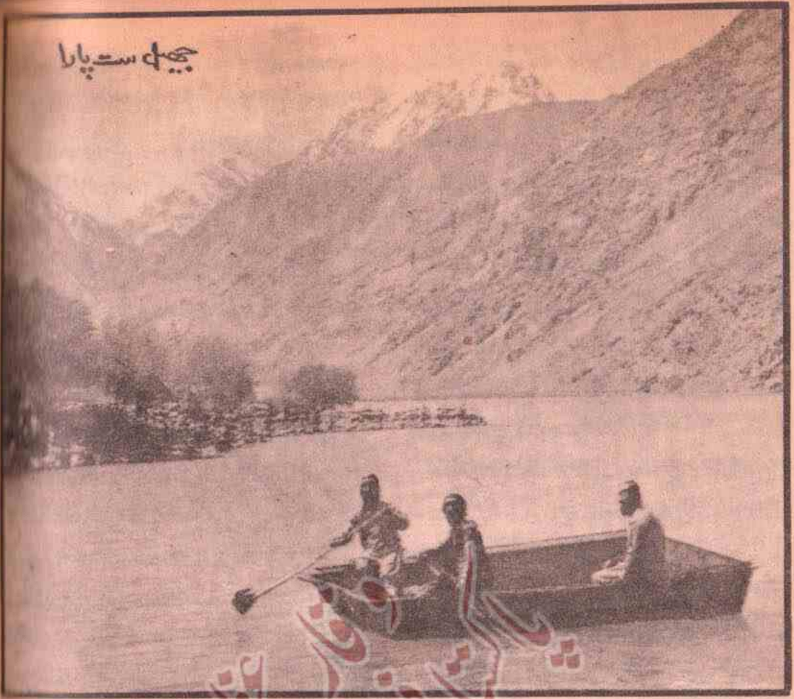

جھیل ست پارا

اسکردو سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ راستہ سخت دُشوار گزار ہے۔ صرف جیپ جا سکتی ہے۔ پروفیسر تاج صاحب ایک اچھے کوہ پیما ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں پیدل جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن ہم نے یہ خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ کالج سے ایک فرلانگ آگے مین بازار میں شہید مینار ہے جس پر اُن شہیدوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء-۴۸ء میں ڈوگرہ شاہی کا مقابلہ کرتے ہُوئے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ اس مینار کے سامنے ہی ناٹکو کا دفتر ہے۔ یہ سرکاری ادارہ ہے۔ شمالی علاقوں میں آمدورفت کے ذرائع مہیا کرتا ہے۔ پنڈی سے گلگت اور آگے اسکردو تک اس کارپوریشن کی بسیں چلتی ہیں۔ ہم نے اُن سے ایک جیپ کی درخواست کی جو مناسب کرائے پر مہیا کر دی گئی۔ راستے میں اسکردو کا سیٹلائٹ ٹاؤن آیا جہاں سرکاری ملازمین کے لیے خوبصورت گھر بنے ہُوئے ہیں۔

سنگلاخ اور تنگ راستے پر کچھ آگے جا کر اسکردو کا پاور ہاؤس آگیا۔ یہاں ایک بہت بڑی آبشار خاصی بلندی سے نیچے گرتی … یُوں لگتا ہے جیسے پُورے کا پُورا گلیشئر پانی بن کر نیچے گر رہا … بڑے بڑے آہنی پائپوں کے ذریعے آبشار کا پانی پاور ہاؤس کے ٹربائنوں پر گرتا ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس آب… کا پانی ایک جھیل کی صُورت میں اکٹھا ہوتا ہے اور پھر اُسے پا… کے ذریعے شہر تک پہنچایا جاتا ہے۔ یخ ٹھنڈا پانی بڑا میٹھا اور ہاضم … لوگوں نے بتایا کہ پنجاب کے بعض افسر جو ملازمت کے سلسلے… یہاں رہ چکے ہیں، ٹرک کے ذریعے یہاں سے پانی منگوا… ہیں۔ کاش شمالی علاقوں کا پانی بوتلوں میں بند کر کے اندرون… اور بیرون ملک فروخت کیا جائے تو مقامی لوگوں کے … روزگار اور آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

آبشار سے ایک کلومیٹر آگے عمودی چڑھائی آتی ہے … ہم نے سر راہ ایک موٹر کار کھڑی دیکھی۔ ہم حیران ہُوئے کہ … کون مُہم جُو تھے جو ست پارا جھیل دیکھنے کار میں بیٹھ کر جا…

تھے۔ خدا جانے وہ کس مشکل سے کار یہاں تک لائے ہوں گے۔ ست پارا جھیل جا کر ہمیں وہ باہمت نوجوان مل گئے۔ پشاور کے یہ باسی اس کار پر خنجراب تک ہو آئے تھے۔ معلوم نہیں واپسی پر اُنہوں نے کار کیسے موڑی ہوگی۔ ہمارے خیال میں اس تنگ راستے پر کرین ہی کار کا رُخ شہر کی طرف موڑ سکتی تھی۔

ست پارا جھیل پہنچ کر سفر کی ساری کُلفت دُور ہو گئی۔ نیلے پانی کی یہ جھیل، سیف الملوک سے بھی بڑی ہے۔ کنارے پر ہرے بھرے لہلہاتے درخت، ٹھنڈی ہوا اور شاخوں کی سرسراہٹ، سبزے کا فرش، غرض اس رُومانی ماحول نے سب کو مسحور کر دیا۔ جھیل میں ایک چھوٹا سا جزیرہ بھی ہے جہاں موٹر بوٹ پر جا سکتے ہیں۔ ہم نے ایک موٹر بوٹ سے معاملہ طے کیا لیکن اُس کا کوئی اندرونی پُرزہ خراب ہو گیا جس کی وجہ سے ہم جھیل کی اندرونی سیر سے محروم رہے۔ اس جھیل پر شیشے کی دیواروں والا ایک سنگل رُوم ریستوران بھی ہے۔ اندر قالین بچھا ہُوا ہے، کُرسیاں لگی ہُوئی ہیں۔ کراکری کی الماری بھی موجود ہے۔ آپ چوکیدار سے کہہ کر چائے بنوائیے اور شیشے کی دیواروں سے باہر کا نظارہ کرتے ہُوئے رومانوی ماحول میں گرم گرم گھُونٹوں سے لُطف اُٹھائیے۔ عظمت صاحب اس ماحول سے اس قدر مسحور ہُوئے کہ وہیں شب بسری پر تیار ہو گئے۔ لیکن ایسی جگہیں قیام کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ بقول میرؔ ؎

تک دیکھ لیا، دل شاد ہُوئے اور چل نکلے

آج یوم جمعہ تھا۔ ایم ڈی نے حکم دیا کہ فوراً وضو کرو اور نماز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جھیل ست پارا کے یخ پانی سے وضو کیا اور جھیل کے کنارے سبزہ زار پر خُدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے جس نے ہمارے لیے اس قدر خوبصورت نظارے پیدا کر رکھے ہیں۔ جو چاہے اُن سے لُطف اندوز ہو لے۔ بس ذرا زحمتِ سفر اُٹھا کر ان کے قریب جانا پڑتا ہے۔ یہی اُن کے دیکھنے کی قیمت ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

نگاہ ہو تو بہائے نظارا کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمالِ رعنائی

عصر پڑھ کر ہم ست پارا جھیل سے لوٹے۔ دوسرے [illegible] تنگر وادی جانا تھا جو اسکردو سے تئیس کلومیٹر دُور ہے۔ ہمارے [illegible] پرنسپل خواجہ مہرداد نے شنگر والوں کو فون کر دیا کہ کل اُن کے [illegible] گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک ٹیم آ رہی ہے۔ بلتستان میں چھوٹے [illegible] گاؤں میں بھی ٹیلیفون کی سہولت موجود ہے۔ شمالی علاقوں کی الگ [illegible] ڈائریکٹری بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پسماندہ علاقوں نے [illegible] سے ترقی کی ہے باقی مُلک اس پہ رشک کر سکتا ہے۔ صدر [illegible] نے حال ہی میں یہاں کے دَورے میں کہیں اسکول منظور کیا [illegible] کالج۔ کہیں سڑکیں بن رہی ہیں تو کہیں ایئر پورٹ۔ غرض [illegible] کے بعد اس خطّے کی تو قسمت پلٹ گئی ہے۔

خواجہ مہرداد نے ہمیں بتایا کہ ڈوگروں کے زمانے میں [illegible] بلتستان میں لڑکوں کا صرف ایک اسکول تھا اور وہ بھی لوئر مڈل [illegible] لڑکیوں کے لیے پرائمری اسکول تک نہ تھا۔ اب یہاں ایک [illegible] کالج کے علاوہ سات ہائی اسکول قائم ہو چکے ہیں جن میں ایک [illegible] اسکول لڑکیوں کا بھی ہے۔ اس طرح مڈل اسکولوں کی تعداد [illegible] ہے جن میں دو لڑکیوں کے ہیں۔ پرائمری اور مکتب اسکولوں کی [illegible] پونے دو سو کے لگ بھگ ہے۔ خیال رہے کہ بلتستان کی [illegible] آبادی اڑھائی لاکھ سے بھی کم ہوگی۔ یہاں کوئی قریہ، کوئی وادی [illegible] کوئی گلی ایسی نہیں جہاں اسکول نہ ہو۔ یہ سب پاکستان کی برکتیں [illegible]

شمالی علاقوں میں تین اضلاع شامل ہیں: (۱) ضلع گلگت جس کا صدر مقام بھی گلگت ہے۔ (۲) ضلع دیامیر جس کا صدر [illegible] چلاس ہے۔ (۳) ضلع بلتستان جس کا صدر مقام اسکردو [illegible] ضلع بلتستان پانچ وادیوں پر مشتمل ہے: (۱) سکردو۔ (۲) [illegible] (۳) خپلو، (۴) روندو، (۵) کھرمنگ۔ سیاچن گلیشئر اسی [illegible] وادی خپلو سے آگے ہے۔ اس گلیشئر پر متعین پاکستانی فوجیوں کے لیے ضروری اشیا اسکردو ہی سے مہیا کی جاتی ہیں۔ سارا [illegible] ہیلی کاپٹر آتے جاتے رہتے ہیں۔

وادیٔ شنگر کی لطافتیں

دوسرے روز ہم تانگو کی جیپ میں پھر شنگر وادی کے [illegible]

[illegible] ہوئے۔ اسکردو سے نکلتے ہی خراب سڑک سے واسطہ پڑا [illegible] آگے جا کر سنگلاخ پہاڑی راستے میں تبدیل ہو گئی۔ بلتستان میں [illegible] کی صرف دریائی وادیوں تک محدود ہے باقی علاقہ ریگستان [illegible] کوہستان؛ چنانچہ وادیٔ اسکردو کی حد ختم ہوتے ہی بے آب و گیاہ [illegible] دکھائی دیا جو آگے چل کر ریگزار میں ڈھل گیا۔ حدِ نظر تک ریت [illegible] ریت تھی جس میں جیپوں اور ویگنوں کے گزرنے سے ایک [illegible] سا بن گیا تھا۔ راستے میں دریائے شنگر آیا۔ یک طرفہ ٹریفک [illegible] تھی۔ پُل، گاڑی گزرتے وقت لرزتا رہتا، اس لیے عظمت [illegible] صاحب نے اُسے 'پُل صراط' اور ڈاکٹر سرور نے 'پُلِ لرزاں' کا نام [illegible] دیا۔

'صحرائے گوبی' عبور کر کے ہم پھر سنگلاخ پہاڑوں میں سفر کرنے [illegible] لگے۔ دھوپ کی تمازت اور ریت کی فراوانی نے چولستان کی یاد تازہ [illegible] دی۔ کچھ دُور جا کر ہمیں درختوں کے جھُنڈ نظر آنے لگے۔ وادی [illegible] اکا دُکا عورتیں یا بچے کسی نالے کنارے کپڑے دھوتے یا مویشی [illegible] تے دکھائی دیے۔ سیب، خوبانی اور شہتوت کے درخت فراواں [illegible] شہتوت نسبتاً چھوٹے مگر موٹے اور رس بھرے تھے۔ ایک [illegible] ہم نے اُن سے لُطف اندوز ہونے کے لیے جیپ روک [illegible] ٹہنیاں اس قدر نیچی تھیں کہ اُنہیں ہاتھ سے پکڑ کر بآسانی شہتوت [illegible] کھائے جا سکتے تھے۔ اس کے باوجود پروفیسر عظمت درخت [illegible] چڑھ کر شہتوت خود کھانے اور نیچے ہماری جھولیوں میں بھی پھینکنے [illegible] اُن کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر سرور بھی رسمِ جہانگیری ادا کرنے پر [illegible] گئے۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ [illegible] دولت خیمہ و خرگاہ کے ساتھ عازمِ کشمیر ہُوئے۔ راستے میں ماہدولت [illegible] جی چاہا کہ کچھ دُور پیدل چلا جائے؛ لہٰذا نور جہاں کو ساتھ لے کر [illegible] سے خاصا آگے نکل گئے۔ لبِ سڑک شہتوت کا ایک درخت [illegible] پھل سے لدا کھڑا تھا۔ ماہدولت کا جی چاہا کہ درخت پر چڑھ کر [illegible] شہتوت کھائے جائیں؛ چنانچہ شہنشاہِ ہند اور ملکۂ عالیہ دونوں درخت [illegible] چڑھ گئے اور لشکر کے اُن تک پہنچنے سے پہلے اُنہوں نے [illegible] اپنی کو جی بھر کر یاد کر لیا۔

بلوچستان پر اپنی نوعیت کی پہلی ہمہ پہلو کتاب

اجنبی اپنے دیس میں

سیّد شوکت علی شاہ کا دیدہ ور سفرنامہ

* ایک ایسا سفرنامہ جس میں بلوچستان کے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی اُتار چڑھاؤ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔
* ایک ایسا سفرنامہ جو مستقبل کے امکانات اپنی گرفت میں لاتا ہے۔
* ایک ایسا سفرنامہ جو بلوچستان کے اندر بیٹھ کر اور بلوچستان کو اپنے دل میں سمو کر لکھا گیا ہے۔
* ایک ایسا سفرنامہ جس میں وادیوں اور پہاڑوں میں بسی ہُوئی غیرت اور محبت کی دھڑکنیں ایک ادبی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

دُوسرا ایڈیشن قیمت ۶۰ رُوپے

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور ۲۵

وی آئی پی ریسٹ ہاؤس کے مزے

شنگر وادی میں سرکاری ریسٹ ہاؤس دریائے شنگر کے عین کنارے پر ہے۔ دریا کیا ہے ایک چھوٹا سا تُند و تیز نالہ ہے جو پتھروں سے سر ٹکراتا بہہ رہا ہے۔ اس کا پانی گدلا اور سیاہی مائل ہے۔ شاید جب پہاڑ سے گزر کر آتا ہے، اُس کی مٹی پانی میں شامل ہو جاتی ہو ورنہ پورے شمالی علاقوں میں ہم نے گدلے پانی کا دریا یا نالہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ دریائے شنگر اور ریسٹ ہاؤس کے درمیان پتھروں سے تین فٹ اُونچی ایک دیوار ہے جو دریا کا نظارہ کرنے میں حائل نہیں ہوتی۔ عصر کے وقت ہم چاروں دوست اُس دیوار پر بیٹھ کر ماحول سے لُطف اُٹھانے لگے۔ دائیں ہاتھ دریا، بائیں طرف سرسبز لان اور ریسٹ ہاؤس کی خوشنما عمارت۔ ماحول میں خنکی اور پس منظر میں پانی کی موسیقی، غرض ایک پُر کیف سماں تھا ہم نے وہاں بیٹھ کر گورنمنٹ کالج لاہور کی خوشگوار یادیں تازہ کیں۔

جیپ کے ڈرائیور کو ہم نے پیغام بھجوا دیا تھا کہ رات ہم شنگر ہی میں قیام کریں گے۔ ریسٹ ہاؤس میں تین سیٹ ہیں جن میں ایک وی آئی پی سیٹ کہلاتا ہے۔ یہاں افسر لوگ قیام فرماتے ہیں، اس لیے فوم کے بیڈ، آرام کرسیاں، خوبصورت قالین، سائڈ ٹیبل اور ملحقہ باتھ میں شاور جیسی ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ اتفاق سے کوئی افسر موجود نہیں تھا، اس لیے ہم اُستادوں کے لیے یہ سیٹ کھول دیا گیا کہ ایک روز کے لیے ہم بھی افسری کا مزہ چکھ لیں۔ شنگر میں بجلی موجود ہے لیکن قابلِ اعتبار نہیں، مغرب کے تھوڑی دیر بعد بجلی جاتی رہی چوکیدار فوراً لالٹین لے آیا۔

رات کا کھانا برآمدے میں بیٹھ کر چاند کی روشنی میں کھایا۔ چھٹکی ہوئی چاندنی، سامنے دریا کا ترنم، لوریاں دیتی ہُوئی ٹھنڈی ہَوا، غرض سادہ سا کھانا بھی من و سلویٰ کا مزہ دے گیا۔ وی آئی پی کے ساتھ والے سیٹ میں چادر بچھوا کر ایم ڈی صاحب نے اُسے مسجد میں تبدیل کر لیا تھا۔ عشا کی نماز اسی مسجد میں ادا ہُوئی اور پھر نرم و گداز بستروں پر دریا کی موسیقی سے لُطف اندوز ہوتے ہوتے سو گئے۔

سحری کے وقت باتھ رُوم میں جا کر پتہ چلا کہ رات ... کے ساتھ ساتھ پانی بھی بند ہے لیکن وی آئی پی ریسٹ ہاؤس ... بھلا متبادل انتظام کیسے نہ ہوتا؟ چوکیدار نے بالٹی اور ... رکھے تھے۔ سب لوگوں نے وضو کیا، فاطرِ کائنات کے ... ہوئے اور پھر صبح کی سیر کو چل دیے۔ شنگر وادی لمبائی میں ... طویل ہے، چوڑائی میں اُتنی ہی کم ہے، لہٰذا وادی سے ... ہم پہاڑ پر چڑھ گئے۔ صاف شفاف آکسیجن پھیپھڑوں کے ... نعمت ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہم دھوئیں اور گرد ... کے عادی شہریوں کو وہیں ہُوا۔

سیر سے واپس آئے تو ناشتہ تیار تھا۔ چوکور پراٹھے ... کا آملیٹ، ساتھ سُپر مٹ چائے۔ دریائے شنگر کے ... بیٹھ کر اس ناشتے کا مزہ کیا کہنے! اتنے میں ہمارا ڈرائیور ... اُسے دعوتِ طعام دی لیکن بقول اُس کے وہ ناشتے ... فارغ ہو کر آیا تھا۔ اس سے ہمیں بلتستان کے غریب ... یاد آ گئی۔ ہم نے اس پورے علاقے میں کوئی گداگر نہیں ... یہاں غربت اور بے روزگاری عام ہے مگر کوئی شخص ... ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

علامہ عارف الحسینی کا جلوس

ریسٹ ہاؤس کا بل ادا کر کے اور نوکروں کو انعام ... جب ہم پلٹے تو راستے میں جا بجا آرائشی محرابیں اور خیر مقدمی ... آئے معلوم کہ اہلِ تشیع کے لیڈر جناب عارف الحسینی ... شنگر تشریف لا رہے ہیں۔ ان محرابوں اور بینروں سے بھی ... غربت ٹپک رہی تھی۔ رنگ برنگے گھریلو کپڑے اور بوسیدہ ... لیکن لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ اسکول میں غالباً ... گئی تھی۔ تمام بچے سڑک کے کنارے کھڑے زور زور ... نعرے لگا رہے تھے۔ امام خمینی کی تصویریں سب سے ...

وادیٔ شنگر کی تقریباً ساری آبادی جو چند سو نفوس پر ... اُس سڑک پر منتظر ہے جو اس کو اسکردو سے ملاتی ہے، ... جشن اور میلے کا سا منظر ہے۔ دو تین جیپیں، جن پر لاؤڈ ...

... بگولے کھاتی پتھریلی سڑک پر چکر لگا رہی ہیں۔ اُن میں ایستادہ ... چہروں والے نوجوان خیر مقدمی نعرے لگا رہے ہیں۔ سب سے نمایاں نعرہ 'نگر نگر گلی گلی۔ علی علی علی' کا ہے۔ مہمانِ مکرّم کا ... دُور دُور تک پتہ نہیں۔ اب ہم اہلِ سُنّت والجماعت کی نو تعمیر ... مسجد کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ ہماری جیپ دیکھ کر ... سے نعرے لگاتے ہیں، ہم بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اُن کے نعروں کا جواب دیتے ہیں۔ کچھ دُور چل کر سرسبزی چھدری ہونے لگتی ہے۔ ... درخت اور کھیت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ شنگر وادی کے خاتمے کا اعلان ہے۔ اب سڑک کے دونوں جانب اُونچے نیچے پہاڑ ہیں ... ریتیلے میدان۔ خاصی دیر بعد دریائے شنگر کا پُل نظر آتا ہے۔ ... پُل سے ہٹ کر صحرا میں کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ دوسری جانب سے ... جیپوں کا قافلہ آ رہا ہے۔ سب سے اگلی جیپ میں چند نوجوان ... ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد علمائے کرام اور مجتہدین تشریف فرما ہیں۔ چوتھی یا پانچویں جیپ میں جناب عارف الحسینی بیٹھے دکھائی دیتے ... ساتھ ہی جناب موسوی صاحب بھی ہیں جو جامعہ المنتظر ماڈل ٹاؤن ... سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حضرات سے چلتے چلتے سلام دُعا ہوتی ... اور اسکردو میں تفصیلی ملاقات کا وعدہ وعید ہوتا ہے۔ عارف الحسینی ... اب گزر چکا ہے، لہٰذا ہم پُل پار کر کے دوبارہ 'صحرائے گوبی' ... پہنچے ہیں۔ اور یوں وہ گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر کر کے اسکردو ... پہنچتے ہیں۔

شنگر سے آنے والی سڑک نصف راستے میں اس بڑی سڑک ... مل جاتی ہے جو اسکردو کو وادیٔ خپلو سے ملاتی ہے۔ ہمارا ارادہ ... جانے کا بھی تھا مگر ایک تو وہ دُور تھا۔ دوسرے یہ جان کر ... وہ بھی شنگر ہی کی طرح سرسبز وادی ہے، ہم نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

شنگر ہی میں بلتستان کی نئی اور پُرانی نسل میں جنریشن گیپ ... طور پر محسوس ہُوا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی نسل جس نے ... ڈوگروں کی غلامی میں آنکھیں کھولیں، اپنے پست قد، بے نُور آنکھوں ... مُردہ چہروں کی وجہ سے فوراً پہچانی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ... فضا میں پروان چڑھنے والے نوجوان آسودہ چہروں، پُر اُمید نگاہوں اور متناسب جسموں کے مالک ہیں۔ ان میں عزتِ نفس کا احساس پایا جاتا ہے اور انہیں اپنے پاکستانی تشخص پر فخر ہے۔ پُرانے لوگوں کے موٹے موٹے گلھڑ دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ڈوگرہ شاہی کو صرف ٹیکس وصول کرنے سے دلچسپی تھی، ان لوگوں کی صحت کی فکر نہ تھی۔ یہاں کے پانی میں آیوڈین کی کمی ہے۔ اس لیے عام لوگوں کے گلے پھول جایا کرتے تھے۔ اب پاکستان کی برکت سے جگہ جگہ اسپتال کھل گئے ہیں۔ آب رسانی کی اسکیموں نے آیوڈین کی کمی دُور کر دی ہے، اس لیے نئی اور آزاد نسل کے نوجوان سرو کی طرح لمبے اور خوبصورت ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں نے مصائب برداشت کیے ہیں اور اُنہیں اب بھی زبردست مصیبتوں کا سامنا ہے۔ اُنہیں آلام و مصائب درپیش ہیں۔ ان آلام و مصائب کا خاتمہ فقط قیامِ پاکستان کے ذریعے ممکن ہے۔

(نئی دہلی میں ۵ رجون ۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل کے افتتاحی اجلاس سے خطاب۔)

شنگریلا کی سیر

اگلے روز ہمارا پروگرام شنگریلا جانے کا تھا جہاں اسی نام کا ایک مشہور ہوٹل بھی ہے۔ شنگریلا اسکردو سے تئیس کلومیٹر دُور گلگت جانے والی سڑک پر ہے۔ ناٹکو کی بسیں اس نو تعمیر سڑک پر دوڑتی پھرتی ہیں جسے پاک آرمی کے انجنیئروں نے تعمیر کیا ہے۔ اسکردو کا ہوائی اڈا بھی اسی سڑک پر آتا ہے۔ ہم صبح سویرے بس پر سوار ہوئے اور

سوا گھنٹے میں شنگریلا موڑ پہنچ گئے۔ یہاں سے شنگریلا ہوٹل ایک ڈیڑھ کلومیٹر دُور ہوگا۔ ہم نے یہ راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں گندم کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے اور اُن کے درمیان مینڈوں پر شہتوت کے درخت لذتِ کام و دہن کی دعوت دے رہے تھے۔ ہم شہتوت کھاتے اور کھیتوں کے بیچ میں سے گزرنے والے قدرتی نالوں کا یخ پانی پیتے شنگریلا پہنچ گئے۔

شنگریلا ہوٹل ایک قدرتی جھیل کے اردگرد بنا ہُوا ہے جسے غلطی سے کچورا جھیل کہا جاتا ہے اور تو اور محکمۂ سیاحت نے بھی اپنے لٹریچر میں اسے یہی نام دے رکھا ہے۔ جھیل کے اردگرد خوبصورت کاٹیج اور بنگلے بنے ہُوئے ہیں۔ یہاں دولت مند سیاح قیام کرتے ہیں۔ جھیل میں پگوڈا شکل کا ایک ریستوران بنا ہُوا ہے۔ تمام تعمیرات کی چھتیں سُرخ رنگ کی ہیں۔ ویٹروں کی وردی میں بھی سُرخ رنگ نمایاں ہے۔ جھیل میں لانچیں اور کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ کچھ بطخیں بھی تیرتی نظر آتی ہیں۔ روشوں پر مختلف رنگ کے گلاب کے پھُول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ جگہ جگہ انگریزی میں "مجھے مت توڑیے" کی تختیاں نصب ہیں۔ ہوٹل پر مغربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ یہاں قیام پذیر لوگ بھی اکثر انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریستوران میں چائے کی پیالی آٹھ روپے اور کوکا کولا کی بوتل دس روپے میں ملتی ہے۔ کمروں کے روزانہ کرائے بھی آٹھ سو روپے سے لے کر دو ہزار تک ہیں۔ ہوٹل میں گفٹ شاپ اور بُک شاپ بھی ہے۔ ویسے تو سارا ہوٹل ہی اُونچے لوگوں کے لیے ہے لیکن ایک ونگ وی وی آئی پی کے لیے مخصوص ہے۔ ہوٹل میں گھڑسواری کا شوق پُورا کرنے کے لیے ٹٹو بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہاں مقیم زیادہ تر سیاح پاکستانی ہی تھے۔

ہوٹل کی ایک خاص چیز ڈکوٹا کاٹیج ہے۔ یہ ایک ناکارہ ہوائی جہاز ہے جس کا انجن اور سیٹیں نکال کر اُسے رہائشی کمروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل بریگیڈیئر اسلم کی ملکیت بتایا جاتا ہے جو ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں کے بھائی ہیں۔ ہوٹل کی گاڑی اسکردو ایئرپورٹ پر مسافر لے جانے کے لیے موجود ہوتی ہے۔

ہوٹل کی سیر سے فارغ ہُوئے اور مین روڈ تک واپس جانے کے لیے پیدل مارچ شروع کیا تو پتہ چلا کہ اصل کچورا جھیل تو کم و بیش پانچ کلومیٹر دُور پہاڑوں میں گھری ہُوئی ہے۔ وہاں تک جیپ گاڑیاں شنگریلا ہوٹل سے آگے آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ ہم بھی ایک جیپ میں سوار ہو گئے۔ تقریباً چار کلومیٹر کے بعد جو آدھ گھنٹے میں طے ہُوئے، جیپ رُک گئی کہ آگے وہ جا نہیں سکتی تھی۔ ہم نے پیدل مارچ شروع کر دیا۔ چند قدم آگے ایک نالہ آیا جو بڑی بڑی چٹانوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہم نے جُوتے اُتار کر ہاتھوں میں پکڑے اور اللہ کا نام لے کر نالہ عبور کیا تو سرسبز گندم کے کھیت شروع ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم خاصی دُور نکل گئے لیکن کہیں جھیل کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر نو دس برس کا ایک بچّہ ملا۔ ہم نے پُوچھا: "بیٹے! کچورا جھیل کو یہی راستہ جاتا ہے؟"

"ہاں جناب! یہی راستہ جاتا ہے۔ اگر کہیں تو مَیں آپ کو وہاں تک لے چلوں؟" وہ ہمارا گائیڈ بننے کی پیشکش کر رہا تھا۔

"کیا نام ہے بیٹے تمہارا؟"

"جی، ناصر علی۔"

"بہت خُوب۔ تم اسکول میں پڑھتے ہو؟" ہم نے اُس کی یونیفارم دیکھتے ہُوئے پوچھا جو مزوی کلا تھ کی شلوار قمیص پر مشتمل تھی۔

"جی ہاں! مَیں چوتھی جماعت میں پڑھتا ہُوں۔"

"تو کیا آج تمہیں اسکول سے چھُٹّی ہے؟" ابھی صرف بارہ بجے تھے اور ہمارے خیال میں اس وقت اسکول میں پڑھائی ہو رہی تھی۔

"نہیں جی۔ مَیں اُستاد صاحب سے پُوچھ کر گھر میں بکری کو چارہ ڈالنے آیا تھا کیونکہ میرے ماں باپ دوسری بستی میں ایک شادی پر گئے ہُوئے ہیں۔"

ناصر ذہین بچّہ تھا۔ ساتھ ہی باتُونی بھی تھا۔ اُس کی معلومات ہمارے لیے حیران کُن تھیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ مذہبی اور سماجی اُمور سے واقف تھا۔ اُس کی یونیفارم بوسیدہ ہو رہی تھی، پاؤں سے ننگا تھا جس سے اُس کے ماں باپ کی اقتصادی حالت کا پتہ چل رہا تھا۔ گندم کے ہرے بھرے کھیت اور ان میں اُگے ہُوئے سیب، خوبانی اور شہتوت کے درخت ان لوگوں کی کل متاع ہے اور یہ کھیت بھی محدود زمین پر ہیں ورنہ باقی چاروں

جانب تو بھورے پہاڑ کھڑے ہیں۔ بنجر اور بے فیض جن پر گھاس کا تنکا بھی نظر نہیں آتا۔

ہمارا ایک دوست پاکستان کے ابتدائی برسوں میں یہاں تعینات ہُوا۔ یہ علاقہ نیا نیا ڈوگرہ راج سے آزاد ہُوا تھا۔ اُس زمانے میں بلتستان باقی دُنیا سے کٹا ہوا تھا۔ ہمارا یہ دوست بڑی مشکل سے کئی روز کا سفر طے کر کے اسکردو پہنچا تھا۔ کھانے کا وقت آتا تو اُس کے میزبان چنگیروں میں سُوکھے شہتوت اور سُوکھی خوبانیاں سجا کر رکھ دیتے۔ یہی اُن کی خوراک تھی۔ سیب وغیرہ باہر جا نہیں سکتے تھے، اس لیے اُن کا بیشتر حصّہ جانوروں کو چارے کے طور پر کھلایا جاتا تھا۔

پتھروں پر چل چل کر ہمارے پاؤں دُکھنے لگے تھے۔ چھوٹے چھوٹے نالے چھلانگیں لگا کر عبور کرنے پڑتے۔ پہاڑ گزرا تو سامنے پھر سرسبز کھیت آ گئے۔ اُن کے بعد پتھریلی ڈھلان شروع ہو گئی جس پر سے اُترنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی مدد لینا پڑی۔ اچانک ناصر علی زور سے پکارا: ”وہ دیکھیں کچورا جھیل۔“

گہرائی میں پانی کا ایک بہت بڑا پیالہ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ کچورا جھیل تھی۔ شنگریلا ہوٹل والی جھیل سے کئی گنا بڑی۔ اس کی شکل پانی سے بھرے کشکول جیسی تھی۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ۔ اگر زیادہ پانی آ جائے تو بھی اس جھیل میں سما جائے۔ ہم جھیل کنارے مخملیں فرش پر لیٹ گئے۔ سروں پر سرسبز درختوں کا سایہ تھا۔ سرسراتی ہوا جسم و جاں کو آسودگی بخش رہی تھی۔ بادِ شمیم کا صحیح تصور یہیں پہنچ کر ہوتا ہے۔ افسوس کہ جھیل سیف الملوک کی طرح یہاں کوئی ٹک شاپ نہیں تھی جہاں گرم گرم چائے مل جاتی اور اس جھیل کا لُطف دوبالا کر دیتی۔

اصل میں اس جھیل کا راستہ اس قدر دشوار گزار ہے اور یہاں تک آنے والے سیاحوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ کسی کو یہاں ٹک شاپ کھولنے کا خیال نہیں آیا۔ عام سیاح شنگریلا ہوٹل والی جھیل ہی کو کچورا خیال کر کے وہیں سے لوٹ جاتے ہیں۔ اصل کچورا جھیل پر بس ہم چاروں تھے یا ہمارا ننھا گائیڈ ناصر علی۔

”کیوں ناصر علی، تم ہمارے ساتھ پنجاب جانے کے لیے تیار ہو؟ ہم وہاں تمہیں پڑھائیں گے۔ اچھے اچھے کپڑے پہننے کو دیں گے۔“

”نہیں جی! میرا باپ نہیں مانتا۔ یہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب لاہور میں نوکری کرتے ہیں۔ اُنھوں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ ناصر علی ہمیں دے دو۔ ہم اسے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے مگر اُس نے انکار کر دیا۔ اُس ڈاکٹر کی بیوی اچھی نہیں تھی۔“

”کیوں اچھی نہیں تھی؟“ ہم نے دلچسپی لیتے ہُوئے پُوچھا۔

”جی وہ فیشن بہت کرتی ہے اور نوکروں کو مارتی بھی ہے۔“

”اچھا ناصر علی، یہ بتاؤ تم اسکول میں اسلامیات بھی پڑھتے ہو؟“ اصلاحی صاحب نے پُوچھا۔

”جی ہاں! مجھے بارہ اماموں کے نام بھی یاد ہیں۔ امام علیؓ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ، امام جعفر صادقؒ، امام موسیٰ کاظمؒ......“

”بس ناصر علی، بس۔ واقعی تمہیں بارہ اماموں کے نام یاد ہیں۔ تم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے نام بھی سُنے ہیں؟“

”ہاں جی! ہمارے اُستاد نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ اچھے آدمی نہیں تھے۔“ ناصر علی کے اُستاد کا یہ انکشاف ہمارے دل پر لگا۔

”کیا تمہیں پتہ ہے پاکستان کا صدر کون ہے؟“ ہم نے گفتگو سیاست کی طرف موڑتے ہُوئے پُوچھا۔

”جی صدر ضیا، وہی وردی والا۔ اب بھٹو صاحب کی بیٹی آئی ہے۔ اب وہ اُسے نہیں چھوڑے گی۔ ہم نے فلم بھی دیکھی ہے۔ پانچ سو لاؤڈ سپیکر لگے ہُوئے تھے جب بھٹو صاحب کی بیٹی لاہور آئی، اُس نے گلے میں یا علیؑ کا لاکٹ پہنا ہُوا تھا۔“

ہم اپنے ننھے گائیڈ کی سیاسی معلومات پر حیران رہ گئے۔

جھیل کنارے آرام کرتے ہمیں خاصی دیر ہو چکی تھی۔ ہمیں جیپ والے کا بھی خیال تھا کہ وہ ہمارا انتظار کر رہا ہو گا، لہٰذا اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اُوپر چڑھنے سے ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ بڑی مشکل سے دوبارہ کھیتوں میں پہنچے۔ جھیل پہاڑوں کی اوٹ میں آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ سر پر دوپہر کا سُورج چمک رہا تھا۔ ننھے ناصر علی کی دلچسپ باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ انہیں سردیوں میں چھٹیاں ہوتی ہیں لیکن یہاں برف اس قدر پڑتی ہے کہ وہ چھٹیاں گھر میں قید ہو کر گزارتے ہیں۔

”گرمیوں میں بھی کچھ چھٹیاں ہوتی ہوں گی۔“ ایم ڈی صاحب نے پُوچھا۔

”گرمی تو یہاں آتی ہی نہیں۔ ہاں گندم کی کٹائی کے موقع پر چھٹیاں ہوتی ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے اب ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی آ گئی۔ ناصر علی نے ایک خستہ سے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: ”وہ میرا گھر ہے۔ اچھا جی میں چلتا ہُوں۔“

ناصر علی بے نیازی سے جُدا ہونے لگا تو ایم ڈی نے اُسے روکا اور کچھ پیسے دیے جو اُس نے ہمارے اصرار کے بعد ہی قبول کیے۔ وہ سیر چشم تھا۔ اپنا حق الخدمت لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہُوئے اُسے شرم آتی تھی۔ اللہ اُس کی سیر چشمی سلامت رکھے اور اسے پُورے پاکستان پر پھیلا دے۔ ورنہ ہماری عزتِ نفس تو روز بروز جواب دیتی جا رہی ہے۔

ناصر علی کو الوداع کہہ کر ہم کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوبارہ چلنے لگے۔ تھوڑی دُور ہی چلے تھے کہ سامنے سے ہمارا جیپ ڈرائیور اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ وہ لوگ ہمیں لینے آ رہے تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں چائے پینے کے لیے آدھے گھنٹے کی مزید مہلت دے دی۔ اس آخری جیپ اسٹینڈ پر ایک چھوٹا سا دو منزلہ ہوٹل تھا جس کی دیواریں لکڑی کی تھیں۔ ہم نے پانی لے کر مُنہ ہاتھ دھوئے اور چوبی سیڑھی سے اُوپر کی منزل پر چلے گئے۔ یہاں کی سادہ سی چائے نے وہ لُطف دیا جو فائیو اسٹار میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ سامنے سرسبز کھیت، صاف پانی کا بہتا ہُوا چشمہ۔ کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہُوئے بادِ شمیم کے جھونکے اور اس خُنک ماحول میں گرم گرم چائے۔ انسان کو اور کیا چاہیے۔

بادلِ نخواستہ وہاں سے اُٹھے اور جیپ میں بیٹھ کر شنگریلا ہوٹل کراس کرتے ہُوئے اُس شاہراہ پر آ گئے جو اسکردو کو گلگت سے ملاتی ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر سے بلتستان کا رابطہ بیرونی دُنیا سے قائم ہو گیا ہے ورنہ اس سے قبل یہ بند وادی تھی۔ اسی کے باعث اسکردو میں اشیائے صرف کی قیمتیں پہلے سے نصف رہ گئی ہیں کیونکہ اب پنجاب اور سرحد سے مال بردار ٹرک بآسانی آ جا سکتے ہیں اور بلتستان کی پیداوار باہر جانے سے یہاں کی خوشحالی میں قابلِ قدر اضافہ ہُوا ہے۔

سڑک پر کھڑے رہنا مشکل تھا کیونکہ گرمی خاصی تھی؛ چنانچہ قریبی محصول چُنگی میں گھُس گئے۔ اندر لکڑی کے دو بنچ تھے اور گوشے میں ایک چارپائی۔ ہم اُنہی پر دراز ہو گئے۔ دیواروں پر امام خمینی کی بڑی بڑی تصویریں چسپاں تھیں۔ نفاذِ فقہ جعفریہ کے نعرے بھی درج تھے۔ امامیہ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے ’امریکہ مُردہ باد‘ کا نعرہ بھی لکھا ہُوا تھا۔

اتنے میں گلگت کی طرف سے ناٹکو کی بس آ گئی جو مسافروں سے لدی ہُوئی تھی۔ کنڈکٹر نے بڑی مشکل سے دو سیٹیں مہیا کیں۔ بس میں علاوہ سامان کے بورے بھی لدے ہُوئے تھے۔ ہمارے دو ساتھی اُنہی بوروں پر بیٹھ گئے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم کالج کے سامنے کھڑے تھے۔ پروفیسر تاج صاحب کے ایک شاگرد انہیں شہتوتوں کی ٹوکری دے گئے تھے جو اُنھوں نے ہمارے لیے رکھی ہُوئی تھی۔ پروفیسر صاحب کی دل شکنی گوارا نہ تھی، لہٰذا اس ٹوکری میں سے بھی کچھ شہتوت کھائے۔ آج کے سفر میں ہم بے حد تھک چکے تھے اس لیے نماز پڑھ کر جلد سو گئے۔

پاکستان کی برکات

ہمارا آج کا دن ملاقاتوں کے لیے وقف تھا۔ عام لوگوں سے مل کر ہم بلتستان کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرنسپل خواجہ مہرداد نے بتایا کہ جب نیا نیا پاکستان بنا اور شمالی علاقوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے آزادی حاصل کی تو یہاں کی معاشی حالت بڑی خراب تھی۔ یہ علاقے باقی ملک سے کٹے ہُوئے تھے۔ گندم یہاں ڈکوٹا طیارے کے ذریعے آتی تھی۔ جس روز گندم کا جہاز آتا شہر میں عید کا سا سماں ہوتا۔ وہ دو چار چار

سیر کے پرمٹ کے لیے لوگ منتیں کرتے تھے۔ یہی حال مٹی کے تیل کا تھا۔ ایک بوتل کا پرمٹ لینے کے لیے در در کی خاک چھاننا پڑتی۔ اسی طرح نمک جیسی عام چیز بھی یہاں مشکل سے دستیاب ہوتی۔ جب لاہور میں نمک پچاس پیسے سیر بکتا تھا یہاں چھ روپے سیر بھی مشکل سے دستیاب ہوتا۔ اب یہ ساری چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں۔ سڑک کھلنے سے یہ علاقہ دُنیا بھر سے مربوط ہو گیا ہے۔

تعلیمی لحاظ سے بھی اس علاقے نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ہُنزہ، گلگت اور بلتستان میں تعلیم اب اس قدر عام ہو گئی ہے کہ پڑھے لکھے بے کار نوجوانوں کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ پنجاب اور سرحد سے جو لوگ بطور اُستاد یہاں تعینات ہیں وہ یہاں زیادہ خوش نہیں اور اپنے اپنے علاقے میں تبادلہ چاہتے ہیں لیکن وفاقی پبلک سروس کمیشن نے جن لوگوں کو شمالی علاقوں کے لیے بھرتی کیا تھا، اُن سے یہ شرط پہلے ہی منظور کرا لی تھی کہ وہ صرف انہی علاقوں میں ملازمت کریں گے؛ چنانچہ یہ لوگ صرف ہُنزہ، گلگت اور اسکردو کی نوکری کرنے پر مجبور ہیں۔ جب ان علاقوں میں تعلیم عام نہ تھی، یہاں کے لوگ محنت مزدوری کے لیے عموماً راولپنڈی اور کراچی کا رُخ کیا کرتے ـــــ یہ لوگ محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے رہتے؛ چنانچہ اسکردو کالج میں کئی ایسے لیکچرر ملے جنھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے یا ایم ایس سی کر رکھا ہے۔ اس طرح وہ مزدوری کرتے کرتے عالم فاضل بن گئے اور اب اپنے علاقے میں علم کا نور پھیلا رہے ہیں۔

پورے بلتستان میں کوئی سینما نہیں؛ البتہ بعض گھروں میں وی سی آر ضرور موجود ہوں گے کیونکہ بجلی میسر ہے۔ مقامی لوگ چونکہ مذہبی مزاج رکھتے ہیں، اس لیے اس قسم کی خرافات پسند نہیں کرتے۔ خواجہ مہرداد نے بتایا کہ پچھلے دنوں ایک شخص نے اپنی دکان میں وی سی آر دکھانا شروع کر دیا جس پر عوام نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک شخص نے رات کی تاریکی میں بم مار کر یہ 'سینما گھر' تباہ کر دیا۔

اسکردو میں ایک ریڈیو اسٹیشن بھی موجود ہے لیکن ہمیں اس کی نشریات سُننے کا موقع نہ ملا۔ پتہ نہیں یہاں سے موسیقی [illegible] نشر ہوتی ہے یا نہیں: البتہ ایک پروڈیوسر کو جب پتہ چلا کہ [illegible] ریڈیو پاکستان لاہور کے 'سوہنی دھرتی' پروگرام میں کمپیئرنگ کر[illegible] اور وقتاً فوقتاً ٹاکس بھی دیتے رہتے ہیں تو وہ ہمارے پاس آیا [illegible] اور اسکردو ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرنے کے لیے کہا۔ ہم نے اُس سے وعدہ تو کر لیا کہ کسی وقت آ کر تقریر ریکارڈ کرا دیں گے لیکن افسوس کہ اس کے لیے وقت نہ مل سکا۔ اُسی پروڈیوسر نے ہمیں بتایا کہ مقامی لوگ اکثر مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ریڈیو [illegible] سے ائمہ معصومین کے بارے میں پروگرام نشر کیے جائیں [illegible] قسم کے گمنام خط اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں کہ اگر ائمہ [illegible] کے متعلق پروگرام نشر نہ کیے گئے تو ہم بم مار کر ریڈیو اسٹیشن [illegible] کر دیں گے۔

بلتستان کی مذہبی حالت

پاکستان میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر کبھی مردم شماری نہیں [illegible] اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بلتستان میں شیعہ [illegible] آبادی کا تناسب کیا ہے لیکن ہمیں اکثر لوگوں نے بتایا کہ یہاں کی نوے فیصد آبادی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی دس فیصد میں نوربخشی اور سُنی آتے ہیں۔ نوربخشی پاکستان کے اندر صرف اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ فرقہ شیعہ اور سُنی دونوں کے بین بین ہے اور امیر کبیر علی ہمدانیؒ کی کوششوں سے مسلمان ہوا جن کا مزار سری نگر میں مرجعِ خلائق ہے۔ بلتستان میں سُنیوں نے 'انجمن اہلسنت بلتستان' کے نام سے اپنی تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کے تحت بہت سی مساجد اور عربی مدارس کام کر رہے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا مدرسہ جامعہ اسلامیہ اسکردو ہے۔ اسی طرح جامعہ صدیقیہ خپلو، سلطان المدارس ڈغنی، مدرسہ تعلیم القرآن تھنگ بوس اور مدرسہ الفاروقیہ کھرکوہ کے زیرِ اہتمام کام کر رہے ہیں۔ اس انجمن کو صدیقی ٹرسٹ کراچی کا مالی تعاون حاصل ہے۔

بلتستان میں سب سے بڑی مسجد مرکزی جامع مسجد اسکردو ہے جسے سنہ ۱۹۱۴ء میں ڈوگرہ حکومت کے ایک نیک دل وزیر

[illegible] اللہ خان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد بہت خستہ ہو چکی تھی؛ چنانچہ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق گزشتہ دورے میں جب بلتستان گئے تو اُنھوں نے اس مسجد کی مرمت کے لیے دس لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن اسکردو میں بھی جامعہ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اسکردو کے پُرانے بازار میں بھی سُنیوں کی ایک مسجد بن رہی ہے۔ اسی طرح خپلو میں بھی سُنیوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کر لی ہے۔

شیعہ بھائی آبادی کا غالب حصہ ہیں، اس لیے وہاں سُنیوں میں اقلیتی تحفظ کا وہی احساس پایا جاتا ہے جو پاکستان کے باقی علاقوں میں اہلِ تشیع میں ملتا ہے۔ کاش! مسلمانوں میں فرقہ بندی ختم ہو جائے اور یہ سارے فرقے ملّتِ اسلامیہ میں گُم ہو جائیں۔ اگر ہمارے دینی رہنما اور علما فرقہ وارانہ اختلاف کو ہوا دینے کے بجائے اسلامی اخوت اُجاگر کرنے کی کوشش کریں تو ملّت کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب حقیقت کا رُوپ دھار سکتا ہے۔ لیکن یہ 'اگر' بہت بڑا 'اگر' ہے کیونکہ پھر مذہبی مناظرہ بازوں کی اپنی اہمیت ختم ہو جاتی ہے جن کی ساری شان و شوکت اور معاشی مفاد اسی افتراق سے وابستہ ہے۔

شمالی علاقہ جات کی سیاسی پوزیشن بھی خاصی دلچسپ ہے۔ حکومتِ پاکستان نے شمالی علاقے ابتدا ہی سے آزاد کشمیر میں شامل کرنے کے بجائے براہِ راست مرکز کے تحت رکھے ہیں۔ ان کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک سولہ رکنی کونسل منتخب ہوتی ہے جسے 'ناردرن ایریا کونسل' کہا جاتا ہے۔ یہ کونسل مرکز کے وزیرِ امورِ کشمیر کے ماتحت کام کرتی ہے جو اس کونسل کا چیئرمین کہلاتا ہے۔ اسی طرح شمالی علاقوں کے تینوں اضلاع میں منتخب ضلعی کونسلیں کام کرتی ہیں۔ کچھ عرصے سے حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ علاقے باقاعدہ آزاد کشمیر میں شامل کیے جائیں ـــــ مگر ان کی سٹریٹجک اہمیت کے پیشِ نظر شاید حکومتِ پاکستان انھیں براہِ راست مرکز کے تحت ہی رکھنا پسند کرے گی۔ ان کی سرحدیں چین، رُوس اور بھارت سے ملتی ہیں، اس لیے حکومت انھیں حسّاس علاقے قرار دینے میں حق بجانب ہے۔

اُردو کی فتوحات

شمالی علاقوں کا دورہ کرنے سے ہم پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اُردو واقعی پورے برِصغیر کی رابطہ زبان بن چکی ہے۔ درہ خنجراب سے لے کر بلتستان کے آخری کونے تک اگرچہ متعدد مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر ایک زبان جو سب جگہ بولی اور سمجھی جا سکتی ہے وہ صرف اور صرف اُردو ہے۔ اُردو کی عملداری ہم نے راکاپوشی ہوٹل میں بھی دیکھی جو ہُنزہ کے صدر مقام کریم آباد میں واقع ہے۔ اُردو کی حکومت مشہ بروم اور قلعہ بلتت کے علاوہ کھرپوچو میں بھی دکھائی دی جو خالص بلتی کلچر کے حصے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرائع آمدورفت کی ترقی سے اُردو ان دشوار گزار گھاٹیوں تک جا پہنچی ہے جہاں اس سے قبل مقامی بولی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں سمجھی جاتی تھی۔

یہ دُرست ہے کہ ہر علاقے کی اُردو پر مقامی اثرات غالب ہیں لیکن یہی تو اس زبان کی ترقی کا اصل سبب ہے۔ اسکردو ڈگری کالج کے صدر شعبۂ اُردو نے بتایا کہ یہاں کے طلبہ اُردو میں ایم اے بھی کر لیں تو پھر بھی میرؔ فرماتی ہے 'بولیں گے' مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے میرؔ کی جنس تو نہیں بدل جائے گی۔ ہاں اُردو کی عملداری میں ضرور اضافہ ہو گا۔ سچ پوچھیے تو مقامی لوگوں سے اُن کے لہجے میں اُردو سُن کر بڑا لُطف آتا ہے۔ پروفیسر پریشان خٹک کی اُردو جتنی پیاری لگتی ہے، اتنی پیاری تو اہلِ زبان کی بھی نہیں لگتی، لہٰذا اُردو کو فطری طور پر آگے بڑھنے دیجیے۔ مقامی لوگوں کے لہجے پر ناک بھوں نہ چڑھائیے بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی کیجیے تاکہ اُردو پورے مشرق کی رابطہ زبان بن جائے۔

بلتستان کے سُلگتے مسائل

بلتستان کا سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری ہے۔ یہاں قابلِ زراعت رقبہ محدود ہے، اس لیے زرعی شعبہ یہاں زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے یہاں صنعت کا نام و نشان نہیں۔ گھریلو صنعتیں موجود ہیں لیکن اُن میں کتنے لوگ

کھپ سکتے ہیں۔ لے دے کے سیاحت کی صنعت کچھ لوگوں کو روزگار فراہم کردیتی ہے لیکن اسے فروغ دینے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کے محکمہ سیاحت پر ابھی تک انگریزیت چھائی ہوئی ہے۔ وہ ہوٹل قائم کرتا ہے تو انگریزی طرز کے اور پبلسٹی کرتا ہے تو انگریزی میں۔ اُس کے نزدیک ملکی سیاحوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چند غیرملکی تو ضرور آجاتے ہیں لیکن اس محکمے کے تعمیر کردہ ہوٹل زیادہ تر خالی رہتے ہیں اور اُلٹا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اگر سیاحت کا محکمہ اہلِ پاکستان کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوجائے اور پاکستان اور اسلامی مزاج پیشِ نگاہ رکھ کر سہولتیں فراہم کرے تو یہ صنعت کئی گنا ترقی کرسکتی ہے۔ ہم نے اسکردو میں چند غیرملکی ہپّی دیکھے جو گندی شلوار کے اُوپر صرف ایک میلی کچیلی بنیان پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے میلے چکٹ کپڑوں سے بدبُو کے بھبھوکے اُٹھ رہے تھے۔ اُن کے مقابلے میں پاکستانی سیاح کہیں گُنا تھے اور اُن کی مالی حالت بھی بہتر نظر آتی تھی لیکن وہ محکمۂ سیاحت کے شاکی ہی نظر آئے جو اُنہیں بُری طرح نظر انداز کرتا ہے۔

شمالی علاقوں میں ہم نے جگہ جگہ درختوں کے نیچے پک کر گرے ہوئے شہتوتوں کا فرش بچھا ہُوا دیکھا۔ اگر اُنہیں ضائع ہونے سے بچایا جائے تو لوگوں کو روزگار بھی مل جائے گا بلکہ زرِ مبادلہ بھی کمایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح چیری، سٹرابری، خوبانی اور سیب ڈبّوں میں بند کرنے کی صنعت قائم ہوسکتی ہے۔ نیز معدنی پانی بوتلوں میں بند کرکے برآمد کیا جاسکتا ہے۔

بلتستان کا دوسرا بڑا مسئلہ سردی ہے۔ یہاں ملک بھر میں سب سے زیادہ سردی پڑتی ہے اور لوگ تین چار ماہ تک گھروں میں قید ہوکر رہ جاتے ہیں۔ سردیوں میں درجۂ حرارت منفی بیس سنٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ شدید سردی میں اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنی بجلی نہیں ہوتی کہ ہیٹر کام کرسکیں۔ مٹی کا تیل بھی کمیاب ہے اور لوگوں کی قوتِ خرید محدود۔ لے دے کے لکڑی کا ایندھن رہ جاتا ہے لیکن جنگلات کم ہونے کی وجہ سے یہاں گیلی لکڑی کی قیمت تیس چالیس روپے من ہے۔

لوگ پھل دار درخت کاٹ کر بطور ایندھن استعمال ... ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہاں سال بہ سال پھل دار ... کم ہوتی جارہی ہے۔

جب سے سیاچن کا تنازع شروع ہُوا ہے اور ... میں آئی ہے، ایندھن کا مسئلہ مزید گھمبیر ہوگیا ہے ... لکڑی فوجی ٹھیکیدار لے جاتے ہیں جس سے قیمتیں ... لگی ہیں۔ پرنسپل خواجہ مہرداد صاحب نے ہمیں بتایا ... میں استعمال شدہ گرم کوٹ اور سویٹر نعمتِ غیرمترقبہ ... ہیں۔

ہمیں چند پروفیسروں نے بتایا کہ سردیوں میں ... ماہوار ایندھن الاؤنس ملتا ہے۔ گویا تین ماہ کے ... مل جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے یہ الاؤنس ڈوگرہ راج میں ... ہُوا ہوگا جب ایندھن روپے کا دو من ملتا ہوگا۔ اب ... سیر ہے لیکن ریٹ وہی ہے۔ اس پر نظرثانی ہونی چاہیے۔

ہم راولپنڈی ایئرپورٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں ... کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک نائب صوبیدار فوجی وردی ... ساتھ والی کرسی پر آبیٹھے۔ اُنہیں بھی اسکردو جانا تھا۔ اُنہوں ... سبز کریلوں اور ٹماٹروں سے بھرا ہُوا ایک شاپنگ بیگ ... تھا۔ ہم نے حیران ہوکر پُوچھا کہ آپ یہ سبزی بھی اپنے ساتھ ... رہے ہیں۔

اُنہوں نے جواب دیا کل اسکردو سے ایک دوست کا فون آیا تھا کہ میرے لیے سبزی لیتے آنا۔ معلوم ہُوا کہ جب بھی کوئی فوجی چھٹی گزار کر لوٹتا ہے تو وہ تازہ سبزی ضرور لے کر جاتا ... اور سکردو پہنچ کر ہمیں احساس ہُوا کہ واقعی وہاں تازہ سبزی نوادرات میں شمار ہوتی ہے۔

مقامی لوگوں کے مطابق بلتستان کی سیر کا صحیح موسم اگست اور ستمبر ہے۔ اُن دنوں یہاں سیب، خوبانی، چیری اور سٹرابری پکے ہوئے اور عام دستیاب ہوتے ہیں۔ ہم پھلوں کے موسم سے پہلے پہنچ گئے تھے، لہٰذا بلتستانی سیب کھانے کی حسرت دل میں لیے لوٹ آئے۔

قلعۂ کلیت

وادیٔ کشمیر میں سربکف مجاہدوں کی بہادری اور عزیمت کے خُون رنگ واقعات۔

اسماعیل صدّیقی کے قلم سے

اپریل ۶۵ء میں راولپنڈی میں یُو این او کے ایک مبصر کا سُنایا ہُوا دوسرا واقعہ بھی آپ سُن ... نام اور مقام فرضی اور الفاظ اُنہی کے ہیں:

"ایک دن مَیں بارڈر کا دورہ مکمّل کر کے دن ڈھلے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچا جو مقبوضہ کشمیر کے علاقے پونچھ میں ہے۔ دن بھر ... پوسٹوں کا چکّر لگاتا رہا تھا، اس لیے سخت تھکا ہُوا تھا۔ ... تبدیل کیا اور مَیس میں آگیا جو مہاراجہ کشمیر کے ایک پُرانے ... میں ہے۔ تھکن دُور کرنے کے لیے مَیں نے مشروب کا گلاس لیا اور آرام سے بیٹھ کر پینے لگا۔ مَیس میں بھارتی افسر بھی تھے۔ اچھی خاصی گپ شپ چل رہی تھی کہ اچانک یُوں لگا جیسے جہنم کے دروازے کھول دیے گئے ہوں۔ ہر طرف سے گولے پھٹنے اور گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بے پناہ شور و غوغا تھا۔ میس میں جتنے بھارتی افسر تھے، سب پہلا گولہ پھٹنے کی آواز سُنتے ہی زمین پر لیٹ گئے اور پھر آہستہ آہستہ رینگ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ مَیں سمجھ گیا کہ یقیناً یہ کشمیر کے فریڈم فائٹرز کی کارروائی ہے جنہوں نے عین بھارتی لائنوں میں گھُس کر ایکشن کیا ہے۔ مَیں

نے کوئی خاص پروانہ کی اور آرام سے بیٹھا مشروب کی چُسکیاں لیتا رہا۔ مَیں نے سوچا مجھ سے کسی کو کیا پرخاش ہو سکتی ہے۔ مَیں تو اقوامِ متحدہ کا مبصر ہُوں۔

"کچھ دیر بعد شور و غوغا قدرے کم ہُوا؛ البتہ اِکّا دُکّا فائرنگ کی آواز آتی رہی۔ خاصی دیر بعد بھارتی افسر لوٹے اور اُنہوں نے بتایا کہ ریڈرز (RAIDERS) آ گئے تھے۔ ہم نے اُن میں سے ایک کو مار لیا ہے۔ آؤ ساتھ چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھو اور تصدیق کر لو کہ یہ دُشمن کا سپاہی ہے۔ مَیں بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ایک آدمی جس نے سیاہی مائل کپڑے پہنے ہُوئے تھے، اُن کی لائنوں کے درمیان گولیوں سے چھلنی پڑا تھا۔

"مَیں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ۷ آزاد کشمیر رجمنٹ کا صوبیدار دوست محمد تھا۔ آزاد کشمیر اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے درمیان بارڈر کراس کرتے ہُوئے پُل کے دوسری جانب اکثر اُس سے ملاقات ہوتی تھی۔ بڑا اسمارٹ سولجر تھا۔ کبھی چائے پیے بغیر جانے نہ دیتا۔ اُس کی چائے اتنی میٹھی اور پکوڑے اس قدر نمکین ہوتے کہ عادی نہ ہونے کی بنا پر مجھے مزہ نہ آتا لیکن اُس کا خلوص اور اصرار دیکھتے ہُوئے مَیں نے کبھی انکار نہ کیا۔ وہ میری زبان سمجھتا تھا نہ مَیں اُس کی، مگر خلوص اور دوستی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اب تک مَیں نے اُسے ہمیشہ زندہ دیکھا تھا لیکن آج اُس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ چہرہ پُرسکون اور اُس پر دلآویز روایتی مسکراہٹ جیسے ابھی اپنی ٹُوٹی پھُوٹی انگریزی میں کہہ رہا ہو: 'FIRST TEA, THEN GO.'
(پہلے چائے پیجیے، پھر جائیے)

"مَیں اپنے خیالات میں گم کھڑا تھا۔ تمام واقعات میری نظروں کے سامنے ایک فلم کی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک بھارتی افسر کے استفسار پر مَیں چونک پڑا۔

'سر! دیکھا آپ نے اس حملہ آور کو؟'

"مَیں خاموش رہا۔ تو اُس نے دوسرا سوال کیا: 'سر! آپ نے اُسے بارڈر کے اُس طرف ضرور دیکھا ہو گا۔ آپ اسے ضرور پہچانتے ہوں گے۔'

"مَیں نے بلا تامل جواب دیا: 'نہیں۔ مجھے کیا معلوم ... سویلین ہے۔'

"یہ کہہ کر مَیں مُڑا اور دل ہی دل میں اُس کے اس بہا... اقدام کی داد دیتا واپس میس کی جانب چل پڑا۔ بارڈر سے ... دُور بھارتیوں کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر ریڈ کرنا کوئی معمولی ... نہ تھی۔ مجھ پر اُس کی موت اور قربانی کا بہت اثر ہُوا۔

"مَیں نے میس میں پہنچ کر اپنا مشروب اُٹھایا اور صو... پر بیٹھ کے دوبارہ شغلِ ناؤ نوش کرنے لگا۔ تب اچانک ... یہ بھیانک حقیقت آشکار ہُوئی کہ ریڈرز اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دُشمن کے علاقے میں اتنی دُور تک آ گئے تھے۔ غالباً ... نشانہ یہ آفیسرز میس تھا۔ اگر وہ میس تک پہنچ ہی جاتے ... یہاں ہینڈ گرینیڈ پھینکتے اور فائرنگ کرتے تو اس اقدام ... پہلے اُنہیں یہ تسلی کرنے کا کب موقع ملتا کہ یہاں یُو این او کا ... بیٹھا ہے یا صرف بھارتی ہیں۔ مَیں نے سوچا مَیں بڑا ہی ... ہُوں کہ موت میرے نزدیک سے ہو کر گزر گئی۔"

"اُس دن کے بعد آج پہلی مرتبہ تمہارے سامنے یہ وا... پُوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔"

ان اکیس برسوں میں اُن صاحب نے تو خدا جانے ... بار یہ داستان اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سُنائی ہو گی مگر ہم ... پہلی بار سُن رہے ہیں۔ کون جانے کشمیری حُریت پسندوں کی قربانیاں کب بار آور ہوں گی!

اُنہی دنوں ایک دن کمانڈر نے فیصلہ کیا کہ چلیں آج اپنے بریگیڈ کی یونٹ پنجاب رجمنٹ کا احوال دریافت کر... چلتے ہیں۔ یہی وہ رجمنٹ تھی جس نے چھمب کی فتح میں بڑا نمایاں حصہ لیا تھا۔ اُن کے کمانڈنگ افسر کرنل حنیف تھے۔ جنگ کے پہلے ہی روز وہ زخمی ہو گئے تھے (ملاحظہ کیجیے 'میری پلٹن کا خیال رکھنا'۔ اُردو ڈائجسٹ ۶۷-۱۹۶۶ء)

کمانڈر بریگیڈیئر ظفر نے حسبِ معمول اپنے ساتھ چند ... گرمے اور صاف تازہ پانی کی ایک بڑی پکھال رکھوائی۔ یہ تو ...

...ٹ پہنچنے پر پتہ چلا کہ ہماری جانب سے اُن کے لیے اس ... سے بڑھ کر اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ راستے میں کرنل ... کے ایکشن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ چھمب کے علاقے میں پہنچنے کے بعد ایک ٹیلے پر اپنا بٹالین ہیڈ کوارٹر قائم کرنا چاہتے تھے کہ اچانک ایک جانب سے اُن پر مشین گن ... فائر کھول دیا۔ اُنہوں نے جھٹ اپنی جیپ ایک طرف موڑی اور ٹیلے کے دوسری جانب ہو گئے۔ وہاں سامنے ایک ٹینک کھڑا تھا۔ اُس نے فائر کھول دیا تو اُنہوں نے دوبارہ پھُرتی سے اپنی جیپ اُس کی زد سے نکالی اور خود کو اُس کے گولے کی زد سے بچایا۔ اب دُشمن کے دستوں سے اُن کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ وہ مشین گن والے کو مشین گن سے جواب دیتے۔ ٹینک والے کی طرف مارٹر کے گولے پھینکتے لیکن وہ اُنہیں کسی ایک طرف ٹکنے نہیں دے رہے تھے۔

آخر اُنہوں نے اپنی یونٹ کے ایک دستے سے آر آر گن منگوائی اور اُس سے ٹینک کی خبر لی۔ اُسے گولا تو نہ لگا مگر اُس نے ... سے پسپائی اختیار کی۔ پیچھے پلٹتے ہُوئے بھارتی ٹینک ... ٹریک راستے کی دلدلی نالی میں پھنس گیا۔ نکلنے کی کوشش ... ٹینک ایک غلط زاویے پر لڑھک کر دلدل میں اور دھنس گیا۔ ... تقریباً بیکار ہو چکا تھا مگر ٹینک والے نے ہمت نہ ہاری۔ ... نے آخری گولہ کرنل حنیف پر داغ دیا جو ایک درخت ... ٹکرایا۔ اس کے شارپنل جیپ کو لگے اور کچھ کرنل حنیف کے ... پر جس سے اُن کا جبڑا ٹُوٹ گیا۔ اُنہیں مجبوراً کمان اپنے ... کے حوالے کر کے علاج کی خاطر میدانِ جنگ چھوڑنا پڑا۔

دوسرے دن جب ہمارا ہیڈ کوارٹر پیش قدمی کر کے وہاں ... تو اُسی جگہ قیام کیا جہاں یہ معرکہ ہُوا تھا۔ وہاں چاروں طرف ... کے خول بکھرے ہُوئے تھے جنہیں دیکھنے سے اس جھڑپ ...ت کا اندازہ ہُوا۔

بھارتی ٹینک میں سے ٹینک کمانڈر کا پستول ملا تھا جسے کمانڈر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ اُسے ٹرافی کے طور پر ...نا چاہتے تھے۔ دیکھا تو پستول کی نالی ضرب زدہ تھی۔ خدا جانے بھاگتے ہُوئے افسر نے اُسے خود ہی چوٹ لگا دی تھی یا اُسے کوئی گولی لگی اور اس کی نالی پر گہرا نشان پڑ گیا۔ بہرکیف کمانڈر نے اُسے فائر کر کے ٹیسٹ کرنے کے لیے کہا۔ فائر تو اُس سے ٹھیک ہُوا، پھر بھی خطرہ تھا کہیں ضرب زدہ نالی فائر کرتے ہُوئے پھٹ ہی نہ جائے، اس لیے اُس کی حیثیت ایک ٹرافی سے زیادہ نہ تھی۔

یہ پنجاب رجمنٹ کالی دھر پہاڑی کی ایک چوٹی پر پوزیشن لیے ہُوئے تھی۔ دراصل جب ہم جوڑیاں کے علاقے میں داخل ہُوئے اور قلعہ کلیت کے نزدیک پہنچے تو فوجی نقطۂ نظر سے مناسب سمجھا گیا کہ اپنے بائیں بازو کو محفوظ بنانے کے لیے یہ پلٹن پہاڑ پر چڑھ جائے۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا لیکن یہ پہاڑ سنگلاخ اور دشوار گزار تھے۔ اُن پر چڑھتے اور آگے بڑھتے ہُوئے ہمارے جوانوں کے ایمونیشن، جرسیاں اور بُوٹ تار تار ہو گئے اور جب اُنہوں نے اپنی فائنل پوزیشن لی تو اکثر کے پاؤں جُوتوں میں سے جھانک رہے تھے اور جرسیاں جھلنگا بن چکی تھیں۔

ہم اُن ٹیڑھے میڑھے پہاڑوں اور ایک انتہائی دشوار راستے سے ہوتے ہُوئے اُن کی پوزیشن تک پہنچے۔ پہاڑ کی مغربی اوٹ میں ہمارے جوانوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ دوسری جانب ایک پہاڑی چھوڑ کر دُشمن کی پوزیشن تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ گزشتہ رات اُنہوں نے بڑی شدید بمباری کی تھی اور اُن کے کچھ گولے پہاڑ کے اس طرف بھی آ گرے تھے جو خوش قسمتی سے نالوں میں گرے، اس لیے کوئی نقصان نہیں کر سکے۔ ان دشواریوں کے باوجود ہمارے جوانوں کا مورال اُونچا تھا۔

وہاں مختلف مقامات پر پانی کے بڑے بڑے تالاب تھے جہاں دیہاتیوں کے جانور پانی پیتے اور وہیں سے ہمارے جوان پینے کے لیے پانی لیتے۔ نہاتے، کپڑے دھوتے۔ ہمیں البتہ ایک خاص دوائی کی گولیاں دی گئیں تھیں کہ اگر تالاب کا پانی پینا پڑے تو اُس میں ڈال کر اُسے مضرت سے محفوظ بنا لیں۔

ابتدائی دنوں میں اس علاقے میں دریائے چناب سے

نکالی ہُوئی ایک نہر سے ہمارے جوانوں نے خاصا استفادہ کیا لیکن اب وہ نہر خشک ہو چکی تھی؛ چنانچہ وہ بھی تالابوں کا پانی پینے پر مجبور تھے۔ اُنہوں نے الفاظ کا سہارا لیے بغیر جس تشکر کے ساتھ ہم سے تازہ صاف پانی اور گرمے وصول کیے، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

حسبِ روایت یونٹ والوں نے وہاں محاذِ جنگ کی سب سے اگلی پوسٹ پر گرم گرم چائے کی پیالیوں سے ہماری تواضع کی۔ وہیں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک معذور آدمی بیساکھیوں کا سہارا لیے پہاڑ کی اوٹ سے نمودار ہُوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ دوسری جانب کی سِول آبادی میں سے کوئی ہے۔ کمانڈنگ افسر نے بتایا کہ یہ شخص پہاڑ کے دوسری طرف ایک جھونپڑے میں رہتا ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو یہ موجود تھا۔ یہ ٹانگوں ہی سے معذور نہیں بلکہ گونگا بھی ہے۔ پہلے تو ہم نے خیال کیا کہ دُشمن، بھاگتے ہُوئے، اپنا ایک جاسوس چھوڑ گئے ہیں لیکن تحقیق اور تفتیش پر پتہ چلا کہ وہ فی الواقع معذور اور بالکل بے ضرر ہے۔

کمانڈر نے پُوچھا۔ "اگر ایسا ہے تو یہ کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟"

سی۔ او نے بتایا: "سر! ہم اپنے کھانے میں سے دے دیتے ہیں۔ شروع شروع میں تو گریزاں تھا مگر اب لے کر کھا لیتا ہے۔"

جب تک ہمارے ٹروپس وہاں رہے، اُنہوں نے اُس کا ہر لحاظ سے خیال رکھا۔ باتوں باتوں میں کرنل صاحب نے بتایا کہ پہاڑ کے مشرق میں واقع پوسٹیں دُشمن کی براہِ راست زد میں ہیں۔ اُن پر اکثر دُشمن کے توپ خانے کا فائر آتا رہتا ہے۔ ایک دن ایسا ہُوا کہ ایک جوان نے جائزہ لینے کے لیے خندق سے سر اُٹھایا۔ اُسی دم ایک گولہ آیا اور اُس کی گردن اُڑ گئی۔ کچھ دیر اُس کے ساتھیوں کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔

موت کا مقام اور وقت معیّن ہوتا ہے جس کا علم صرف ذاتِ باری تعالٰی کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اُسے کوئی ٹال سکتا ہے اور نہ وہ ٹل سکتا ہے۔

ابھی چھمب کی لڑائی شروع نہیں ہُوئی تھی مگر حالات روز بروز خراب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ عید کا زمانہ آیا۔ ہماری یونٹ مری کے قرب و جوار میں تھی۔ وہاں سے کچھ لوگ عید کی چُھٹی پر گھر جانے کے لیے روانہ ہُوئے۔ اتنے میں احکامات آ گئے کہ یونٹ فوراً اس محاذ کی جانب کُوچ کرے۔ چھٹیاں کینسل ہُوئیں۔ راستے میں پیغامات بھیجے گئے۔ چُھٹی پر روانہ ہونے والوں کو گھوڑا گلی میں روک کر واپس یونٹ بھیجا گیا۔ وہاں سے یونٹ یلغار کرتی بھمبر پہنچی۔ حکم ملا تم نے پڈھار میں مورچہ بند ہونا ہے۔ اُن لوگوں نے وہاں جا کر پوزیشن لی۔ ایسا کرنے کے بعد ایک حوالدار نے، جو چُھٹی کے راستے سے واپس آنے والوں میں تھا، دُوربین لے کر خندق سے سر اُبھارا تا کہ اپنے سامنے دُشمن کا جائزہ لے سکے۔ اتنے میں ایک گولی آئی اور اس کا سر پھاڑتی ہُوئی نکل گئی۔ صرف چوبیس گھنٹے پہلے وہ خوش خوشی گھر عید منانے جا رہا تھا اور اب اُس کی نعش اُس کے لواحقین تک پہنچی۔

یُوں موت اپنا شکار کہاں سے گھیر کر سینکڑوں میل دُور لے آئی۔

پنجاب یونٹ کی اس پلٹن میں ہماری ملاقات ایک سیکنڈ اِن کمان میجر اسلم سے ہُوئی جنہوں نے اگست کا پورا ماہ دُشمن کی صفوں کے پیچھے گزارا تھا۔ ہم نے اُنہیں سات اگست کو دُور بیٹھے، روشنی کے سبز، سفید، سُرخ لوگوں کی مدد سے کامیابی کا پیغام دیتے دیکھا تھا۔ کرنل حنیف کے زخمی ہو جانے کے بعد کرنل بابر اب سی او تھے اور میجر اسلم سیکنڈ اِن کمان۔

میجر اسلم نے پلانوالہ کے تھانے پر شبخون مارا تھا۔ جتنی دُور بیٹھے ہم دیکھ رہے تھے وہاں گولوں کے صرف شعلے دکھائی دیتے تھے۔ آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر چند لمحوں بعد روشنی کے گولے فضا میں بلند ہُوئے جو اس بات کی علامت تھے کہ اُن کا ایکشن کامیاب رہا۔ پھر جو دُشمن کی فوجوں نے اُن کا پیچھا شروع کیا تو کم و بیش بیس روز تک یہ اور ان کے ساتھی ڈُوبے، وہاں نکلے۔ بڑی کامیابی سے دُشمن کو ڈاج دیتے رہے

چونکہ اُن کی جانب سے ہمیں کوئی اطلاع موصول نہیں ہو رہی تھی، ہم لوگ اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے اپنے دلوں میں اُن کی فاتحہ پڑھ چکے تھے پھر اچانک ایک دن وہ سب طُول طویل سفر طے کر کے بخیریت اپنی یونٹ میں پہنچ گئے اور چند روز بعد چھمب جوڑیاں کے معرکے میں دادِ شجاعت دینے لگے۔

پلانوالہ کا تھانہ اس علاقے پر قبضہ ہو جانے کے بعد دیکھا۔ کنکریٹ کی پکّی بلڈنگ تھی جس پر سات اگست کی رات شبخون مارا گیا تھا۔ یاد رہے مندیالہ دریائے توی کے دوسری جانب اور سرحد سے تقریباً آٹھ دس میل دُور ہے۔ شبخون مارتے وقت تھانے پر راکٹ سے حملہ کیا گیا۔ راکٹ نے کنکریٹ کی دیوار میں تین چار انچ چوڑا چھید بڑی صفائی سے کیا اور دیوار چیرتا ہُوا کمرے میں داخل ہو کر پھٹا۔ وہاں کیا تباہی پھیلائی، اس کا صحیح علم نہیں ہو سکا کیونکہ جب ہمارا وہاں گزر ہُوا تو تھانے میں تقریباً جھاڑو پھرا ہُوا تھا۔ اب خدا جانے پولیس والے بھاگتے ہُوئے تھانے کی خود صفائی کر گئے تھے یا پھر آزاد کشمیر سے آ کر مالِ غنیمت بٹورنے والوں نے اپنا حق وصول کیا تھا۔

مالِ غنیمت وصول کرنے والوں میں ایک بوڑھا آدمی نہیں بھولتا۔ دن ڈھل رہا تھا جب ہم نے اُسے واپس جاتے دیکھا۔ اس نے اپنے سر پر ایک تھیلا اُٹھایا ہُوا تھا جس میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سیر گندم ہو گی۔ دن بھر کوفت اُٹھانے اور کم و بیش تیس چالیس میل کی مسافت کے عوض اُسے اناج کی یہ قلیل مقدار نصیب ہُوئی تھی۔ انسان کو اس دانہ گندم کے لیے کیسے کیسے خوار ہونا پڑتا ہے۔

پانچ برس بعد ایک بار وادیٔ نیلم میں جانے کا اتّفاق ہُوا۔ ہماری جیپ قصبہ آٹھمقام سے کچھ آگے نکلی تو دیکھا دُور سے اس کچے راستے پر ایک قافلہ کاندھوں پر کچھ اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو ہم سمجھے شاید کوئی جنازہ ہے۔ نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ درخت کی موٹی موٹی شاخوں کا بنا ہُوا ایک خود ساختہ اسٹریچر ہے اور اُسے بہت سے آدمی کاندھوں پر اُٹھائے لا رہے

اچھی اور بُری دیگر چیزوں کے ساتھ خیانتِ منصبی اور اقربا نوازی کی لعنتیں بھی ہمارے حصّے میں آئی ہیں۔ ہمیں ان برائیوں کو سختی سے کُچل دینا چاہیے۔ مَیں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہُوں کہ خیانتِ منصبی، اقربا نوازی اور بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ پر اثر ڈلوانے کی کسی کوشش کو مَیں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ جہاں مجھے معلوم ہُوا کہ فلاں جگہ ایسا ہو رہا ہے تو پھر خواہ کتنا ہی بڑا یا چھوٹا کیوں نہ ہو، ہرگز نہیں بخشوں گا۔

(۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو مجلسِ دستور ساز سے خطاب)

ہیں۔ ہم سمجھے شاید کوئی بیمار ہے جیسا کہ دیہات میں رواج ہے کہ مریض کو چارپائی پر اُٹھا کر ڈاکٹر تک لے جاتے ہیں۔

وہ بالکل قریب آ گئے تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہُوئی کہ اُس اسٹریچر پر کوئی مریض نہیں، بلکہ ایک بیل محوِ استراحت تھا۔ جی ہاں، اُن لوگوں نے ایک بیل کو اسٹریچر پر اُٹھایا ہُوا تھا۔ کچھ لوگ بطور کمک ہمراہ تھے اور اُن کے پیچھے اُن سے بھی بڑا ایک قافلہ عورتوں اور بچّوں کا تھا جو افتاں و خیزاں چلے آ رہے تھے۔

ہم دل میں پکار اُٹھے یا مظہر العجائب یہ کیا معمہ ہے۔ اپنے ساتھی سے استفسار کیا۔ اُس نے دل میں تو ہماری لاعلمی بلکہ کم علمی پر ضرور ماتم کیا ہو گا مگر بظاہر بڑے مشفقانہ انداز میں پُوچھا:

"آپ ابھی آٹھمقام کے پاس سے گزرے تھے نا؟"

ہم نے بڑی سعادت سے کہا: "جی ہاں۔"

وہ بولے: "آپ نے وہاں جانوروں کے اسپتال کا بورڈ بھی دیکھا ہوگا۔"

ہم نے سعادت کا معیار ذرا اور بلند کرتے ہوئے اس مشاہدے کا بھی اعتراف کیا۔

انہوں نے بڑی بے نیازی لیکن پوری بقراطیت کے ساتھ فرمایا:

"آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ پائے کہ اس بیل کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ ظاہر ہے علاج کے لیے اسپتال تک اسے چلا کر تو لایا نہیں جا سکتا تھا، اس لیے ان لوگوں نے یہی مناسب جانا کہ اسے اس اسٹریچر پر لاد کر اسپتال پہنچایا جائے۔"

جواب اور اس کی توجیہہ دونوں معقول تھے مگر ہمارے تجسّس کی ابھی پوری طرح تشفّی نہیں ہوئی تھی، للہٰذا اپنے زعم میں ایک اور چبھتا ہوا سوال کر ڈالا: "جناب! یہ تو بات سمجھ آگئی کہ اتنے بہت سارے مرد اس بیل کو کاندھا دینے کے لیے شاملِ قافلہ ہیں لیکن یہ عورتیں اور بچّے کس لیے ساتھ بندھے جا رہے ہیں:"

اس پر انہوں نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا اور کہنے لگے:

"جناب! فرض کیجیے کہ اسپتال والے کہہ دیتے ہیں بیلا علاج ہے، ٹانگ نہیں جُڑ سکتی۔ اب ذرا سوچیے یہ لوگ تیس چالیس کوس دُور سے اُسے اُٹھا کے لائے ہیں، لاعلاج ہونے کی صُورت میں ان کے لیے کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے۔"

ہم اس سوال کا جواب دینے سے معذور رہے تو وہ بولے: "دیکھیے صاحب! صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ اس ناکارہ بیل کو واپس لے جانے سے تو رہے۔ اب اس کے سوا کیا لائحۂ عمل رہ گیا کہ اسے ذبح کریں اور ضیافت اُڑائیں۔ یہ عورتیں اور بچّے صرف اس اُمّید پر ساتھ آئے ہیں کہ اگر ایسی صُورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو وہ اس نعمتِ غیر مترقبہ سے کیوں محروم رہیں۔"

آزاد کشمیر کے رہنے والے زمین کے چپّے چپّے سے، جس حد تک ممکن ہو، اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں، خصوصاً وہ لوگ جو جنگ بندی لائن کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، زمین کی آخری حد تک کھیتی باڑی کر کے اپنے بچّوں کا پیٹ پالتے ہیں جبکہ بھارتی فوج نے اپنی طرف کئی کئی میل تک سرحدی علاقہ لوگوں سے خالی کروا لیا ہے تاکہ مقامی لوگ ایک دوسرے سے میل جول قائم نہ رکھ سکیں۔ وہ اپنی سکیورٹی کے نقطۂ نظر سے بھی ایسا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اگر آپ کبھی بارڈر کی طرف جائیں تو پُرانی سیز فائر لائن یا نئی لائن آف کنٹرول کو پر اس طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے نقشے پر کوئی لکیر کھنچی ہوئی ہو۔ سرسبز اور کھیتوں والا علاقہ آزاد کشمیر ہوگا اور گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار پر مشتمل مقبوضہ کشمیر۔

چونکہ اس غیر آباد علاقے میں گھاس وافر ہوتی ہے ہماری جانب کے جانور خوراک کی تلاش میں اُس طرف [illegible] ہیں۔ اُن پر اکثر اوقات بھارتی فوجی فائر کھول دیتے ہیں۔ [illegible] اگر انسان مارا جائے تو اُن کے لیے باعثِ تسلّی ہوتا ہو [illegible] اگر جانور مارا جائے تو معلوم نہیں وہ گئوہتیا کے مر[illegible] ہیں یا نہیں۔ اُس وقت گئو ماتا کی محبت کہاں چلی جاتی [illegible] اُن کا بھگوان جانتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں جنگ بندی کے بعد جب دونوں [illegible] کی فوجوں نے اپنی اپنی دفاعی پوزیشنیں سنبھالیں تو ان [illegible] ایک بڑی چوڑی پٹّی خود بخود نو مینز لینڈ بن گئی۔ اُس میں [illegible] نے دفاعی نقطۂ نظر سے بارودی سُرنگیں بچھا رکھی تھیں۔ [illegible] میں اینٹی ٹینک اور اینٹی پرسانل دونوں قسم کی سُرنگیں تھیں۔ [illegible] اکثر یہ ہوتا کہ وہ جانور جو جنگل میں گھُس کر جنگلی ہو چکے تھے خالی علاقے کو محفوظ سمجھتے ہوئے یہاں چرنے کے [illegible] گھُستے اور جب اُن کا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر پڑتا تو وہ ایک بڑے دھماکے سے پھٹتی۔ ساتھ ہی جانور کے پر[illegible] جاتے اور پھر وہ گِدھوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی [illegible] بنتا۔ غرض ان جانوروں کا مقدّر کسی نہ کسی کی شکم پُری [illegible]

ایک دن ریڈیو پر خبر سُنی کہ کشمیر کے گھُس پیٹھیوں میں [illegible] کیپٹن غلام حسین پکڑے گئے ہیں۔ رسالہ ٹائم میں تصویر [illegible] چھپی جس میں ایک آدمی کی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر اُسے [illegible]

[illegible]راست اور پہرے میں لے جاتے دکھایا گیا تھا۔ ہمارے بھی اس نام کے ایک دوست جبرالٹر فورس میں تھے۔ ہم سمجھے شاید وہی ہوں گے مگر وہ کوئی اور تھے۔ ہمارے دوست غلام حسین دُبلے پتلے تھے مگر بلا کے بہادر اور حوصلہ مند۔ دو بار اپنے ان کارناموں کی بنا پر ستارۂ جرأت کے لیے نامزد ہوئے ــــ لیکن یہ وہ نہیں تھے۔ وہ خیریت سے واپس آگئے۔ پھر اپنی پلٹن کے ساتھ معرکۂ چھمب میں حصّہ لیا اور آخر کار ستارۂ جرأت کے مستحق ٹھہرے۔ آخری بار اُن سے ملاقات چند برس ہوئے سپریم کورٹ راولپنڈی کی مسجد میں ہوئی۔ ایک صاحب 'لوئی' کی بُکّل مارے نماز میں مشغول تھے۔ انہوں نے سلام پھیرا تو وہ غلام حسین نکلے۔ گلے ملے اور برسوں پُرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

اُن گھُس پیٹھیوں میں پکڑے جانے والے ہمارے ایک پرانے دوست اور کلاس فیلو کیپٹن سجاد بھی تھے۔ کئی برس بعد جب وہ ہمارے پڑوس میں آ کر رہے تو انہوں نے بتایا کہ اُن کی تعیناتی درہ حاجی پیر کے علاقے میں تھی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے وہاں کا ایک محیّر العقل واقعہ سُنایا۔ کہنے لگے:

"ایک دن بڑے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ایک بڑے طوفان کی آمد متوقّع تھی۔ چونکہ میرا بنکر کچھ مرمّت طلب تھا اس لیے میں نے چند جوانوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اُس کی چھت پر مزید مٹی وغیرہ ڈال کر اُسے اتنا مضبوط کر دیں کہ وہ موسم کی سختی برداشت کر سکے۔ میں انہیں ضروری ہدایات دے کر نیچے اپنے بنکر میں آ گیا۔ اسٹین گن دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور خود اپنے کیمپ بیڈ پر [illegible] گیا۔ بنکر کے دروازے میں سے بادلوں میں بجلی کے کوندے نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں بڑے زور سے بجلی کڑکی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی کا ایک گیند نما گولہ گھومتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ میں بیٹھا دم بخود دیکھ رہا تھا۔ وہ سیدھا میرے بنکر کی طرف آیا۔ دروازے سے داخل ہوا، اسٹین گن سے ٹکرایا اور ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اپنے بچ جانے پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ میرے وہ جوان جو چھت پر مٹّی ڈال رہے تھے، بے ہوش پڑے ہیں۔ اور جوانوں کو لے کر چھت پر چڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اُن کا جسم بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ کوئی خراش تک نہ تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس حادثے کا شکار کیونکر ہوئے۔ وہ تو جب اُن کے بُوٹ اُتارے گئے تو پتہ چلا کہ جُوتوں کے تلووں میں جتنی کیلیں تھیں، اُن کے پیروں کے تلووں میں اُتنے ہی سیاہ نشان تھے۔ تب پتہ چلا کہ اس آسمانی بجلی نے وہاں سرائیت ہو کر انہیں ELECTROCUTE کر دیا تھا۔"

اگرچہ ہم نے یہ کہانی بڑے تحمّل سے سُنی مگر دل میں سراسر گپ جانی۔ خاصے عرصے کے بعد ایک کتاب نظر سے گزری جس کا نام تھا INEXPLICABLE PHENOMENON یعنی ایسے واقعات جن کی توجیہہ نہ کی جا سکے۔ اُس میں تحریر تھا کہ بجلی کے ایسے گولے دیکھنے میں آئے ہیں مگر موجودہ سائنس ابھی تک اُن کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکی۔ تب ہمیں یقین آیا کہ اُس نے سچ ہی بتایا تھا۔

ہمارے استفسار پر اُس نے اپنا قصّہ یوں سُنایا:

"ہم اپنا مشن مکمّل کر کے واپس ہو رہے تھے مگر دشمن کے سپاہی ہماری کھوج میں چاروں طرف بھنّائے پھر رہے تھے۔ جہاں انہیں شُبہ ہوتا، وہ توپ یا مارٹر سے ہم پر گولہ باری شروع

ماہنامہ "طالب علم" کا
ایٹم بم نمبر
شائع ہو گیا ہے
مُدیر: سیّد قاسم محمود
کسی بھی نیوز ایجنٹ سے خریدیے
حسن علی آفندی روڈ - کراچی نمبر ۱

کر دیتے۔ ہم پہاڑوں پر چڑھتے گئے لیکن ایک دن اندھیرے میں جو پاؤں رپٹا تو مَیں پہاڑی سے لُڑھک گیا ٹخنہ اُتر گیا پھر بھی چلتا رہا مگر صبح تک وہ اتنا سُوج چکا تھا کہ جُوتا کاٹنے لگا۔ آخر جُوتا اُتارا، چلنے کی کوشش کی مگر اس حالت میں چلنا دشوار تر حتیٰ کہ بالکل ناممکن ہوگیا۔ ہم نے اپنے خیال سے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر وہاں پناہ لی کہ حالت ذرا بہتر ہو تو پھر سفر جاری رکھیں۔ پتہ نہیں دُشمن کو ہماری پناہ گاہ کا علم کیسے ہوگیا۔ ایک دن اُنہوں نے ہمارے گرد اپنا گھیرا تنگ کر کے اپنے شکنجے میں کس لیا۔

یُوں جنگی قیدی بن گئے۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں خاصے دن رہنا پڑا۔ ایک دن پتہ چلا کہ ہمارے نگران بھارتی فوجیوں کے اہلِ خانہ اور بچّے ہمیں دیکھنے آرہے ہیں۔ ہمیں بطورِ خاص کہا گیا کہ اپنا حلیہ وغیرہ درست کرلو۔

بچّے آئے۔ ہم سب کو بڑے تجسّس سے دیکھا لیکن ایک بچّے سے رہا نہ جا سکا اور اُس نے بڑی معصومیّت سے سوال کر ڈالا:

"ڈیڈی! آپ تو کہہ رہے تھے ہم جنگی قیدی دکھائیں گے۔ یہ تو انکل ہیں۔"

سب قہقہہ مار کے ہنس پڑے اور بڑے عرصے بعد ہم بھی ہنسے۔ وہ بچّہ بے چارہ بڑا کھسیانا ہُوا۔ خدا جانے اُس کے ذہن میں جنگی قیدی کا تصوّر کتنا بھیانک تھا۔ شکر ہے اُس نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ دیا کہ "یہ تو ہنستے بھی ہیں۔"

جنگ بندی کے بعد قلعہ کلیت میں اور اُس سے پہلے بھمبر میں برج سیشن زندگی کے معمولات کا بڑا اہم حصّہ تھے۔ جنرل اختر ملک برج کے رسیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "فنافی البرج" تھے۔ فارغ ہونے کے بعد میس میں آبراجتے۔ اُن کے لیے برج کی ٹیبل پہلے سے تیار رہتی۔ تھوڑی بہت گپ شپ اور اُس کے بعد گیم شروع ہوجاتی۔ پھر شام، رات، آدھی رات ہوجاتی حتیٰ کہ رات ڈھلنے لگتی۔

کھیل کے دوران میں لطیفے بھی ہوتے۔ ایک دن باتوں باتوں میں فوجی امداد کا تذکرہ آگیا۔ کہنے لگے اس بارے میں ایک بار میری امریکیوں سے بات ہُوئی تو مَیں نے اُنہیں اپنے گاؤں کی بُڑھیا کا قصّہ سُنایا:

ہمارے گاؤں میں ایک بُوڑھی بیوہ رہتی تھی۔ بچّے بھی تھے۔ محنت مزدُوری کر کے پیٹ پالتے مگر تھے اتنے غریب کہ کبھی دو وقت پیٹ بھر کے روٹی میسّر نہ آتی۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر میں صدقے کی بکری ذبح ہُوئی تو گھر والوں نے یہ سوچتے ہُوئے کہ ان سے زیادہ کون مستحق ہوگا، اُن کے گھر گوشت کی ران بھجوادی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بُوڑھی گوشت کی ران واپس لے آئی اور ہمارے گھر والوں کو بصد شکریہ واپس کر دی۔ ہم بڑے حیران ہُوئے۔ اُس سے اس حرکت کی وجہ پُوچھی تو اُس نے کہا:

"ملکانی جی! ہم اپنی دال روٹی میں خوش ہیں۔"

میری والدہ نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے کہا: دیکھیے جی! ہم آٹھ افراد ہیں جو رُوکھی سُوکھی ملتی ہے اُس میں گزارا کر لیتے ہیں۔ اب آپ نے گوشت بھیجا۔ پہلے تو اسے پکانے کے لیے گھی، مسالا، پیاز اور لہسن چاہیے پھر گوشت دیر سے گلتا ہے۔ اس کے لیے مزید لکڑی کا ایندھن چاہیے۔ ظاہر ہے جب گوشت پکے گا تو سالن مزیدار ہوگا۔ اب جس بچّے کا پیٹ ایک یا دو پھلکے سے بھر جاتا ہے، وہ مزے لے لے کر چار چار پھلکے کھائے گا۔ میرا تو مہینے بھر کا راشن دنوں میں ختم ہوجائے گا۔ نہ ملکانی جی! یہ سودا بڑا مہنگا ہے۔ ہمیں دال روٹی منظور، گوشت سے معاف رکھیں۔"

مَیں نے اپنے امریکی دوستوں سے کہا: "آپ لوگ [illegible] کا گوشت تو ہمیں دے دیں گے مگر مرچ مسالا کہاں سے آئے گا اور پھر مزید روٹیوں کا بندوبست کہاں سے ہوگا؟" یہ بات سُن کر وہ مبہوت رہ گئے۔

اکثر اوقات برج ٹیبل بین الاقوامی مقابلے کا منظر پیش کرتی۔ ایک طرف کوئی یورپی مبصر ہوتا تو دُوسری طرف کینیڈا کا۔ اُدھر اگر نیوزی لینڈ کا کھلاڑی ہوتا تو اِدھر لاطینی امریکہ کے کسی ملک کا۔

لاطینی امریکہ کے ایک چھوٹے سے ملک نکاراگوا سے آئے ہُوئے ایک میجر صاحب ہمارے مہمان ہُوئے۔ سب کو برج کھیلتے دیکھا تو اُنہوں نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ بھی کھیلنا چاہیں گے۔ ایک روز اُن کے لیے اس کھیل کا بندوبست کیا گیا۔ اتّفاق سے ہمیں اُن کا پارٹنر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اب اُن حضرت کو برِج کا شوق تو بہت تھا لیکن اس کے بعد نام اللہ کا۔ اپنی چال چلنے سے پہلے خاصی دیر تک خیالات میں گُم رہتے۔ کچھ گنگناتے، کچھ مُسکراتے، کچھ جھلّاتے، کچھ کسمساتے اور اس طرح سب کے صبر کا امتحان لینے کے بعد جب چال چلتے تو بالکل غلط اور بے تُکی۔ اس پر طُرّہ یہ کہ اپنا پتّہ میز پر پھینکنے کے بعد سب کی طرف اس فاتحانہ انداز سے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں ہاتھ لا اُستاد، کیوں کیسی رہی۔

جلد ہی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور ہم پھٹ پڑے: "صاحب، آپ کیا کر رہے ہیں! اس طرح کھیل کر ہمیں ڈیمج کروائیں گے؟" ہم کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ بریگیڈ میجر نے صورتِ حال کی نزاکت بھانپتے ہُوئے ہنگامی نوعیّت کا ایک پیغام بھیجا۔ ہمیں بُلا کر ایک جانب لے گئے اور کہنے لگے: "کیا ظلم کرتے ہو! اتنا غصّہ کیوں دکھا رہے ہو؟"

ہم اپنا صبر کا پیمانہ تو پہلے ہی چھلکا چکے تھے، کہا: "سر! یہ برِج ہے، کبڈّی تو نہیں کہ 'کوڈی، کوڈی' کرتے ہوئے میدان میں گھوم گئے۔"

اُنہوں نے حقِ استرداد استعمال کرتے ہُوئے کہا: "بس اب تم میز سے اُٹھ جاؤ۔ مَیں کہلوا دیتا ہُوں کہ تمہیں کمانڈر نے کسی کام سے بُلوا بھیجا ہے۔ کسی اور کو میز پر بھیج دیتا ہُوں۔"

مَیں نے اُن کے اس رویّے پر احتجاج کرنا چاہا تو بولے: "جانتے ہو یہ صاحب کس ملک کے رہنے والے ہیں؟" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا: "نکاراگوا کے۔ کوئی پتہ نہیں کل کلاں وہاں کے صدر بن جائیں اور اُس وقت ان کے دل میں پاکستان کے لیے نرم گوشے کے بجائے تمہاری تلخ گفتگو ہو۔"

رات نے کہا مجھے اندھیرے سے نجات کون
دلائے گا۔
ننّھے سے مٹّی کے دیے نے
جس کی بتّی میں ابھی کچھ تیل باقی تھا
جواب دیا:
مَیں کوشش کروں گا۔
اگر بہت سے ننّھے ننّھے دیے ایک ساتھ جل
اُٹھیں تو اُجالا پھیلے گا، ضرور پھیلے گا۔ (ٹیگور)

مَیں اس دُور اندیشی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، پھر بھی دبے الفاظ میں کہا: "لیکن سر! اس بات کا دُور دُور تک امکان نہیں کہ مجھے اس ملک میں سفارت کا عہدہ تفویض ہو۔"

اس پر وہ یہ کہتے ہُوئے دوسرے کھلاڑی کی تلاش میں چل پڑے: "وہ تمہاری قسمت۔"

مگر قسمت میں کیا کیا لکھا ہوتا ہے، کون جانتا ہے؟ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ہمارا کورس میٹ اور بیرک کا ساتھی ایک دن کسی ملک کا سربراہ بن جائیگا۔

جی ہاں، بنگلہ دیش کے صدر لیفٹیننٹ جنرل حسین محمّد ارشاد نے ہمارے اس تصوّر کو غلط ثابت کر دیا — اور قسمت نے اُنہیں سربراہ مملکت بنادیا۔ کون جانے نکاراگوا کے وہ میجر صاحب بھی کسی اعلیٰ ترین عہدے پر ہوں۔

جنرل ارشاد یُوں تو ہمارے کورس میٹ تھے۔ اُن کے سابق وزیرِ خارجہ شمس الضحیٰ بھی ہمارے کورس میٹ تھے۔ اگرچہ دونوں مختلف کمپنیوں میں تھے۔ مگر شمس الضحیٰ جنہیں سب صرف ضحیٰ کہہ کر پکارتے، مقابلتاً زیادہ فعّال، تیز طرّار اور مہم جُو تھے۔ اُنہوں نے کورس کے دوران میں بھی اپنی صلاحیتوں

کا کما حقہٗ مظاہرہ کیا۔ اُن کے والد اُس وقت مشرقی پاکستان کے آئی جی پولیس تھے۔ بعد میں وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی کابینہ کے وزیر بھی رہے۔ بہرکیف منحیٰ صاحب نے اپنی گوناگوں قابلیتوں کی بنا پر کورس میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور اس طرح اعزازی تلوار کے حقدار قرار پائے۔ اگر وہ فوج میں رہتے تو شاید آج بنگلہ دیش کے صدر ہوتے مگر یہ اُن کے لیے غالباً آہستہ خرامی تھی، اس لیے میجر کے عہدے سے انہوں نے استعفا دیا اور سیاست میں آ گئے۔ ۱۹۷۰ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کے ٹکٹ پر راولپنڈی سے الیکشن بھی لڑا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ارشاد صاحب فوج میں رہے اور اپنے کورس کے ساتھیوں کے مانند لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے ہی تک پہنچ پائے تھے کہ بنگلہ دیش بن گیا اور پھر حالات نے انہیں اپنے نوزائیدہ ملک کا سربراہ بنا دیا۔

ہم اپنی تربیت مکمل کر کے اور کمیشن حاصل کر کے عازمِ کوئٹہ تھے۔ انفنٹری سکول سے مزید تربیت حاصل کرنے جا رہے تھے۔ ہم آٹھ ینگ افسر ریل کے ایک ہی ڈبے میں سوار تھے۔ حسین محمد ارشاد، الطاف حسین، عجب خان، سی ایم اے جان، بیگ، بخاری، راقم الحروف اور ایک صاحب جن کا نام ذہن سے اُتر رہا ہے۔ راستے میں باہم خوب گھل مل گئے۔ ہم جس گاڑی پر سفر کر رہے تھے، اُسے کراچی جانا تھا۔ ہمارے ڈبے روہڑی اسٹیشن پر کاٹ دیے گئے اور بتایا گیا کہ تین چار گھنٹے بعد بولان میل آئے گی تو اُس کے ساتھ منسلک ہو کر ہم آگے روانہ ہوں گے۔ ہم نے مناسب جانا کہ اُتر کر سکھر شہر کی سیر کی جائے۔

نئی وردیوں میں کاندھے پر ایک ایک ستارہ لگائے اپنی رنگا رنگ ٹوپیاں پہنے جب ہم سکھر شہر میں پہنچے تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے کیونکہ اُن لوگوں کی زندگی میں پہلی بار کسی فوجی نے اُن کے شہر میں قدم رکھا تھا۔ لوگ باگ کام چھوڑ کے ہمیں دیکھنے سڑکوں کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ ہم دُنیا و مافیہا سے بے تعلق چپ راست (تازہ تازہ تربیت پا کے نکلے تھے) کرتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں کسی صنفِ نازک کی [illegible] گئی۔ اُس نے آواز دے کر سب گھر والوں کو اکٹھا کر لیا اور وہ اپنی چلمنوں سے لٹک کر اس مختصر سے فوجی دستے کو [illegible] میں مصروف ہو گئیں۔ ہم میں سے کسی کی نظر پڑ گئی۔ اُس کی رگِ [illegible] پھڑک اُٹھی اور اُس نے پریڈ گراؤنڈ کے انداز میں نعرہ لگایا:

PARTY, EYES RIGHT.

(آجکل کی اصطلاح میں پارٹی دائیں دیکھ کہیے)

ہم تازہ تازہ تربیت پا کے نکلے تھے، اس [illegible] میکانکی انداز میں اس کاشن پر عمل کیا اور سب کی آنکھیں [illegible] طرف گھوم گئیں۔ اُس کے بعد جو گیلری میں بھگدڑ مچی، اس [illegible] خاصی دیر تک سب لُطف اندوز ہوتے رہے۔

(جاری ہے)

غزنی میں رہائش رکھنے والے ایک بزرگ حضرت عثمان حرب آبادیؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا: "وہ شلغم، چقندر اور ایسی ہی دیگر سبزیاں پکا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ اُن کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کھوٹا سکہ لے کر اُن کے پاس آتا تو سودا دینے سے انکار نہ کرتے، وہی اپنے پاس رکھ لیتے اور سودا بھی پورا دیتے۔ اس عادت کی وجہ سے لوگ گمان کرنے لگے کہ انہیں کھوٹے کھرے کی تمیز ہی نہیں حالانکہ یہ بات نہ تھی۔

جب اُن کے انتقال کا وقت قریب آیا تو آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا: "میرے مالک تو آگاہ ہے کہ میں لوگوں کے کھوٹے سکے دانستہ قبول کر لیا کرتا تھا۔ تو بھی میرے کھوٹے اعمال اپنی خاص عنایت سے قبول فرما لے۔"

(ملفوظات نظام الدین اولیاؒ ــــــــ بریگیڈیئر ڈاکٹر منظور احمد)

یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں یونیورسٹی سوئمنگ پول خواتین اور لڑکیوں کے لیے ایک نعمت ہے ــــ چاروں طرف سے بند، صاف ستھرا باتھ رُوم اور پیاری سی نرم خوکوچ۔ اُس برس لاہور میں غضب کی گرمی پڑ رہی تھی، لہٰذا جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی سے باہر کی اسٹوڈنٹ بھی اپنا کارڈ بنوا کر تیر سکتی ہیں تو ابا جان سے اجازت لے کر اُس نے اپنی سب ہی بہنوں کے کارڈ بنوا ڈالے ــــ مگر آج وہ چھوٹی بہن کو یہاں لا کر ڈر رہی تھی جو سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے بہت لاڈلی تھی۔ وہ عمر کے اُس حصّے میں تھی جہاں خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

سوئمنگ پُول میں آج سالانہ مقابلہ تھا۔ اُس نے دیکھا ایک دھان پان سی تیرہ چودہ سال کی لڑکی نے جمپ کرنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ لڑکی بارہ فٹ اُوپر اسٹیج پر جا کھڑی ہوئی، جسم کو ہوا میں تولا، بازو سیدھے کر کے آگے کی طرف جھکی۔۔ بس وہ اتنا ہی دیکھ سکی۔ اس کے بعد مارے خوف کے اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر زور سے شڑاپ کی آواز آئی۔ نہ جانے کیسا کیسا شور ہوا۔ اُسے لگا صدیاں بیت گئیں آنکھیں بند کیے ــــ لیکن پھر سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ اُس نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں کھول کر دیکھا تو دوسرے کنارے پر وہ نازک سی لڑکی زندہ سلامت پانی سے برآمد ہو گئی تھی بلکہ جُھک جُھک کر سلام پیش کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ دیکھ کر لوگ رشک کر رہے تھے کہ اتنا اچھا جمپ لگاتی ہے اور اتنا تیز تیرتی ہے۔

اورنج کیپ اور بلیو کوسٹیوم میں وہ سچ مچ رنگین مچھلی لگ رہی تھی۔ میری دوست کھینچ کھینچ کر مجھے مبارکباد دے رہی تھیں کہ تمہاری بہن فرسٹ آئی ہے اور اُس نے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے لیکن مجھے ریکارڈ ٹوٹنے سے زیادہ اُس کے پانی سے واپس نکل آنے کی خوشی تھی۔" پندرہ فٹ کی بلندی

شوہر گزیدہ

ہمارے معاشرے کی ایک المناک سچی کہانی۔

بازغہ رؤف

سے پانی میں سر کے بل چھلانگ لگانا تو نِری حماقت ہے۔" میں نے سوچا۔ تب وہ میرے قریب آگئی اور اُس نے میرے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

"چلو ہٹو۔" میں نے مصنوعی غصّے سے کہا۔ "میرا دل بہت ڈرتا ہے جب تم پانی میں جمپ کرتی ہو۔"

"سچ باجی! کل آپ بھی میرے ساتھ جمپ کریں تو سارا ڈر جاتا رہے گا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

یہ میری سب سے چھوٹی بہن تھی اور مقابلہ کرنے والوں میں سب سے کم عمر۔ اُسے گولڈ میڈل ملا، اور پھر تو ہر سال ہی میڈل اُسی کا حق بن گئے اور وہ گہرے پانیوں کی مچھلی کے مانند بل کھاتی تیرتی رہی۔

اُس کی عادات نہایت نفیس تھیں۔ کسی کا غم دیکھ کر تڑپ اُٹھتی اور آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی لگا دیتیں۔ اور ایسے ہی اسکول کا زمانہ بیت گیا۔ کالج میں پہنچی تو سوئمنگ کی شہرت نے اُسے کالج میں جانا پہچانا کر دیا۔ لیکچررز کی نورِ نظر، دوستوں کی خیر خواہ، ماں باپ کی آنکھ کا تارا اور بھائی، بھابیوں اور بہنوں کی لاڈلی۔ اسی لاڈ سے زندگی گزر رہی تھی۔ غم کی پرچھائیں اُسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔

والدین کا ادب ملحوظ رکھتی۔ امّی کے ساتھ پوری نمازیں اور قرآن پڑھتی۔ کسی طرف سے بھی اُس کی شخصیت میں جھول نظر نہیں آتا تھا۔

جب لائسنس کے بغیر سڑک پر گاڑی بھگاتی واپس لاتی، والد غصّے سے آنکھیں دکھاتے۔ وہ خاموشی سے کمروں میں گم ہو جاتی۔ پھر بھائی جان اُس کو سیر کے بہانے باہر لے جاتے تو وہ گاڑی چلانے کا شوق پورا کر لیتی۔ ابا جان کہتے تمہاری عمر پوری ہو جائے تو لائسنس بنوا دوں گا لیکن وہ شوق سے باز کیسے آئے؟

اسی طرح ہنستے کھیلتے بہاریں آتی اور جاتی رہیں۔ پھر بہاروں کے موسم ہی میں امّی نے اُسے بتایا کہ تمہاری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ "کیا؟" وہ اُچھل پڑی۔ "سچ مچ امّی؟ کیا میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں؟ آپ تو مجھے ہر وقت کہتی رہتی تھیں کہ تمہیں کیا معلوم، تم چھوٹی ہو اور آج کہہ رہی ہیں بڑی ہو گئی ہو۔"

شادی کی بات باجی کے دیور سے ہوئی تھی۔ خود باجی اپنے بچّوں کے ساتھ انگلستان میں تھیں۔ اُن کا فون آیا تو انہوں نے خوب چھیڑا: "کیوں ری بنّو! مجھے تو کہتی تھی باجی، آپ کے سسرال والے 'پینڈو' ہیں اور خاص طور میرے دیور کے بارے میں کہتی تھی —— باجی پلیز! اپنے دیور کو سمجھایا کریں سینڈل یا پشاوری جوتوں میں موزے نہ پہنا کرے۔ اب کیا کرو گی؟"

"باجی! میں سسرال جا کر اُسے سینڈل میں موزے پہننے سے روک دوں گی۔" اُس نے خوشی سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔

اور پھر نہ جانے کیسے اُسے کسی کی نظر لگ گئی۔ اُس کا گلا خراب ہو گیا۔ معمولی مرض سمجھ کر ڈاکٹر سے دوا لی مگر چند روز بعد بخار میں وہ کھڑے کھڑے گر پڑی۔ ابا جان اُسے لاہور کے ایک اعلیٰ پرائیویٹ کلینک میں لے گئے۔ وہ مسکراتی رہی۔ "بھلا مجھے کیا ہوا ہے! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بیٹے! میں پورا چیک اپ کرواؤں گا۔ کیا بات ہے میرا اُسپرین کیسے گر پڑا؟" ابا جان ہمیشہ لاڈ میں اُسے پرین ہی کہا کرتے۔

ابا جان کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ انھوں نے ڈاکٹروں سے کہہ کر اُسے کلینک میں داخل کرا دیا۔ دوپہر کو بھابی جان آئیں تو آتے ہی کان مروڑنے لگیں۔ "کیوں ری بنّو؟ خود یہاں عیش کر رہی ہو اور ہمیں گوٹے کناری پر لگا دیا!"

"کیا کروں، بھابی!" ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ابا جان سے میری جان چھڑائیں نا۔ خواہ مخواہ مجھے کلینک میں قید کر دیا ہے۔ بھتیجے بھتیجیوں کے بغیر میرا دل اُداس ہو گیا ہے۔" اور پھر وہ اڑ سی گئی۔ "ابا جان! میں نے ایک رات رہ لیا، اب مزید نہیں رہوں گی۔ مجھ سے لیٹا نہیں جاتا۔ ڈاکٹر تو خواہ مخواہ ٹیسٹ لیتے جا رہے ہیں۔" ابا جان کہاں سُننے والے تھے، چنانچہ اُسے مزید ایک رات وہاں رُکنا پڑا۔ اور پھر وہ کلینک سے یوں بھاگی جیسے برسوں وہاں رہی ہو۔

شام کو اُس کی رپورٹ آگئی۔ "لیجیے امّی جان! ہماری قید کی رپورٹ آگئی۔ اچھی طرح دیکھ لیں بلکہ فریم کروا لیں یہاں سے کہیں کہ خوب مائیکروسکوپ کے نیچے رکھ کر کہ مجھے کوئی بیماری نہیں بلکہ دو روز کی بلاوجہ قیدِ تنہائی کا میری صحت پر بُرا اثر پڑا ہے۔"

پھر نومبر ۱۹۸۵ء میں وہ دُلہن بن گئی۔ بہن نے میڈل لا کر —— "لو یہ بھی کندھے پر سجا لو شاید دُولہا بھائی امپریس ہوں۔" اُس نے حیا آمیز نظریں اُٹھائیں اور گرا دیں۔ "بنگا ہوں ... صاف صاف کہہ ڈالا —— امپریس کرنے کے لیے اُسے گولڈ میڈل کی ضرورت نہیں۔

لاہور کی روشنیاں چھوڑ کر وہ چھوٹے سے قصبے میں جا پہنچی۔ ... میں گاڑی کی اُچھل کود سے اُس کی پسلیاں تک ہل گئیں۔ ملاقات کا وقت بھی آن پہنچا۔ پہلی ہی ملاقات میں اُسے بتا دیا گیا کہ وہ اُن کی دوست ضرور ہے، بیوی نہیں اور اُنہوں نے ماں باپ کے دباؤ میں آ کر شادی کی ہے۔ اُن کا دل کہیں اور اٹکا تھا۔ ماں باپ نے تو سُنی نہیں اور پہلی رات کی دُلہن کو اپنا کر اپنی محبت امر کرنے چلے۔

اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اُس نے خاموشی سے یہ جانکاہ بات اپنے سینے میں اُتار لیا مگر کسی کو کچھ نہ بتایا۔ تیسرے روز وہ سیڑھیوں سے پھسل پڑی۔ ڈاکٹر بُلوایا گیا۔ اُس نے دوا اور آرام تجویز کیا۔ چند روز بعد سسرال سے میکے پہنچی تو بُجھی بُجھی تھی۔ سب نے سبب پوچھا تو بات بنا گئی کہ میری کمر میں چوٹ اور سخت درد ہے۔ یہاں بھی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ لکڑی کے تخت پر سُلائیں، ریڑھ کی ہڈی کا مُہرہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ کچھ روز آرام کیا، پھر سسرال گئی۔ وہاں جا کر پھر طبیعت خراب ہو گئی۔ فون آیا کہ آ کر لے جائیں۔ بھائی جا کر لے آیا۔ بھابی نے ایسے ہی چھیڑا: "کیا بات ہے؟ جاتے ہی بیمار بن گئیں۔ کہیں دکھا رہی ہو گیا؟" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے! کیا بات ہے؟" بھابی نے پیار سے پوچھا۔ امّی قریب آگئیں۔ "کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" اُس نے بات ٹالنا چاہی۔ "بات کیا ہے؟" امّی سختی پر اُتر آئیں۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی: "امّی! کمر میں سخت درد ہے۔ وہاں میں فرش پر ٹاٹ پھیر رہی تھی تو ایسے لگا کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔"

"کیا تو فرش پر ٹاٹ پھیرتی ہے، دس روز کی دُلہن؟ تو نے کہا نہیں کہ میری کمر میں درد ہے۔" بولی: "بُرا لگتا ہے۔ کہیں گے جان بوجھ کر کرتی ہے۔" اس پر امّی خاموش ہو گئیں اور بھابی نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

جنوری کی یخ بستہ ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ فروری میں وہ ایک بار پھر سسرال بھیجی گئی لیکن تین ہی روز بعد فون آگیا کہ طبیعت بہت خراب ہے۔ اب کے اُسے اچھرہ کے ہڈی اسپتال لے گئے۔ اسپتال والوں نے اُسے داخل کر لیا۔ وہ سارا سارا دن پڑی چھت کو گھورا کرتی۔ تین ہفتے گزر گئے مگر شوہر اور سسرال والوں نے خبر تک نہ لی۔

ڈاکٹروں نے بتایا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر گوشت میں کُھب گئی ہے لیکن خون باہر نہیں نکلا۔ اب آپریشن کر کے خون نکالا جائے گا۔ آپریشن ہوا اور جب اُسے ہوش آیا تو سب لوگ اُس کے گرد کھڑے تھے۔ اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ساتھ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے۔ اُس نے بہن سے سرگوشی میں خاوند کے متعلق دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ آج پہلی بار وہ آپریشن کی اطلاع ملنے پر آیا تھا۔ ابا جان نے غصّے میں کہا: "اتنے دن سے وہ بیمار ہے تم آج آئے ہو؟" کہنے لگا: "ایک دوست کی شادی کے سلسلے میں آیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

آپریشن کے بعد اُس کا دل جو پہلے ہی کمزوری سے دھڑک رہا تھا، اور کمزور ہو گیا۔ مارچ اور اپریل اُس نے بیڈ ہی پر گزار دیے۔ مئی شروع ہو گیا۔ دو ہفتے بعد اُس کا خاوند پھر آیا۔ وہ افسانوں میں پڑھتی تھی کہ ایک کو تکلیف ہوئی تو دوسرے نے درد محسوس کیا لیکن یہاں تو چہرے پر ملال کے بجائے کچھ اور ہی ارادے تھے۔ چند لمحے ٹھہر کر اُس نے کہا کہ تمہارے والد نے اُس روز میری توہین کی تھی، لہٰذا میں اُن کی عزت نہیں کر سکتا۔ وہ خاموش رہی اور شوہر واپس چلا گیا۔

ان تین مہینوں میں دو مرتبہ ساس اور ایک بار نند اُس کی خبر کو آئیں گویا کوئی سروکار ہی نہ ہو — گھر پر اس سے زیادہ اہم کاموں کی یاد انہیں اُس کے پاس رُکنے ہی نہ دیتی اور وہ شہرِ حیران میں اکیلی سرگرداں تھی۔

آپریشن کے ٹانکے کُھلے اور وہ نوید کے انتظار میں تھی شاید حالات کچھ ٹھیک ہو جائیں کہ یہ خبر بجلی بن کر اُس کے حواس پر گری کہ اب وہ کبھی نہ چل سکے گی۔ اُس کی ٹانگیں ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گئی تھیں۔

مئی کے آخر میں اسپتال والوں نے کہا کہ آپ جنرل ہسپتال سے سکیننگ کروالیں۔ اب تکلیف بہت شدّت اختیار کر چکی تھی۔ اُس کی چیخیں بس ابا جان کی رُوح افزا باتوں ہی سے دبتیں۔ کوئی انجکشن اُسے بے سُدھ کرنے میں کامیاب نہ تھا۔ جنرل ہسپتال والوں نے سکیننگ کی رپورٹ دی کہ ریڑھ کی چوٹ سے گُردوں پر کینسر کا اثر ہو گیا ہے۔ اُسے میو ہسپتال کے کینسر وارڈ میں لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ شاید یہ زندگی کے چار پانچ سال اور پُورے کر لے۔

ابھی تک اُسے زندگی سے مایُوسی نہیں ہُوئی تھی لیکن اُس کا دل سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ابا اور امّی نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی بیماری طویل ہو گئی ہے؛ تاہم وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ بیماری کے خوف نے اُس کا دِل جکڑ لیا تھا۔ اُس کی ملیح رنگت زرد ہوتی جا رہی تھی۔ خزاں اپنی بھرپُور جولانیوں کے ساتھ اُس پر مسلّط ہو چکی تھی اور وہ بہار کے اُجڑے پھُول کی طرح تنہا شاخ پر لرز رہی تھی۔ اُس کا دل اُس زرد خشک پتّے کی طرح تھا جسے نہ جانے کس پل ٹہنی سے جُدا ہو جانا تھا۔

میو ہسپتال میں نسبتاً زیادہ سکون تھا۔ چند روز بعد اُس کے کمرے میں ایک اور لڑکی داخل ہُوئی۔ کوثر کو بھی کینسر تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ معلوم نہیں سال دو سال تک زندہ رہ جائے لیکن کوثر اپنے خاوند کے دامن سے لپٹی رو رو کر کہہ رہی تھی کہ وہ چند روز سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔

اور وہ تو اس دامن سے بھی محروم تھی — محرومی اب اُس کا مقدر بن چکی تھی۔ ۱۸۔۱۷ سال کی بساطِ زندگی پر بکھری ہوئی یادیں ناگن کی طرح پھن پھیلائے اُسے ڈس رہی تھیں اور وہ اس قدر بے بس کہ قدم اُٹھتے ہی نہ تھے۔

کوثر نے خاوند سے فرمائش کی کہ وہ رات کو کھلا آسمان اور چاند دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اُسے وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لے گیا — اُس نے احساسِ محرومی کے تحت سوچا اُسے چاند کو گواہ بنا کر کس کو یقین دلانا ہے کہ وہ آخری سانسوں تک صِرف اُسی کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔

کوثر کا خاوند کویت سے چھُٹی پر آیا تھا۔ چھٹی گزارنے کے بعد وہ اُسے روتی چھوڑ کر روانہ ہو گیا — اور اگلے ہی روز کوثر کی رُوح کُھلی آنکھوں کے ساتھ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کوثر کا فسانہ اُس سے سہانہ کہا۔ کوثر کی ماں کے بین اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے جسے فوراً ہی نرس نے باہر نکال دیا تھا۔

اُس نے اپنی امّی کے شفیق چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا: کیا میرے پیچھے یہ اپنی تمام زندگی بَین کرتی رہیں گی؟ اُس نے ابا جان کے کمزور اور مایُوس چہرے کی طرف دیکھا، اب عزم اور اُمّید کی پرچھائیاں ختم ہو چکی تھیں اور وہ نظروں سے بیٹی کو ہاتھوں سے نکلتے دیکھ رہے تھے مگر بے بس تھے۔

پھر روزے شروع ہو گئے۔ "امّی! میں روزے رکھوں گی؟" اُس نے بے بسی کے ساتھ پُوچھا۔ اُس نے کبھی تک روزے نہ چھوڑے تھے۔

"بعد میں پُورے ہو جائیں گے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟"

"امّی! میں عید کیسے کروں گی؟"

"ہم تمہارے پاس آجائیں گے۔"

"نہیں! میں گھر چلوں گی۔ آپ ڈاکٹر سے پُوچھ لیں گا"

"اچھا۔" امّی نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا لیکن اُس کی زندگی سترہ روزوں سے زیادہ کا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور اٹھارویں روزے، سحری کے وقت وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

انجینئر احمد نواز چیمہ

ایک سنگین معاشرتی مسئلہ جسے ہماری حکومت اور بلدیاتی ادارے نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔

پاکیزگی ماحول کی

اس کرۂ ارضی پر انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ خالق نے ایسے ماحول کا بندوبست کر دیا تھا جو اُس کی مناسب نشوونما کا ضامن تھا۔ ہوا میں آکسیجن، نائٹروجن اور دوسرے گیسوں کے مابین اس طرح توازن قائم کیا گیا کہ انسانی خون کی گردش اور ہوا میں سانس لینے سے از خود صفائی ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح پانی کو، جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے، زمین کی زرخیزی کا باعث بنایا۔ پھر جوں جوں آبادی بڑھتی گئی، قدرتی ماحول میں انسان کی غفلتوں کے باعث کثافت پیدا ہوتی گئی اور بالآخر طرح طرح کی بیماریوں اور وباؤں کا باعث بن گیا جس سے شرحِ اموات میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ ترقی یافتہ اقوام نے ماحول کو آلودگیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تحقیق کے ذریعے مناسب راستے دریافت کیے ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسلام نے ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ایک دینی فریضہ قرار دیا تھا مگر مسلمانوں کی تمام دُنیوی اُمور میں تنزلی ماحول کی صفائی پر بھی اثر انداز ہُوئی۔ اب جبکہ نئی ایجادات نے ماحول کو صاف رکھنے اور شرحِ اموات کم کرنے میں خاصی مدد دی ہے، ترقی پذیر ممالک اپنی پسماندگی کے سبب اس طرف مناسب توجہ نہیں دے سکے ہیں۔ ان ممالک میں شرحِ اموات بہت زیادہ ہے اور طرح طرح کی وبائیں پھُوٹنے سے صحتِ عامّہ کا معیار نہایت گرا ہُوا ہے۔

پاکستان میں اچھی صحت کے لیے ماحول پیدا کرنے اور اُسے برقرار رکھنے کی ذمّے داری مختلف سرکاری محکموں پر عائد ہوتی ہے جن کی کارکردگی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ عوام کو ماحول سے کتنا متعارف کراتے اور اُن سے کتنا تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اب ہم اُن چند بنیادی حقیقتوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں جن کے فہم اور ادراک سے صحتِ عامہ کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور عوام بہت سی بیماریوں کے عذاب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

ماحولیاتی عناصر

مندرجہ ذیل عناصر ماحول کو برقرار رکھنے کے ضامن قرار دیے جا سکتے ہیں:

۱۔ پانی :۔ ہوا کے بعد پانی ہی کرۂ ارضی پر زندگی کی بنیادی ضرورت کا مقام رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے بے روگ ہونے کا انحصار بڑی حد تک اسی پر ہے۔ پانی ہی آدمی کی جسمانی طہارت کے کام آتا ہے۔ اسی سے انسانی فضلہ گنجان شہری آبادیوں سے نکالا جاتا ہے۔

اسلام جو ایک دینِ فطرت ہے، اُس نے پانی سے طہارت کے اصول وضع کیے۔ قرآنِ حکیم نے سورۃ مومن میں پانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم نے آسمان سے اندازے کے مطابق پانی برسایا اور پھر اس کا ایک حصّہ زمین میں جذب کیا جبکہ (دوسرے حصّے) کو ہم بہا لے جانے پر پُوری قدرت رکھتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے قدرتی نکاسیٔ آب کا ذکر اسی آیت میں فرمایا ہے جسے انسانی ہاتھوں نے درہم برہم کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں شہری آبادیوں کے توسیعی منصوبوں میں قدرتی نکاسی کے تقاضے نظر انداز کر دیے جاتے ہیں —— یا پھر جگہ جگہ تجاوزات سے قدرتی آبی گزرگاہیں محدود کر دی جاتی ہیں جس کے باعث پانی کے جوہڑ بن جاتے ہیں جو مچھروں کی افزائش کے مواقع بھی فراہم کرتے ہیں۔

۲۔ گندا پانی (سیوریج کا نظام):۔ زیرِ زمین یا سطحِ زمین سے حاصل شدہ پانی مناسب تطہیر کے بعد لوگوں کو فراہم ہوتا ہے۔ اس کا اسّی فیصد حصہ استعمال کے بعد نظامِ سیوریج میں ڈال کر بڑے بڑے زیرِ زمین پائپوں (سیور) کے ذریعے آبادی سے باہر لے جا کر قدرتی ماحول میں پھینک دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے اکثر و بیشتر شہروں میں سیوریج کا پانی مناسب تطہیر کے بغیر قدرتی ماحول میں چھوڑنے سے اس کی صفائی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لوگ اپنی کم فہمی یا لاعلمی کی بنا پر سیور کے نظام میں کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں جس کے باعث پائپ بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بارش کے پانی کی نکاسی کے مناسب انتظامات نہ ہونے کے باعث شہروں کی گنجان آبادیوں میں ماحول صحت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

کراچی اور لاہور کی سڑکوں پر بارش کے بعد پانی کا اتنی مقدار میں کھڑا ہو جانا جس سے زندگی کے سارے معمولات "مطلقاً" بند ہو جائیں، اس چیز کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے ہاں قدرتی نکاسیٔ آب کے راستے کس حد تک مسدود ہیں یا پھر مناسب سہولتیں مہیا ہی نہیں کی گئیں۔

۳۔ پانی کا ضیاع:۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور دوسرے تمام بڑے بڑے شہروں میں تیس سے پچاس فیصد تک پانی ضائع ہو جاتا ہے جو کچی اور سطحی نالیوں میں بہتا رہتا ہے اور تعفن کا باعث بنتا ہے اور یوں ماحول کو خراب کرتا رہتا ہے؛ چنانچہ بیماریوں اور شرحِ اموات میں اضافہ ہوتا ہے اور اسپتالوں کی تعمیر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ ان جملہ مسائل کی وجہ نکاسیٔ آب کی خرابی ہے۔ ہم قومی خودکشی یا نسل کشی جیسے گناہِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قدرتی ماحول کو خراب کرنا دراصل ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

انتظامی مسائل

ماضی میں اور اب بھی کئی جگہوں پر پانی کی فراہمی اور [illegible] کی صفائی ستھرائی کی ذمے داری مالی اور فنی اعتبار سے کمزور بلدیاتی اداروں پر ڈالی جاتی رہی اور معاشرے میں ماحول کے [illegible] تعلیم کا مکمل فقدان رہا ہے —— اس دوران میں معرضِ وجود میں آنے والے شہری ترقیاتی ادارے اور اُن کے پانی اور صفائی کے ذیلی شعبے حالات پر قابو پانے کی کوشش میں محدود مالی وسائل کی وجہ سے کوئی زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اچھی صحت [illegible] شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی خصوصاً کچی آبادیوں میں رہنے والوں کے لیے دن رات بگڑتا جا رہا ہے۔ اگر حالات پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو [illegible] کا مسئلہ سیم اور تھور سے بھی کہیں سنگین صورت اختیار کر جائے [illegible] نے ملک کی زرعی معیشت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

اصلاحی اقدامات

مندرجہ ذیل نو نکاتی پروگرام پر مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ عمل شروع کیا جائے تو بیماریوں کی روک تھام اور اسپتالوں پر اُٹھنے والے اخراجات میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور اس طرح اس مقولے پر عمل ہو سکتا ہے کہ "پرہیز علاج سے بہتر ہے"۔

۱۔ پینے کا صاف پانی مناسب مقدار میں زیادہ سے زیادہ [illegible] کے گھروں تک پہنچایا جائے۔ پانی کو پائپوں کے اندر [illegible] سے پاک صاف رکھنے کے لیے کلورین وغیرہ کا استعمال بے حد ضروری ہے۔

۲۔ شہری سیوریج یعنی گندے پانی کے نکاس کا نظام جدید [illegible] پر تعمیر کیا جائے اور اُس کی پیہم دیکھ بھال ہوتی رہے اور ساتھ ہی ساتھ پرانے نظام کی مناسب انداز سے اصلاح کا اہتمام کیا جائے۔

۳۔ شہری منصوبہ بندی میں قدرتی نکاسیٔ آبِ باراں ملحوظِ خاطر رہے۔ پلاٹوں اور سڑکوں کے نقشے اس بنیادی ضرورت کے پیشِ نظر منظور کیے جائیں۔ شہر کے تمام قدرتی نالوں سے تجاوزات ختم کر کے پانی کے بہاؤ کے لیے مناسب گزرگاہوں کا بندوبست کیا جائے۔

۴۔ تمام شہروں کے پانی کے متعلقہ مراکز میں پانی کے ضیاع کا تخمینہ لگا کر اس میں خاطر خواہ کمی کا سائنٹیفک طریقہ اختیار کیا جائے۔

۵۔ ہر شہر میں صفائی کے محکمے اس بات کو یقینی بنائیں کہ کوئی شخص گندا پانی کھلی نالیوں میں پھینک نہ سکے اور بارش کا پانی نالیوں سے آسانی سے گزر جائے تاکہ گنجان آباد علاقوں میں گندے پانی کے جوہڑ نہ بن جائیں۔

۶۔ شہروں میں صفائی کے مراکز کوڑا کرکٹ اٹھانے کے موزوں انتظامات کریں۔ خوراک اور دوسری اشیا بند ڈبوں میں آتی ہیں، اُن خالی ڈبوں کو صحیح طور پر ٹھکانے لگایا جائے۔

۷۔ گندے پانی کی تطہیر کے آلات ملک ہی میں تیار کیے جائیں۔ اس وقت یا تو بیرونی دنیا سے نہایت ہی پیچیدہ قسم کے آلات درآمد کیے جاتے ہیں جو بالعموم تھوڑے عرصے میں ناکارہ ہو جاتے ہیں یا پھر گندہ پانی جوں کا توں آبپاشی کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ یہ عمل ماحول اور صحت کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔

۸۔ پاکستان میں پانی کی فراہمی اور ماحول کی صفائی کے عوامل دوسرے ممالک سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان پر تحقیق ہونی چاہیے۔ شرقِ اوسط کے ممالک میں درآمد شدہ نظام ناکام ہو چکا ہے۔ ماحول کو صاف رکھنے کے لیے بھاری اخراجات کے باوجود ان ممالک میں خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ منصوبہ بندی میں بدیسی عناصر اور تجربات شامل تھے اور مقامی حالات کا مناسب جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔

۹۔ ماحول کو صاف رکھنے کے لیے ایک ایجنسی کے قیام کا اعلان کرنا چاہیے جو اس بات کا جائزہ لیتی رہے کہ ملک میں ترقیاتی اور صنعتی منصوبوں کا ماحول پر کیا اثر پڑتا ہے۔

حکومت کی ترجیحات میں یہ امر شامل ہونا چاہیے کہ کس طرح ماحول کو صاف رکھتے ہوئے صحتِ عامّہ کا ایک اچھا معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔ مالی وسائل کی تقسیم میں مناسبت قائم رکھنے کے لیے 'پرہیز اور علاج' دونوں ہی باتوں کو اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

نمبر ۱۹ (۳۳) / ۸۴ - اے اینڈ ای
حکومتِ پاکستان وزارت کلچر اور ٹورزم
(ٹورزم ڈویژن)
۱۳ - ٹی / یو کمرشل ایریا ایف ۷ / ۲
اسلام آباد ۸۶ / ۱۱ / ۴

ضرورت ھے

ہر ایک اسامی کے مقابل درج مطلوبہ خصوصیات کے حامل موزوں اُمّیدواروں سے درج ذیل خالی اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔
۱۔ سٹینوگرافر (ایک) (بی پی ایس - ۱۵)
تعلیمی قابلیت: انٹرمیڈیٹ ۱۰۰/۵۰ الفاظ فی منٹ رفتار بالترتیب شارٹ ہینڈ اور ٹائپ میں۔

(باقی اگلے صفحے پر)

ڈومی سائل : سندھ رورل - ۱
عمر کی حد : زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال، قابلِ رعایت بصورت سرکاری ملازمین۔

۲- سٹینو ٹائپسٹ (ایک) - (بی پی ایس - ۱۲)

تعلیمی قابلیت: میٹرک ۸۰/۴۰ الفاظ فی منٹ سپیڈ بالترتیب شارٹ ہینڈ اور ٹائپ میں ہو۔
ڈومی سائل : سندھ رورل - ۱
عمر کی حد : زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال، قابلِ رعایت بصورت سرکاری ملازمین۔

۳- شماریات اسسٹنٹ (ایک) - (بی پی ایس ۱۱)

تعلیمی قابلیت: گریجویٹ شماریات / اکنامکس / ریاضی / کامرس اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے ساتھ۔
ڈومی سائل : بلوچستان - ۱
عمر کی حد : زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال، قابلِ رعایت بصورت سرکاری ملازمین۔

۴- لوئر ڈویژن کلرک (دو) - (بی پی ایس - ۵)

تعلیمی قابلیت: میٹرک ۳۰ الفاظ فی منٹ سپیڈ ٹائپ کے ساتھ۔
ڈومی سائل : فاٹا : ۱، سندھ (اربن) : (کل ۲)
عمر کی حد زیادہ سے زیادہ ۲۵ سال، قابل رعایت بصورت سرکاری ملازمین۔

۲- مندرجہ بالا شرائط کے حامل موزوں اُمیدواروں سے درخواستیں زیرِ دستخطی کو مصدقہ نقول ڈومی سائل سرٹیفکیٹ اور اسناد وغیرہ کے ساتھ ۲۰/۱۱/۸۶ تک پہنچ جائیں۔

۳- ٹیسٹ / انٹرویو برائے اسامیوں سٹینوگرافر، سٹینو ٹائپسٹ اور لوئر ڈویژن کلرک سندھ، کوئٹہ، کراچی میں ہوگا۔ ٹیسٹ / انٹرویو برائے اسامی شماریات اسسٹنٹ بلوچستان کوئٹہ۔ کوئٹہ میں ہوگا۔

۴- ملازم پیشہ حضرات اپنے اپنے ایمپلائرز کی وساطت سے درخواستیں روانہ کریں۔ ٹیسٹ / انٹرویو کے لیے یا بصورت سلیکشن پہلی بار ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے کوئی ٹی اے / ڈی اے نہیں ملے گا۔

(محمد اشرف زاہد)
سیکشن آفسر

پی آئی ڈی (آئی) ۲۲۵۶

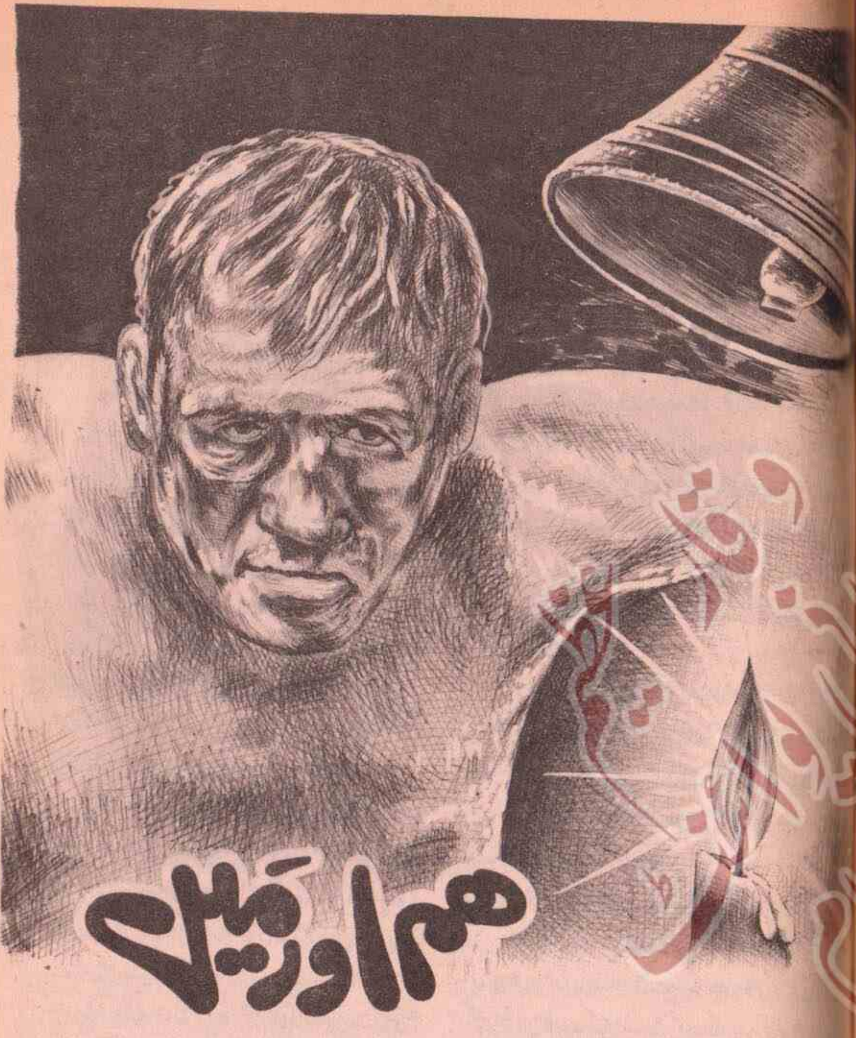

دُنیا کا اپنی طرز کا ایک فکر انگیز
نظریاتی ناول

آئن رینڈ (AYN RAND) کی اس کتاب کو اپنے موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے جدید ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ ناولٹ اس نظامِ جبر کے خلاف مؤثر ترین احتجاج ہے جس میں انسان کو حیوان بنا کر اُس سے تمام بُنیادی حقوق، فطری صلاحیتیں اور آرزوئیں چھین لی جاتی ہیں، انسان اس نظامِ جبر کے خلاف جدوجہد کرنے پر مجبور رہے۔ اس نظامِ جبر کے خلاف دُنیا میں بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو آئن رینڈ کے ناولٹ 'دی اینتھم' جیسی عظیم ہوں۔ س۔ ا۔

گہری تاریکی ہے۔ موم بتّی کا کمزور شعلہ روشنی پھیلا رہا ہے۔ چاروں طرف سنّاٹا ہے۔

اس تاریک سُرنگ میں صرف ایک آواز سُنائی دیتی ہے۔ کاغذ پر قلم کے لکھنے کی صدا۔ ہم اس سُرنگ میں زمین کے نیچے اکیلے ہیں۔ یہ لفظ اکیلا خوفزدہ کر دینے والا لفظ ہے۔ قانون یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مقام اور کسی لمحے اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اسے سب سے خوفناک قانون شکنی قرار دیا گیا ہے۔ اسے تمام بُرائیوں کی جڑ سمجھا جاتا ہے لیکن ہم بہت سے قانون توڑ چکے ہیں۔ اب ہمارے لیے اپنے جسم و جاں کو بچانا ممکن ہی نہیں رہا۔ ہم غیر محفوظ ہیں۔ سُرنگ میں اپنی ہی دو پھیلی ہوئی ٹانگوں اور دیوار پر اپنے ہی سر کا سایہ دیکھنا کتنا عجیب لگتا ہے۔

ہم جس موم بتّی کی مدّھم روشنی میں اکیلے بیٹھنے اور سوچنے کا کام کر رہے ہیں، اسے ہم نے خاکروبوں کی کونسل کے دفتر سے چُرایا تھا۔ اگر کسی کو ہماری اس چوری کا علم ہو جائے تو ہمیں دس برس کی سزا سُنا کر اصلاحی جیل میں نظر بند کیا جا سکتا ہے لیکن اب ایسے اندیشوں اور خطروں کے بارے میں سوچ بچار پر کون وقت ضائع کرے؟ موم بتّی کی روشنی بہت قیمتی ہے اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں لکھنا ہے اور وہ جُرم کرنا ہے جس کی سزا تصوّر سے باہر ہے۔ لکھنا، اکیلے سوچنا یہی ہمارا جُرم اور راز ہے۔ ہمیں بولنا ہے۔ خواہ سُننے والے ہمارے اپنے ہی کان کیوں نہ ہوں۔

ہمارا نام 'مساوی ۲۵۲۱ ـ ۷' ہے۔ یہ نام اس آہنی چوڑی پر کندہ ہے جسے ہماری طرح سب مرد اپنی دائیں کلائی میں پہ... ہیں۔ ہماری عمر اکیّس برس ہے۔ ہمارا قد چھ فٹ لمبا... یہ قد ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ یہاں ایسے... ہیں جن کا قد چھ فٹ ہو۔ ہمارے اساتذہ اور ر... اشارہ کرتے ہُوئے کہتے ہیں: "تمہاری ہڈّیوں میں ش... ہے۔"

ہم یہ طنز اور تحقیر برداشت کر لیتے ہیں کہ ہم اپنا... بدل نہیں سکتے۔

ہم کسی بد دُعا کے سایے میں پیدا ہُوئے تھے... اثرات نے ہمیں وہ کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے جسے سو... ہے۔ اس نے ہمارے دل میں ایسی آرزوئیں جنم دی... جن کی تمنّا دوسروں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہم جا... ہیں کہ ہم شر ہیں لیکن ہمارے اندر ایسا ارادہ اور ایسی قو... نہیں جو مزاحمت کر سکے۔ یہی ہمارا خُفیہ راز ہے۔

ہم نے اپنے مرد بھائیوں جیسے بن جانے کی بڑی کوشش... کی۔ یہاں ہر آدمی ایک دوسرے جیسا ہے۔ عالمی کونسل کی اس عظیم الشان عمارت کی محراب کے اُوپر سنگِ مرمر کی لوح پر... الفاظ کندہ ہیں:

"ہم سب ایک ہیں اور ایک ہم ہے۔
یہاں کوئی آدمی نہیں۔ سب ہم ہیں۔
ہم ــــ جو ایک ہے، ناقابلِ تقسیم ہے اور لازوال ہے"

ہم یہ جملے اکثر وِرد کرتے رہتے ہیں لیکن ہم پر ان کا کوئی اثر نہیں...

ہوتا۔

عالمی کونسل کی محراب پر کندہ یہ لفظ بہت قدیم ہیں۔ یہ مقولہ یہاں کی سب سے بڑی سچّائی ہے اور عالمی کونسل اس عظیم ترین سچّائی کی علمبردار۔ اس بات کا سُراغ تو لگایا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ کب کندہ کیے گئے تھے لیکن اس کوشش میں ہم دھر لیے گئے تو ہمیں تین برس کے لیے اصلاحی زنداں میں نظر بند کر دیا جائے گا۔ ناکارہ لوگوں کے گھر میں بُوڑھے اکثر اس مقولے کے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں لیکن ان بُوڑھوں کی سرگوشیوں کا کیا ذکر کیجیے۔ وہ تو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ یہاں سب آدمی اچھے اور عقلمند ہیں۔ بس اک ہم ہیں 'مساوی ۲۵۲۱ ـ ۷' جو لعنت کے لمحے میں پیدا ہُوئے اور اپنے بھائیوں جیسے نہیں۔ جب ہم اپنی زندگی پر اک نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے ہم ایسے ہی تھے۔ قدم بہ قدم، آہستہ آہستہ ہم اتنا آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے کہ قانون سے انحراف کی دہلیز پھلانگ چکے۔ اب جُرم، سب سے بڑا جرم ہم سے مسلسل سرزد ہو رہا ہے۔

ہمیں 'خانہ طفلاں' یاد ہے جہاں ہم پانچ برس کی عمر تک شہر کے دوسرے تمام شیر خوار بچّوں کے ساتھ رکھے گئے۔ یہ سب بچّے ایک ہی برس میں پیدا ہُوئے تھے۔ سونے کے کمرے صاف سُتھرے اور سفید تھے۔ ان میں سو بستروں کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں تھی۔ تب ہم اپنے شیر خوار بھائیوں جیسے تھے لیکن پھر ہم نے نظریے کا انحراف کیا۔ پہلا انحراف، پہلی قانون شکنی کہ ہم اپنے بھائیوں سے لڑنے لگے۔ بہت کم ایسے جرائم ہیں جنہیں اتنا قبیح اور گھناؤنا سمجھا جاتا ہو جتنا اپنے بھائیوں سے لڑنا۔ ہم سب کو وہاں یہی تعلیم اور تربیت دی جاتی تھی۔ اس کے باوجود ــــ ہم لڑتے تھے اور ہمیں اکثر کسی تنہا کوٹھڑی میں سزا کے طور پر بند کر دیا جاتا تھا۔

جب ہم پانچ برس کے ہُوئے تو ہمیں طالب علموں کے گھر بھیج دیا گیا جہاں دس وارڈ تھے اور دس برس تک تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر تک سب کا تعلیم حاصل کرنا لازمی تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب بڑے ٹاور کا گھڑیال بجتا تو ہم سونے کے لیے چلے جاتے۔ دوبارہ گھڑیال بجتا تو پڑھنے کے لیے چلے جاتے۔ جب کپڑے تبدیل کرنے کا وقت آتا تو سب ایک جیسا لباس پہن کر اپنے دائیں بازو کو اُوپر اُٹھا کر ہم اپنے تمین اساتذہ کی رہنمائی میں یک زبان ہو کر کہتے:

"ہم کچھ نہیں، بنی نوعِ انسان ہی سب کچھ ہے۔ اپنے بھائیوں کی شفقت سے ہم زندہ ہیں اور اپنے بھائیوں کے ذریعے سے اپنا وجود قائم رکھّے ہُوئے ہیں اور ہمارے بھائی ہی ریاست ہیں۔"

اس کے بعد ہم سو جاتے۔ سونے کے کمرے صاف سُتھرے اور سفید تھے اور وہاں بستروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ہم جو 'مساوی ۲۵۲۱ ـ ۷' ہیں، طالب علموں کے گھر میں خوش نہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ تعلیم بے حد آسان تھی۔ یہاں اس سے بڑا جُرم اور کوئی نہ تھا کہ کوئی بچہ ایسا ذہن لے کر پیدا ہُوا ہو جو خود کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ اپنے بھائیوں سے مختلف اور برتر ہونا گناہ ہے۔ یہ وہ سبق تھا جو ہمارے اساتذہ ہمیں پڑھاتے تھے۔

ہم نے اس لعنت کے خلاف لڑائی کا آغاز کیا اور اپنا سبق بھُلانے کی کوشش کی لیکن ہمیں ایک ہی آموختہ بار بار دُہرایا جاتا۔ ہمارے اساتذہ بھانپ گئے تھے کہ ہماری سوچ اُن کی تعلیم سے مختلف ہے، اس لیے ہماری اکثر پٹائی کرتے رہتے تھے۔

اُستاد بے چارے کیا کرتے؟ وہ اپنی جگہ دُرست اور صحیح تھے۔ سرکاری کونسلیں اُن کا تقرر کرتی تھیں اور یہی کونسلیں انصاف اور صداقت کی علمبردار سمجھی جاتی تھیں، کیونکہ نظریے کے مطابق کونسلیں جو فیصلے کرتی ہیں وہ تمام انسانوں کی اُمنگوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ 'ایک' کیا ہوتا ہے، اس کا وہاں تصور ہی نہ تھا مگر ہمارے دل کے نہاں خانے میں یہ 'ایک' زندہ رہا۔ اپنے بھائیوں سے مختلف، الگ تھلگ اور منفرد ــــ

اسے کوئی مار نہ سکا۔ یُوں ہم ایک قانون توڑ چکے تھے۔ ہمارے اُستاد ہمیں تلقین کرتے:

"تعلیم حاصل کرنے کے بعد کبھی یہ نہ سوچنا کہ تم خود کسی پیشے کا انتخاب کرو گے۔ تمہیں وہی کچھ کرنا ہے جس کی ہدایت پیشوں کی کونسل دے گی۔ 'پیشوں کی کونسل' اپنے اس شعبے میں سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ یہ کونسل ہی بہتر انداز میں جانتی ہے کہ تمہارے بھائیوں کو تمہاری کہاں ضرورت ہے اور یاد رکھّو اگر تمہارے بھائیوں کو تمہاری ضرورت نہیں تو پھر تمہیں زمین کا بوجھ بننے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

ایامِ طفولیّت اور زمانۂ تعلیم ہی میں ہم جان گئے تھے کہ ہم دوسروں سے مختلف ہیں اور ہماری کچھ اپنی ترجیحات ہیں جبکہ ترجیحات کا تصور بھی ذہن میں لانا جُرم ہے اور ہم سے یہ جُرم سرزد ہُوا۔ ہمیں اس نظام کی تخلیق اور اس کے تحت قائم ہونے والی مختلف کونسلوں کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ اشیا کی سائنس سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا اور علم حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اپنے اُستادوں سے سوال پُوچھنے لگے۔ اُستاد ہمیں ڈانٹتے کہ سوال کیوں پُوچھتے ہو۔ جو پڑھایا جاتا ہے اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ آسمانوں اور پانی کے نیچے اَن گِنت اسرار چُھپے ہُوئے ہیں لیکن علما کونسل کا فیصلہ تھا کہ دُنیا میں کوئی اسرار نہیں اور اس کونسل کا علم حتمی ہے۔ راتوں کو جب سنّاٹے میں ہمارے بھائیوں کے خرّاٹے گونج رہے ہوتے تو ہم تنہا بیٹھ کر کائنات کے اسرار پر غور کرتے۔ اُس وقت اپنے آپ کو بے حد آزاد اور بے فکر محسوس کرتے۔ کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا کہ جب ہماری تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہو تو ہمیں 'علما کے گھر' بھیج دیا جائے جہاں علما بنانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔

تمام نئی ایجادوں کا منبع 'علما کا گھر' تھا۔ یہی علما تھے جنہوں نے ایک طویل جدوجُہد کے بعد موم بتّی ایجاد کی تھی۔ یہی علما تھے جنہوں نے شیشہ ایجاد کیا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ سب چیزیں ایجاد کرنے کے لیے علما ضرور زمین، دریاؤں، ہواؤں اور دوسری اشیا کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہوں گے۔ ہم 'علما کے گھر' میں جانے کے خواہشمند تھے۔

موسمِ بہار کا پہلا دن تھا۔ ہم پندرہ برس کے ہو چکے تھے جب پیشوں کی کونسل کے معزّز ارکان عظیم الشّان ہال میں اونچی مسند پر تشریف فرما ہُوئے۔ فارغ التّحصیل طالب علموں سے وہ دو حرفی بات کرتے اور پھر وہ فیصلہ دیتے۔ 'بڑھئی'، 'ڈاکٹر'، 'خانساماں'، 'رہنما'۔ وہ جس طالب علم سے مخاطب ہوتے وہ اپنا دایاں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہتا: "ہمارے بھائیوں کے فیصلے پر عمل ہو گا۔"

جن طالب علموں کو وہ بڑھئی یا خانساماں کا کام ... اُن کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا لیکن جسے وہ لیڈر کہتے ... 'رہنماؤں کے گھر' میں داخلہ مِل جاتا۔ 'رہنماؤں کا گھر' شہر کی سب سے بڑی عمارت میں ہے جو تین منزلہ ہے۔ وہاں طالب علم کئی سال تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس تعلیم کے بعد اُن کا ... یا ریاستی کونسل کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے اور آخر میں عالمی کونسل ___ جس کے لیے سب لوگوں کی رائے لی جاتی ... عالمی کونسل میں انتخاب ___ الیکشن کے ذریعے ہوتا ہے ... کا درجہ ریاست میں سب سے ممتاز ہوتا ہے لیکن ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم تو عالم بننے کے خواہاں تھے۔

اس عظیم الشّان ہال میں اپنی باری کا انتظار کر ر... پھر ہمارا نام پکارا گیا۔ 'مساوی ۲۵۲۱ - ۷'۔ ہم چلتے ہُوئے ڈائس پر پہنچے۔ ہم نے کونسل کی طرف دیکھا جو پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ تین مرد اور دو خواتین۔ اُن سب کے بال سفید تھے۔ چہرے یُوں تڑخے ہُوئے جیسے خشک زمین پر ترِیڑیں پڑ گئی ہوں۔ وہ سب بہت بُوڑھے تھے اور مجسّموں کی طرح ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود زندہ تھے ... مستقبل کا فیصلہ کرنے آئے تھے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ کو جُنبش ہُوئی۔ ایک اُنگلی اُوپر اُٹھی اور زبان سے ایک ...

'خاکروب'۔

اچانک ہمارا سر بلند ہو گیا۔ ہم اپنے آپ کو مسرور پا رہے تھے۔ ہم نے ذاتی ترجیحات کے گُناہ کا ارتکاب کیا تھا، حالانکہ ہمارے گُناہ اور جُرم سے کوئی واقف نہ تھا۔ اب ہم نے اپنی زندگی کا فیصلہ قبول کر کے اپنے جُرم کی تلافی کرنے کا موقع حاصل کر لیا تھا، اس لیے ہم خوش تھے اور اپنے آپ کو فاتح سمجھ رہے تھے۔ ہم نے بھی اپنا بازو اُوپر اُٹھایا اور وہی الفاظ دُہرا دیے: "اپنے بھائیوں کے فیصلے پر عمل ہو گا۔" ہماری آواز صاف تھی۔ ہم نے کونسل کے ارکان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن اُدھر سے کوئی ردِّ عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں نیلے بٹنوں کی طرح سخت اور ٹھنڈی تھیں۔

یُوں ہم 'خاکروبوں کے گھر' پہنچ گئے۔ یہ ایک بھُورے رنگ کی عمارت ہے جو تنگ سی گلی میں ہے۔ اس کے صحن میں ایک دُھوپ گھڑی ہے جسے دیکھ کر گھڑیال بجایا جاتا ہے۔ جب گھنٹی بجتی ہے تو ہم سب اُٹھ جاتے ہیں۔ تب آسمان سبز اور سرد ہوتا ہے۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر ہم لباس تبدیل کر کے ناشتے سے فارغ ہو جاتے ہیں اور اپنے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شہر کی گلیوں میں جا نکلتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں جھاڑو اور ٹوکریاں ہوتی ہیں۔ پانچ گھنٹوں تک ہم کام کرتے ہیں اور واپس آ کر دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں جس کے لیے ہمیں نصف گھنٹہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہم پھر کام کے لیے نکل جاتے ہیں۔ پانچ گھنٹوں کے بعد جب ہم لَوٹتے ہیں تو ہمیں رات کا کھانا دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک گھنٹہ مقرر ہے۔ اس کے بعد گھنٹی بجتی ہے تو ہم سب ایک قطار میں شہر کے ملاقات ہالوں میں سے کسی ایک کا رُخ کرتے ہیں جہاں سوشل میٹنگ ہوتی ہے۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف گھروں سے وہاں پہنچتے ہیں۔ شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ ہمارے بھائی اپنے فرائض سے آگاہ کرتے ہیں اور ہمارے فرائض پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی ایک رہنما ہم سے خطاب کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اس روز سٹی کونسل میں کیا کارروائی انجام پائی ہے۔ سٹی کونسل میں جو فیصلے ہوتے ہیں، اُن کا جاننا ہر مرد و زن کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بعد ترانے گائے جاتے ہیں۔ برادرانہ محبت، مساوات اور اجتماعی رُوح کے ترانے۔ جب ہمیں وہاں سے فارغ کیا جاتا ہے تو ہم قطاروں میں چلتے کسی تھیٹر کے اندر داخل ہوتے ہیں جہاں تین گھنٹوں کی سماجی تفریح کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہاں جو کھیل دکھائے جاتے ہیں، اُن میں اجتماعی محنت کی عظمت کے گُن گائے جاتے ہیں۔ ڈرامے کے اختتام پر ہم قطار میں چلتے ہُوئے اپنے 'خاکروبوں کے گھر' پہنچتے ہیں۔ بستر پر لیٹتے اور سو جاتے ہیں۔ سونے کے ہال صاف سُتھرے اور سفید ہیں اور وہاں ایک سو بستروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

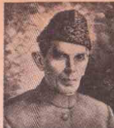

اس وقت میں آپ سے فقط اس بات کا طلب گار ہُوں کہ میرا یہ پیغام جس جس شخص کے پاس پہنچے، وہ اپنے دل میں اس بات کا عہد کرے کہ ضرورت پڑنے پر وہ پاکستان کو اسلام کی پُشت پناہ اور دُنیا کی عظیم ترین قوم بنانے کے لیے، جس کا نصبُ العین امن و آشتی ہو، اندرونِ ملک بھی اور بیرونِ ملک بھی، اور مسلمان کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعۂ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ حق کی خاطر شہید ہو جائے۔

(لاہور میں تقریر ___ ۳۰ اکتوبر ۴۷ء)

یوں ہم نے اپنی زندگی کے کئی سال اسی طرح گزار دیے۔ میکانکی اور مشینی انداز کی بندھی ٹکی، رُوکھی پھیکی زندگی بسر کرتے ہُوئے۔ سب سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر شخص کو اسی انداز میں چالیس برس کی عمر تک مسلسل اپنا فرض انجام دینا

چاہیے۔ چالیس برس کی عمر کے بعد جو شخص کام کرنے کے قابل نہیں رہتا، اُسے ناکارہ افراد کے گھر بھجوا دیا جاتا ہے جہاں بُوڑھے لوگ رہتے ہیں۔ یہ بُوڑھے لوگ کوئی کام نہیں کرتے۔ ریاست اُن کی کفالت کرتی ہے۔ وہ سردیوں میں دھوپ اور آگ سینکتے ہیں۔ وہ اتنے تھکے ہُوئے اور نڈھال ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ یہ بُوڑھے جانتے ہیں کہ وہ جلد مرنے والے ہیں۔ چالیس سے پینتالیس کی عمر تک مشکل ہی سے کوئی پہنچتا ہے۔ جو پینتالیس کے بعد بھی زندہ بچ جائے اُس کی زندگی ایک معجزہ سمجھی جاتی ہے۔ اُسے قدیم ترین انسان قرار دے دیا جاتا ہے۔

ہم اس نظامِ جبر کے تحت زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن ایسا واقعہ رُونما ہُوا جس نے ہماری زندگی بدل ڈالی۔ ہم اپنے دو خاکروب بھائیوں یونین ۵ ۔ ۳۰۹۲ اور انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۸۱۸ کے ساتھ صفائی کر رہے تھے۔ یونین ۵ ۔ ۳۰۹۲ ہمارا ایسا بھائی ہے جو نصف دماغ کا مالک ہے۔ اُس کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے۔ دوسرا ساتھی انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۱۸۸ ایسا جوان ہے جو کبھی کبھار اپنی ذاتی سوچ کا اظہار کر کے اس نظام میں معتوب ٹھہر چکا ہے۔

انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۸۱۸ اور ہم دوست ہیں، کسی کو اپنا دوست کہنا اس نظام کی رُو سے ایک جُرم ہے — یہ نظام برداشت نہیں کرتا کہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دی جائے۔ اس میں انسانی رشتے قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ ہمیں تو یہ تربیت دی گئی ہے کہ سب سے محبت کریں اور سب کو دوست سمجھیں۔ وسیع سطح پر اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ کسی کے ساتھ ذاتی دوستی کا رشتہ قائم نہ کیا جائے۔ انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۱۸۸ اور ہمارے درمیان کبھی دوستی کی بات زبان پر نہیں آئی لیکن ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

ہم تینوں اپنے فرائض انجام دیتے ہُوئے، تھیٹر کے پچھواڑے ایک جنگل میں جا پہنچے۔ یہاں درختوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے آگے کُھلی زمین ہے اور اُس کے آگے وہ جنگل جہاں درخت خود اُگتے، بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ اس جنگل کے بارے میں سوچنے اور وہاں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔

ہم ان کاغذوں، چیتھڑوں اور ٹکڑوں کو اکٹھا کر رہے تھے جنہیں تیز ہَوا اُڑا کر اِدھر لے آئی تھی۔ وہاں ہم نے لوہے کی ایک بڑی سلاخ دیکھی جو بہت پُرانی اور زنگ آلود تھی۔ اُسے زمین سے اُکھاڑنے کے لیے پُوری قوت صرف کر دی لیکن ناکام رہے۔ ہم نے انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۱۸۸ کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ دونوں نے مِل کر اس وزنی اور بھاری سلاخ کے اردگرد کی زمین کھود دی۔ اچانک ہمارے سامنے ایک دروازہ سا کُھل گیا جس کے سیاہ مُنہ کے ساتھ ایک آہنی جنگلہ بھی لگا تھا۔

انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۱۸۸ نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ ہم وہاں سوراخ کُھلا کرتے رہے اور اچھا خاصا راستہ بن گیا۔ وہاں لوہے کی سیڑھیاں نیچے اُترتے دیکھیں۔ "ہم نیچے جائیں گے۔"

"یہ ممنوع ہے۔" انٹرنیشنل ۴ ۔ ۸۱۸۸ نے تنبیہ کی۔

"کونسل کو اس سوراخ کا علم ہی نہیں، اس لیے وہ اس کے اندر جانے سے کیسے منع کر سکتی ہے؟"

ہمارے دونوں بھائی خوفزدہ دکھائی دینے لگے۔ کونسل کے حکم کی سرتابی کا تصوّر بھی اُن کے لیے محال تھا لیکن ہم فیصلہ کر چکے تھے؛ چنانچہ ہم نیچے اُترتے گئے اور سوراخ بڑا ہوتا چلا گیا۔ پھر ہمارے قدموں نے زمین کو چُھوا۔ یہاں اتنی تاریکی تھی کہ کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھیں ملیں، چند منٹوں کے بعد ہم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ہمارے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

یہ ایک سُرنگ تھی۔ ایسی سُرنگ جس کا علم یقیناً ہمارے شہر کے لوگوں کو نہیں تھا۔ سُرنگ کی دیواریں ہموار اور ملائم تھیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے پتھر کی بنی ہوں۔ زمین پر کچھ چیزیں بکھری ہُوئی تھیں جنہیں ہم نے چُھو کر دیکھا تو وہ شیشے کی طرح ٹھنڈی اور ہموار لگیں۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک ہم پر یہ عیاں ہُوا کہ یہ سُرنگ اُس زمانے میں بنائی گئی تھی جس کا ذکر ہمارے شہر میں ممنوع اور جُرم قرار دیا گیا ہے۔

سُرنگ سے باہر نکلے تو ہم ایسے انکشافات سے گزر آئے تھے جنہوں نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہمارے دوست انٹرنیشنل ۸۱۸۸ ۔ ۴ نے بے ساختہ کہا:

"مساوی ۷ ۔ ۲۵۲۱، تمہارا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔"

وہ دونوں بہت گھبرائے ہُوئے تھے اور سُرنگ کی خبر کونسل کو دینا چاہتے تھے۔ ہم نے اُنہیں منع کیا اور سمجھایا کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ یہ ہماری دریافت ہے۔ یہ 'ہماری' ہے۔

"دیکھو، اگر کونسل کو اطلاع مل گئی تو وہ سُرنگ کے اندر جانے کے جُرم میں ہمیں کوڑے ماریں گے۔ کیا یہ تمہارے لیے قابلِ برداشت ہو گا کہ کوڑوں سے ہماری کھال اُدھڑ رہی ہو؟"

بڑی مشکل سے ہمارے ساتھیوں نے خاموش رہنے کا وعدہ کر لیا۔

اور پھر ہماری زندگی کا چلن بدل گیا۔ رات کو جب تارے آسمان پر اُونچے دکھائی دیتے، ہم خاکروب تھیٹر میں کھیل دیکھ رہے ہوتے تو ہم وہاں سے اچانک چُپکے سے کھسک جاتے۔ تھیٹر سے نکل کر ہم تھیٹر کے پچھواڑے سے سُرنگ کے اندر چلے جاتے۔ ہم نے اپنے خاکروبوں کے گھر سے موم بتّی چوری کی ہے۔ ہم علما کے گھر کے کوڑے کرکٹ سے شیشیاں، کاغذ اور دوسری چیزیں بھی چُرا کر یہاں لے آتے ہیں۔ اس ایک سُرنگ میں ہم سب سے چُھپ کر چوری چوری پہنچ کر تین گھنٹے پڑھتے لکھتے اور تجربے کرتے ہیں۔ ہم نے شہر سے چیزیں چُرا کر سُرنگ کے اندر ایک آتشدان بھی بنا رکھا ہے جس میں جنگل سے چوری کی ہُوئی لکڑی جلائی جاتی ہے۔

ہم نے اہم دستاویزات اور مسوّدے بھی چوری کر لیے ہیں۔ یہ جُرم بہت ہی سنگین ہے۔ یہ مسوّدے اور دستاویزات بہت قیمتی اور خُفیہ ہیں۔ 'منشیوں کے گھر' میں ہمارے منشی سال میں ایک ایک برس میں ایک مسوّدے کی نقل تیار کرتے ہیں۔ نقل ہونے کے بعد اُنہیں 'علما کے گھر' پہنچا دیا جاتا ہے۔ ان چُرائے ہُوئے مسوّدوں کا چُھپ کر یہاں مطالعہ کرتے ہیں۔

سُرنگ کی دریافت کو دو برس ہو چکے ہیں۔ ہم ہر شب تین گھنٹے یہاں مطالعہ کرتے اور لکھتے ہیں۔ جب تھیٹر سے خاکروبوں کے واپس جانے کا وقت آتا ہے تو ہم تاریکی میں چلتے ہُوئے اپنی قطار میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا دوست اپنا عہد نبھا رہا ہے۔ انٹرنیشنل ۸۱۸۸ ۔ ۴ ہمارا رازدار ہے۔ سُرنگ میں ہم نے وہ علم حاصل کیا ہے جو ہمارے علما کے پاس بھی نہیں۔ ہم پر کائنات کے اسرار کا انکشاف ہُوا ہے اور یہ معلوم ہُوا ہے کہ یہ دُنیا وسیع اور رازوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے تجسّس اور جُستجو کی کوئی منزل نہیں لیکن ہمارا تجسّس بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہم تنہا رہنا اور علم حاصل کرنا اور انسان کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

"لبرٹی ۔ ۳۰۰۰ ۔ ۵ — پانچ تین ہزار۔"

ہم یہ نام بار بار لکھنا چاہتے ہیں۔ بار بار یہ نام زبان پر لانا چاہتے ہیں لیکن ہم یہ نام ایک سرگوشی میں کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اُونچی آواز میں یہ نام لینے کی جرأت ہمارے اندر نہیں۔ اس نظامِ جبر میں مردوں کو عورتوں میں دلچسپی لینے کی اجازت نہیں۔ عورتوں پر بھی یہی پابندی ہے۔

اس نظامِ جبر میں کوئی چیز ذاتی نہیں۔ وہ خواتین جو زمین کاشت کرتی ہیں، اُنہیں "کسانوں کے گھر" میں رکھا جاتا ہے جو شہر سے باہر ہے۔ شہر جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں سے ایک بڑی شاہراہ شمال کی جانب مُڑ جاتی ہے۔ ہم خاکروبوں کی یہ ذمّے داری ہے کہ پہلے سنگِ میل تک اسے صاف رکھیں۔ سڑک کے ایک طرف باڑ ہے۔ اس باڑ کے پیچھے کھیت ہیں۔ اُنہی کھیتوں میں ہل چلایا جاتا اور فصل اُگائی جاتی ہے اور یہیں ایک دن ہم نے لبرٹی ۵ ۔ ۳۰۰۰ کو دیکھا۔ اُن کا جسم دُبلا پتلا اور سیدھا تنا ہُوا تھا۔ اُن کی آنکھیں سیاہ چمکدار تھیں لیکن اُن میں کوئی خوف تھا نہ رحم نہ ندامت۔ اُن کے بال دھوپ کی طرح سُنہری تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین میں بیج

بکھیر رہی تھیں اور زمین کسی گداگر کی طرح یہ خیرات بخوشی قبول کر رہی تھی۔

ہم وہاں کھڑے رہے۔ پہلی بار ہمیں خوف کا احساس ہُوا۔ پھر دل میں ایک ایسا درد محسوس کیا جس کی لذت بے پناہ تھی۔ پھر ہم نے وہاں دوسری عورتوں کو پکارتے سُنا۔ "لبرٹی ۳۰۰۰ ۔ ۵" جب وہ مُڑ کر پکارنے والوں کو دیکھنے لگیں تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ اُن کا نام 'لبرٹی ۳۰۰۰ ۔ ۵' ہے۔ جب تک وہ ہمیں دکھائی دیتی رہیں ہم اُنہیں دیکھتے رہے۔

دوسرے دن ہم پھر وہاں پہنچے اور لبرٹی ۳۰۰۰ ۔ ۵ کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا دن! اور پھر کئی دن ہمارا یہی معمول ہو گیا۔ ہم پر پہلی دفعہ انکشاف ہُوا کہ انتظار کتنا صبر آزما ہوتا ہے۔ وہ جب سامنے آتیں تو ہم دزدیدہ نگاہوں سے اُنہیں دیکھتے چلے جاتے ہمیں معلوم نہیں کہ وہ بھی ہماری طرف دیکھتی اور موجودگی سے باخبر تھیں یا نہیں!

ایک دن وہ باڑ کے قریب کام کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ رُک گئیں اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُن کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نہیں تھی۔ اُن کے چہرے پر تناؤ تھا اور آنکھیں بہت گہری تھیں۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر باڑ سے دُور چلی گئیں۔

اگلے دن ہم وہاں پہنچے تو وہ ہمیں دیکھ کر مُسکرائیں۔ ہم بھی مُسکرا دیے۔ وہ عجب انداز میں خلا کو گھُورنے لگیں۔ اُسی لمحے ہم نے محسوس کیا کہ وہ دراصل ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ اُس دن کے بعد ہر روز ہم ایک دوسرے کو نگاہوں نگاہوں میں سلام کہنے لگے۔ سماجی تقریبات کے سوا کسی عورت یا مرد کا ایک دوسرے سے ہمکلام ہونا جُرم ہے۔ ہمیں اپنے اس جُرم پر کوئی پشیمانی نہ ہُوئی۔ ہم تو پہلے ہی کئی جُرم کر کے عادی مُجرم بن چکے تھے لیکن ابھی تک ہمارے جُرم کی بھنک کسی کے کان میں نہیں پڑی تھی۔ ہم نے اپنے دل میں لبرٹی ۳۰۰۰ ۔ ۵ کا ایک نام رکھ لیا تھا۔ یہ نام تھا ــــ زرّیں....

یہ بھی ہمارا جُرم تھا، کیونکہ اس نظام میں کوئی کسی کا نام [illegible] نہیں رکھ سکتا۔ یہاں کونسل لوگوں کا نام نمبروں پر [illegible] مگر ہم اپنے اس جُرم پر بہت خوش تھے۔ ہم نے اُن کا [illegible] زرّیں رکھا تھا۔ وہ اُن پر بہت پھبتا تھا۔

اس نظامِ جبر میں خواتین کے بارے میں سوچنا، اُن [illegible] ہمکلام ہونا سنگین جُرم ہے۔ اس میں انسان کے [illegible] اور انتہائی جمالیاتی احساسات کو بھی جانوروں کا انداز [illegible] مُلاپ گھر' کا تصور ہی ہمارے لیے بہت گھناؤنا ہے۔

ہم بہت سے قانون توڑ چکے ہیں اور آج ہم نے [illegible] اور قانون شکنی کی ہے۔ ہم نے زرّیں سے بات کی۔ [illegible] اس طرف باڑ کے قریب ہم کھڑے ہو گئے۔ کھیتوں [illegible] ہو رہا تھا۔ زرّیں کام کرتی کرتی باڑ کی طرف اکیلی آ [illegible] اُنہوں نے ہمیں دیکھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں۔ [illegible] دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مُسکراہٹیں ہمارے لبوں پر [illegible] تھیں۔ ہمارے خاکروب ساتھی باڑ سے بہت دُور [illegible] کر رہے تھے۔ بات کرنے کا سُنہری موقع مل گیا تھا۔

"لبرٹی ۳۰۰۰ ۔ ۵! آپ بہت خوبصورت ہیں!"

اُن کا چہرہ کوئی ردِعمل ظاہر نہ کر رہا تھا؛ البتہ [illegible] کی تابناکی بڑھ گئی تھی۔ ہم نے کہا: "ہم نے آپ کا نام [illegible] رکھا ہے۔ زرّیں... کیسا ہے نام؟"

زرّیں نے ہم سے پُوچھا: "آپ کا کیا نام ہے؟"

"مساوی ۔ ۲۵۲۱ ۔ ۷"

"آپ دوسرے بھائیوں جیسے نہیں"۔ وہ بولیں [illegible] چاہتے بھی نہیں کہ آپ بھی سب جیسے بن جائیں"۔

"آپ بھی ساتھی بہنوں جیسی نہیں"۔

"اگر آپ درجنوں عورتوں میں دیکھیں گے تو [illegible] لیں گے؟"

"ہم آپ ہی کو دیکھیں گے۔ آپ سینکڑوں میں ایک [illegible] زرّیں"۔

زرّیں کے لہجے میں تشویش گھُل گئی۔

"مگر ایسا سوچنا اور سمجھنا تو جُرم ہے"۔

"ہم تو یہ جُرم کریں گے آپ کے لیے زرّیں!"

اُن کا چہرہ گُلنار ہو گیا وہ بولیں:

"آپ ہم سے ملتے رہیں گے؟"

"ہم خاکروب ہیں۔ ہمیں کام کے لیے مختلف علاقے سونپے جاتے ہیں۔ اس بڑی شاہراہ کے پہلے سنگِ میل تک ہمارا علاقہ ہے۔ اس علاقے سے ہم کبھی تبدیل نہیں کیے جائیں گے۔ یہی کونسل کا قانون ہے"۔

وہ خوش دکھائی دینے لگیں۔

"آپ کی آنکھیں دوسرے مردوں سے مختلف ہیں"۔

زرّیں نے آنکھیں جُھکا لیں۔ ہم نے اپنے بے قابو دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ پُوچھا:

"آپ کی عمر کتنی ہے؟"

"سترہ برس"۔

ہمارا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ ابھی زرّیں پاک تھی۔ اُسے حیوان ابھی تک نہیں بنایا گیا تھا۔ 'مُلاپ گھر' پہنچنے کے لیے ابھی ایک برس پڑا تھا۔ ایک برس....

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نگاہیں دل کے راز کہتی رہیں۔

زرّیں کی ساتھی عورتیں اُسے پکارنے لگیں۔ جب زرّیں وہاں سے جانے لگیں تو اُنہوں نے ہمیں ایسی نگاہ سے دیکھا کہ ہمارا سارا وجود لرز گیا۔

جب ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ 'خاکروبوں کے گھر' کی طرف لَوٹ رہے تھے تو بلاوجہ ہمارا دل گیت گانے کو مچل رہا تھا۔ رات کے کھانے تک ہمارا دل مچلتا رہا۔ ہم ضبط کیے بیٹھے رہے کہ بلاوجہ اور بلا اجازت گانے کی یہاں اجازت نہیں۔

❖

اب ہم اپنی سُرنگ میں بیٹھے سب کچھ سوچ اور لکھ رہے ہیں۔ حیران ہیں کہ اس نظامِ جبر میں جہاں ذاتی خوشی کا تصور تک نہیں، ہم اتنے خوش کیوں ہیں؟ ہمیں تو ہمیشہ یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ ذاتی خوشی نام کا کوئی جذبہ سرے سے موجود ہی نہیں۔

بابائے قوم نے فرمایا:

"مَیں یہ واضح کر دینا چاہتا ہُوں کہ پاکستان کبھی اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ دونوں آزاد مملکتیں ایک مُشترک مرکز کے تحت آئینی طور پر ایک ہو جائیں۔ پاکستان قائم ہو چکا ہے اور قائم رہے گا؛ تاہم ہم بھارت کے ساتھ دو آزاد، مساوی الحیثیت اور خود مختار مملکتوں کی طرح ہمیشہ سمجھوتہ اور مفاہمت کے لیے تیار رہیں گے بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی اور غیر قوم سے معاہدۂ دوستی یا سمجھوتہ کر لیں"۔

(رائٹر کے نمائندے سے گفتگو ــــ ۲۳ اکتوبر ۴۷ء)

رات سونے کے لیے لباس تبدیل کرتے ہُوئے ہم نے اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کو دیکھا۔ اُن کے چہروں پر کوئی خوشی نہ تھی۔ ہمارے ساتھی عجیب بے رنگ رُوکھے پھیکے چہروں کے مالک تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہ جھانکتے تھے۔ اُن کے کندھے اور سر جُھکے رہتے تھے جیسے مسلسل کسی بوجھ تلے دبے ہوں۔ ہم نے اُن کا بھید پا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے۔

ہماری سُرنگ میں خوف کا سایہ نہیں لہراتا۔ یہاں ہوا پاک ہے۔ اس میں جبری زندگی گزارنے والے اَن گنت انسانوں کی بُو شامل نہیں۔ یہاں ہم جو تین گھنٹے بسر کرتے ہیں یہ آزادی کے لمحات ہوتے ہیں۔

ہمارا ایک ساتھی ــــ ۵۵۰۳ ۔ ۲ ہے۔ ابھی نوجوان لڑکا ہے۔ اُس کی آنکھیں مہربان ہیں۔ اکثر رو پڑتا ہے اور

پھر ایک نوجوان لڑکا اُستقامت ۷،۳۴۶۔۹ ہے جو سارا دن نڈر دکھائی دیتا ہے لیکن سوتے میں چیختا ہے۔

"ہماری مدد کرو۔ ہماری مدد کرو۔"

ڈاکٹروں نے اُس کا بہت علاج کیا ہے مگر وہ اُسے صحت یاب نہیں کر سکے۔

ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم خود رو قدرتی گھنے جنگل کو دیکھیں اور لُطف اُٹھائیں۔ وہاں جانا منع اور جُرم ہے۔ ہم اس جنگل کی طرف جب موقع ملے دیکھتے اور اس کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ زمانہ جس کا ذکر اس جبری سماج میں جُرم قرار دیا گیا ہے، اُس ناقابلِ ذکر زمانے میں انسان اس جنگل میں ضرور جاتے ہوں گے۔ یہ خود رو جنگل ہمارے لیے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ ہم نے قدیم قلمی نسخوں کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بڑی جنگ لڑی گئی تھی جس میں ایک طرف شر پسند تھے۔ ان شر پسندوں کو شکست ہُوئی۔ پھر چاروں طرف آگ لگا دی گئی۔ آگ پھیلتی اور بھڑکتی ہُوئی سب اشیا کو چاٹنے لگی۔ اُس زمانے کی تمام کتابیں، تمام ایجادات جلا دی گئیں۔ تمام انسان نذرِ آتش ہُوئے اور پھر وہ دَور ختم ہُوا۔ ایک نئے دَور کا آغاز ہُوا۔ صُبح کا دَور! ہمارے نظام میں اسے یہی نام دیا گیا ہے۔

ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں، یہ ایک سنگین جُرم ہے۔ اگر کونسل کو علم ہو گیا تو وہ ہمیں جلا دیں گے۔ اس جُرم کی وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک سزا دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل کی گہرائیوں میں ایک لفظ سر اُٹھا رہا ہے، وہی لفظ جس کے اظہار پر پابندی ہے۔ اُس کا کہنا اور اُس کا سُننا دونوں ہی جُرم ہیں۔ ہم یہی لفظ اپنے دل میں سُنتے اور اسے اپنی زبان پر لانا چاہتے ہیں جسے زبان پر لانے کی سزا موت ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں ہم نے شہر کے بڑے چوک میں کچھ لوگوں کو جلائے جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے وہ ممنوعہ لفظ ادا کیا تھا اور سُنا تھا۔ ہمارے حافظے نے یہ منظر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ ہم سب بچّوں کے ساتھ چوک میں کھڑے تھے۔ شہر کے سارے بڑے بھی وہاں موجود تھے۔ جب ایک مُجرم اور مُنحرف وہاں لایا گیا۔ وہ اُسے چِتا کے پاس لے گئے۔ قانون کے محافظوں نے بڑوں اور بچّوں ہم سب کے سامنے مُنحرف اور مُجرم کی زبان کھینچ کر باہر نکال دی۔ یہی وہ زبان تھی جس نے وہ ممنوعہ لفظ بولا تھا۔ مُنحرف مُجرم لمبے قد کا وجیہہ جوان تھا۔ اُس کے بال سُنہری تھے اور آنکھیں نیلی۔ انھوں نے مُنحرف مُجرم کو چِتا میں گرا دیا۔ سب مُجرم کو گالیاں دے رہے تھے اور اُس پر تھوک رہے تھے لیکن اُن سب چہروں میں اُسی مُجرم کا چہرہ ایسا تھا جس پر اطمینان تھا حالانکہ وہ آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اس لفظ کو بُھلا نہیں پایا تھا جو انسان کی شناخت ہے اور اُسے آزادی بخشتا ہے۔ تب ہم چھوٹے تھے۔ بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن آج ہمیں وہ واقعہ یاد آتا ہے اور اُس نوجوان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ہم اس کی نئی تفسیر، نئی معنویت اور نئی تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس تاریک سُرنگ میں ہم اپنی یادداشتیں کاغذ کے سینے پر منتقل کرنے کا سنگین جُرم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے بہت سے تجربات قدیم چُرائے ہُوئے مسودوں کی مدد سے کیے ہیں اور بعض ایسے نتائج سامنے آئے ہیں جو ہمارے نظام کے تحت اعلیٰ عزت پانے والے علما کو بھی معلوم نہیں۔ ہم نے وہ راز پا لیا ہے جو اس نظامِ جبر میں جانے کب سے انسانوں سے چھپایا جاتا رہا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ کوئی ایک ہے جو سب کائنات کا خالق و مالک ہے۔ کوئی ہے جو سب پر قادر ہے۔ کوئی ہے جو سب کچھ بنانے اور جاننے والا ہے۔ کوئی ہے جو ماورا اور مختارِ کل ہے۔ کوئی ہے جو زندگی دینے والا اور مارنے والا ہے۔

اس نظامِ جبر میں کسی ماورا طاقت کے بارے میں سوچنا، لکھنا یا اظہار کرنا سنگین ترین جُرم ہے۔ اُس خالقِ اعلیٰ کا تصوّر ہمارے دل میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ ہم نے اسے پُورے شعور سے تسلیم کر لیا ہے۔ اب ہمیں اس نظامِ جبر کی کوئی پروا نہیں

رہی۔ ہم اس کے تمام قوانین و ضوابط نظرانداز کر چکے ہیں۔ اس نظام کو چلانے والوں کا ہمارے دل میں اب خوف ہے نہ احترام۔ ہمارے سامنے ایک نیا راستہ آگیا ہے۔ شاید اس راستے پر ہمیں اکیلے ہی سفر کرنا پڑے ....

زریں سے ملاقات ہُوئے بہت دن بیت چکے تھے۔ اس روز آسمان سفید نظر آ رہا تھا۔ سورج نے اتنی حدّت خارج کرنی شروع کر دی تھی کہ آنکھوں کو ہر چیز سفید دکھائی دینے لگی تھی۔ دہقان عورتیں تھکی ماندی دُور دُور بیٹھی تھیں لیکن ہماری زریں باڑ کے پاس کھڑی تھی۔ اُن کی وہ آنکھیں جن میں خفگی اور سرد مہری ہوتی تھی، اب جُھکی ہوئی ہم سے کہہ رہی تھیں ہم آپ کا ہر حکم بجا لائیں گے۔

"زریں آپ ....."

وہ آہستہ سے بولیں۔ "آپ نے مجھے اچھا نام دیا ہے۔ ہم نے بھی آپ کا ایک نام رکھ لیا ہے۔"

ہم نے زریں کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتے ہُوئے بولیں:

"آپ کا نام ہم نے 'فاتح' رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں آپ کو شکست کبھی نہیں ہو گی۔"

ہم خاموش اُنہیں دیکھتے رہے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ پھر ہم نے کہا:

"آپ جانتی ہیں ایسی باتیں سوچنا جُرم ہے۔"

"لیکن آپ بھی تو ایسی باتیں سوچتے ہیں اور ہمیں بھی سوچنا سکھایا ہے۔"

زریں کی جُھکی ہُوئی آنکھیں آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھیں۔ ہم نے کہا:

"ہم دونوں کے درمیان خاردار باڑ حائل ہے جسے ہم ابھی پھلانگ نہیں سکتے۔"

"شاید کسی دن ....." زریں نے آہستہ سے کہا اور بات اَدھوری چھوڑ دی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی ہم سے دُور ہو گئی۔

ہم نے اُسے بنا لیا... ہم نے اُسے تخلیق کر لیا۔ ہم نے صدیوں سے پھیلی رات کو منوّر کر دیا۔ ہم جو اکیلے تھے تنہا تھے ہم نے اپنے ہاتھوں سے اُسے بنا لیا۔

ہم نہیں جانتے ہم کیا کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ خوشی میں اک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب سر گھُومنے لگتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ روشنی ہے جسے ہم نے دو سال سے زائد عرصے کے تجربات کے بعد تخلیق کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اس کی تخلیق کے مختلف مراحل میں ہمیں کیسی کیسی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی بار ہمت ہار دی تھی۔ کئی بار اپنے آپ پر برس پڑے تھے۔ کتنے جانگسل لمحات سے گزر کر ہم نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کامیابی کی خوشی نے ہمیں اپنے سارے ساتھیوں اور بھائیوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ اس تجربے کی کامیابی نے ہمیں قدرت کے ایک بھید کا علم بخشا ہے۔

آسمان پر کڑکتی، برستی اور گرجتی بجلی ہم نے شیشے کے اس چھوٹے سے ڈبے میں قید کر لی ہے۔ اسے آسمانوں سے چھین لیا ہے۔ چند تاروں، دھات کے کچھ چھوٹے پُرزوں اور شیشے کے اس ڈبے میں روشنی جگمگا رہی ہے۔ یہ ہماری تخلیق ہے۔ دھات کی ان تاروں کو جوڑ کر چند پُرزوں سے اُن کا ربط قائم کر کے شیشے کے اس ڈبے کو اتنا روشن کیا جا سکتا ہے کہ بہت سی موم بتّیوں کی مجموعی روشنی بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

ہمارے حوصلے وسیع اور بلند ہیں۔ یہ روشنی جس سے ہماری سُرنگ منوّر ہُوئی ہے، اسی روشنی سے، ہم اپنے شہر اور دُنیا کے سب شہروں کو روشن کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے بھائیوں کو ایک ایسی روشنی دیں گے جو اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ آسمان پر چمکنے والی بجلی ہم نے قید کر لی ہے۔ ہم اس سے استفادہ کریں گے۔ اسے پھیلاتے چلے جائیں گے۔ اس ایجاد اور تخلیق پر ہم جتنا فخر کریں کم ہے۔

ہم نے جو ایجاد کی ہے وہ بہت بڑی ہے۔ اب ہم سڑکوں پر جھاڑو نہیں دیا کریں گے۔ ہم اپنی ایجاد کے خالق کی حیثیت سے "علما کے گھر" میں داخلہ حاصل کرنے کا استحقاق حاصل کر چکے ہیں۔ ہم اپنے علما بھائیوں کو اس ایجاد سے رُوشناس کرائیں گے۔ اُن کے ساتھ مل کر نئی نئی ایجادات کریں گے۔

ہم جانتے تھے کہ ایک ماہ بعد علما کی عالمی کونسل کا اجلاس ہمارے شہر میں ہونے والا ہے جس میں مختلف علاقوں اور شہروں کے عظیم علما شرکت کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ہم اس اجلاس میں اپنی ایجاد سب علما کے سامنے پیش کریں گے اور اُن کے سامنے سب اعتراف کریں گے کہ ہم نے کس طرح اسے ایجاد کیا اور کن حالات میں اس کی ایجاد ممکن ہو سکی۔ وہ ہماری قانون شکنی کو نظر انداز کر دیں گے۔ ہمیں اپنی صفوں میں شامل کر کے نت نئی ایجادات کے لیے سہولتیں فراہم کریں گے۔ اگرچہ اس نظامِ جبر میں ایسا نہیں ہُوا کہ کسی پیشے کے آدمی کو دوسرے پیشے اور شعبے میں منتقل کر دیا جائے لیکن جو کچھ ہم نے ایجاد کیا ہے، وہ بھی تو پہلے کسی نے ایجاد نہیں کیا۔ وہ ہمارے لیے قانون میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اب ہمیں انتظار کرنا ہے۔ اپنی سُرنگ کا ابھی کسی کو سُراغ نہیں لگانے دیں گے۔ جب تک علما کی عالمی کونسل کا اجلاس منعقد نہیں ہوتا ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اگر علما کونسل کے عالمی اجلاس سے پہلے ہمارا راز کُھل گیا تو ہم اپنی ایجاد اور اپنی سرگرمیوں کی افادیت سے کونسل کے ارکان کو مطمئن نہ کر سکیں گے۔ ہمارے کام کی اہمیت تو علما ہی سمجھ سکتے ہیں۔

❖

تیس دن ہم ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکے۔ ان تیس دنوں میں ہمیں یہاں اپنی خفیہ سُرنگ میں آنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہمیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اُس رات جب ہم نے آخری سطور لکھی تھیں، ہم اپنی ایجاد پر اتنے مسرور ہُوئے کہ ہم سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔

اُس رات ہم اتنے خوش تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ جب ریت گھڑی کی طرف دیکھا تو ساری ریت گر چکی تھی۔ ہم جلدی سے بھاگے اور تھیٹر پہنچے۔ سب ساتھی "خاکروبوں کے گھر" جا چکے تھے۔ اب اگر ہم واپس اپنی سُرنگ میں آتے تو اُس کا بھید کُھل سکتا تھا جسے ہم علما کے عالمی اجلاس سے پہلے کسی حالت میں بھی افشا نہ کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنے خاکروبوں کے گھر کا رُخ کیا۔

کونسل کے ارکان نے ہمیں دھر لیا۔ اُن میں سے جو بُوڑھا رُکن تھا، اُس نے ہم سے پُوچھا:

"آپ کہاں تھے؟"

ہم نے اپنی ایجاد، اپنے غار اور اپنی سرگرمیوں کے بارے میں سوچا اور پھر جواب دیا:

"ہم آپ کو یہ نہیں بتا سکے۔"

بُوڑھے رُکن نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا اور اپنے دو جوان ساتھیوں کو حکم دیا:

"بھائی مساوی ۲۵۲۱-۷ کو اصلاحی زنداں میں لے جاؤ۔ جب تک یہ نہ بتائے کہ وہ کہاں تھا اسے کوڑے مارے جاؤ۔"

ہمیں اصلاحی زنداں کے تہ خانے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی تھی نہ درز۔ دو جلاد وہاں موجود تھے جنھوں نے چمڑے کی لنگوٹیاں پہن رکھی تھیں اور چہروں پر چمڑے کے نقاب ڈال رکھے تھے۔ وہ جو ہمیں وہاں لے کر آئے تھے، ہمیں وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ وہاں دو جج بھی موجود تھے۔ دونوں جج دُبلے پتلے کمزور بُوڑھے تھے جن کی کمریں جُھکی ہُوئی تھیں۔ اُنھوں نے جلادوں کو اشارہ کیا جنھوں نے ہمارا لباس پھاڑ کر ہماری کمر ننگی کر دی۔ اُنھوں نے ہمیں گرا کر گھٹنوں کے بل جُھکا دیا اور ہمارے ہاتھ ایک سنگی ستون سے باندھ دیے۔

پہلے کوڑے کی ضرب یُوں لگی جیسے ہمارا جسم دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہو۔ دوسری ضرب نے جیسے جسم کو پھر یکجا کر دیا ہو، لیکن تیسرے کوڑے نے ایسے درد کو جنم دیا جو ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے باوجود ہم چیخے نہ چلّائے۔ کوڑے ہمارے جسم پر برستے رہے۔ ہم نے کوڑوں کی تعداد گننے کی کوشش کی لیکن اذیّت اور درد نے گنتی بُھلا دی۔

پھر ان جلادوں میں سے ایک نے ہمیں بالوں سے پکڑ کر سر اُونچا کیا اور پُوچھا:

"بتاؤ تم کہاں تھے؟"

ہم نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ہم کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ راز ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ کوڑے پھر برسنے لگے۔ اب ہمیں یُوں لگ رہا تھا، جیسے ہمارے زخموں پر کوئی مرچیں چھڑک رہا ہو۔ ہم ہوش و حواس کھوتے جا رہے تھے۔ کوڑے برسانے والے ہر کوڑے کے ساتھ ہذیانی لہجے میں پھنکارتے:

"بتاؤ تم کہاں تھے ... بتاؤ تم کہاں تھے۔ بتاؤ تم کہاں ..." ہمارے ہونٹ کُھلے۔ ایک تیز کراہ ہم نے خود سُنی:

"روشنی ... ہماری روشنی ... روشنی ..."

پھر ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہُوا۔ ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک تاریک سی کوٹھڑی کے ننگے فرش پر پیٹ کے بل لیٹے پایا۔ ہم نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ ہمارے ہاتھ آزاد تھے۔ ہمارے لیے اپنے جسم کو حرکت دینا مشکل ہو رہا تھا۔ سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ اس کے باوجود ہم مُسکرا دیے کیونکہ ہم نے سب اذیّتیں سہنے کے باوجود اُنہیں کچھ نہ بتا کر اپنے آپ سے غدّاری نہیں کی تھی۔

اُس کوٹھڑی میں کئی دن اُسی حالت میں پڑے رہے۔ کوٹھڑی کا دروازہ دن میں دو بار کُھلتا۔ ایک بار روٹی اور پانی لانے والا داخل ہوتا اور دوسری بار جج وہاں آتے۔ کئی

ہمارے وہ بھائی جو بھارت میں اقلیت میں ہیں، اطمینان رکھّیں کہ ہم اُنہیں فراموش کر سکتے ہیں نہ اُن کی طرف سے لاپروا ہو سکتے ہیں۔ ہماری دلی ہمدردی اُن کے ساتھ ہے۔ اُن کی اعانت اور بہتری کے لیے ہم بڑی سے بڑی کوشش کو بھی زیادہ نہیں سمجھیں گے کیونکہ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس برِّصغیر میں مُسلم اقلیتی صُوبے ہی تھے جنھوں نے ہمارے محبوب نصبُ العین، پاکستان کے لیے سب سے پہلے پیش قدمی کی اور اس کا جھنڈا سر بلند کیا۔

(پیغام عید — ۱۸ اگست، ۴۷ء)

ججوں نے ہمیں آ کر دیکھا تھا۔ وہ ہر بار ہم سے ایک ہی سوال کرتے: "کیا اب تم بولنے کے قابل ہو گئے ہو؟"

ہم نفی میں اپنا سر ہلاتے۔ ہم بول سکتے تھے لیکن ہم جُھوٹ بول رہے تھے۔ ہم دن اور رات کا حساب رکھتے تھے۔ پھر ہم نے حساب لگایا تو پتہ چلا کہ دوسرے دن علما کی عالمی کونسل کا اجلاس ہو رہا ہے۔

ہمارے لیے وہاں سے فرار ہونا مشکل نہ تھا۔ دروازے پر تالے پُرانے اور زنگ آلود ہیں۔ وہاں محافظ نہیں ہوتے۔ کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ وہاں سے کوئی فرار ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی سُننے میں نہیں آیا تھا کہ کسی نے کونسل کے حکم کی سرتابی کی ہو اور وہاں سے بھاگ نکلا ہو۔ ہمارا جسم بھی اب ٹھیک ہو چکا تھا اور ہمارے مقصد نے ہمیں بڑی توانائی

بخش دی تھی۔ ہم تاریک برآمدوں میں چلتے ہُوئے وہاں سے نکل کھڑے ہُوئے اور سیدھے اپنے غار میں پہنچے۔ وہاں اپنی ایجاد روشنی جلائی اور غار کا معائنہ کیا۔ وہاں ابھی تک کوئی نہ پہنچ سکا تھا۔ کونسل کے لیے غار کا وجود ہی نہ تھا۔ دوسرے دن ہم دن کی پُوری روشنی میں سُرنگ سے نکلے۔ شیشے کا وہ ڈبّہ، ہماری ایجاد، ہماری بغل میں تھا۔ ہم گلیوں سے گزرتے علما کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ہم اُن کے سامنے یہ ڈبّہ اور اپنے تمام کاغذات رکھ کر اپنی ایجاد سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہماری ایجاد پر وہ ہمارے تمام جرائم معاف کرتے ہُوئے ہمیں علما کی صف میں شامل کر لیں گے۔ ہم اُن کے ساتھ مل کر انسانیت کی عظمت اور بہبود کے لیے کام کریں گے۔

شہر کی گلیوں میں کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی کو معلوم بھی تو نہیں تھا کہ ہم نے کیا کیا ہے۔ ہم علما کے گھر کے اندر داخل ہُوئے۔ لمبی راہداریوں سے گزرتے اُس ہال کے اندر پہنچ گئے۔ جہاں علما کا اجلاس ہو رہا تھا۔

سب علما ایک لمبی میز کے اِرد گرد بیٹھے تھے۔ اُن میں بہت سے ایسے تھے جن کے نام اور شہرت سے ہم واقف تھے۔ بہت ایسے تھے جنھیں ہم نہیں جانتے تھے۔ اُن کے پیچھے دیوار پر ایک لمبی چوڑی پینٹنگ آویزاں تھی۔ اس پینٹنگ میں اُن بیس سائنس دانوں اور علما کے چہرے دکھائے گئے تھے جنھوں نے مل کر موم بتّی ایجاد کی تھی۔

ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر سب کی نگاہیں ہم پر جم گئیں۔ دُنیا کے ان عظیم اور خلّاق ذہنوں والے سائنسدانوں اور علما کے اجتماع میں ہم جھینپ رہے تھے لیکن جلد ہی ہم نے اپنے آپ پر قابُو پا لیا۔ وہ سب ہمیں دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تجسّس تھا اور حیرت بھی۔ ہماری قمیص پھٹی ہُوئی اور خُون کے دھبّوں سے داغدار تھی۔ اُن کا یہ ردِّ عمل ہمارے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ ہم نے اپنا دایاں بازو اُوپر اُٹھاتے ہُوئے کہا:

"عالمی کونسل کے نامور اور معزّز ارکان کی خدمت میں ہم سلام پیش کرتے ہیں۔"

کونسل کے سب سے بوڑھے رُکن نے ہم سے استفسار کیا:

"ہمارے بھائی آپ کون ہیں؟ آپ عالم یا سائنسدان تو دکھائی نہیں دیتے۔"

"ہمارا نام مساوی ۲۵۲۱-۷ ہے۔ ہم شہر کے [illegible] خاکروبان کے ایک رُکن ہیں۔"

پھر یُوں لگا جیسے طوفان پھٹ پڑا ہو۔ تمام علما بیک وقت بولنے لگے تھے۔ وہ بے حد ناراض اور مشتعل دکھائی دے رہے تھے۔

"خاکروب ... ایک خاکروب علما کی عالمی کونسل [illegible] ... ناقابلِ یقین، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام قوانین و ضوابط کے منافی ہے۔"

"ہمارے بھائیو!" ہم نے کہنا شروع کیا۔ "ہماری [illegible] اور ہماری قانون شکنی کو اہم نہ سمجھو۔ ہمیں یہ احساس [illegible] کہ ہم کچھ بھی نہیں، حقیر ہیں۔ ہماری بات سُنو، ہم آپ کے لیے ایک ایسا تحفہ لائے ہیں جیسا تحفہ آج تک کوئی [illegible] نہیں کر سکا۔ ہماری بات توجّہ سے سُنو! کیونکہ بنی نوع انسان کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے۔"

وہ بات سُننے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہم نے [illegible] شیشے کا ڈبّہ اُن کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کے بارے میں اپنی جُستجو اور اپنے تجربات کا ذکر کیا، اپنی خُفیہ سُرنگ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اصلاحی زنداں سے اپنے فرار کی داستان بھی سُنا دی۔ جب تک ہم بولتے رہے کسی [illegible] کو جُنبش ہُوئی نہ ہونٹوں کو۔ ہم نے اس کے بعد شیشے کا [illegible] تاروں سے جوڑا، پُرزوں کو ترتیب دیا اور خاموش ہو کر [illegible] ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ وہ تاریں روشن [illegible] لگیں اور پھر وہ روشنی سے بھر گیا۔

وہ سب خوفزدہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہُوئے جیسے کوئی [illegible]

چیز اُن پر حملہ کرنے والی ہو۔ وہ بھاگ کر میز چھوڑتے ہُوئے دیوار کے ساتھ ایک دوسرے سے چپک اور لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم اُن کی طرف دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیے:

"ہمارے بھائیو! ڈرو نہیں۔ ان تاروں میں ایک عظیم قوّت پوشیدہ ہے۔ ہم نے اس طاقت پر قابُو پا لیا ہے۔ اب یہ آپ کی ہے۔ ہم اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔"

وہ دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے رہے۔

"ہم آپ کو آسمان کی قوّت دے رہے ہیں۔" ہم نے چیخ کر کہا۔ "ہم آپ کو زمینوں کی کلید بخش رہے ہیں۔ اسے لے لیں اور ہمیں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ ہم سب مل کر کام کریں گے اس طاقت کو زیر کرتے چلے جائیں گے۔ ہم یُوں انسانی محنت آسان کر دیں گے۔ آئیے آج ہم اپنی موم بتّیاں بُجھا کر پھینک دیں۔ اپنے شہروں کو اس روشنی سے منوّر کر لیں۔ آئیے ہم سب مل کر انسان کو ایک نئی روشنی دیں۔"

وہ ہمیں دیکھتے رہے اور پھر ہم خوفزدہ ہو گئے، کیونکہ اُن کی آنکھیں بدی سے بھری ہوئی تھیں۔

علما کی کونسل کا بُوڑھا رُکن آگے بڑھا۔ اُسے دیکھ کر دوسروں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ وہ سب میز کی طرف بڑھے۔ ہم نے اُن کی خاموشی توڑنے کے لیے پُوچھا:

"بھائیو! کیا آپ کے پاس ہمارے لیے کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے؟"

بڈّھا بولا: "ہم بہت کچھ کہنے والے ہیں۔ آپ ایک بدبخت انسان ہیں، آپ نے یہاں کے قوانین توڑے ہیں۔ اپنی گھٹیا سی بات پر فخر کر رہے ہیں۔ یہ خیال کیسے آپ کے ذہن میں آیا کہ آپ علما کی کونسل سے زیادہ دانا ہیں۔ آپ اعتراف کر چکے ہیں کہ آپ ایک خاکروب ہیں۔ آپ کو یہ جرائت کیسے ہُوئی کہ یہ سوچ سکیں کہ خاکروبی کا کام چھوڑ کر آپ انسانوں کے لیے زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں؟"

"نالے صاف کرنے والے غلیظ خاکروب! تم نے تنہا سوچنے اور تنہا بیٹھنے کا سنگین جُرم کیا ہے۔" ایک دوسرا رُکن بولا۔

"اسے زندہ جلا دیا جائے۔" ایک اور نے مطالبہ کیا۔

"نہیں، اسے اتنے کوڑے مارے جائیں کہ اس کا جسم قیمہ بن جائے۔" سب سے بُوڑھا رُکن بولا:

"نہیں بھائیو! ہم اس جُرم کا یُوں فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے پہلے کسی نے ایسے جُرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس کا جُرم بہت بڑا ہے۔ بہت سنگین اور ناقابلِ قیاس۔ ہم اسے عالمی کونسل کے سپرد کرتے ہیں۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گی۔"

ہم نے اُن کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا:

"ہمارے بھائیو! آپ دُرست فرماتے ہیں۔ عالمی کونسل کو ہمیں سزا دینے کا حق ہے۔ وہ ہمیں جلا دے، اس کی ہمیں کچھ پروا نہیں، مگر یہ روشنی ... یہ ایجاد ..."

بڈّھا بڑے طنزیہ لہجے میں پُوچھنے لگا:

"آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایک نئی توانائی دریافت کر لی ہے۔ کیا آپ کے سب بھائی بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟"

"نہیں" ہم نے جواب دیا۔

"آپ نے یہ کام اکیلے ہی کیا ہے۔"

"ہاں"

"ہر وہ کام جو اجتماعی طور پر نہ کیا جائے، انفرادی سطح پر انجام پائے کبھی مفید اور اچھّا کام نہیں ہوتا۔ علما کے گھر میں کئی علما نے کئی انوکھے خیالات پیش کیے، لیکن اُن کو عملی جامہ نہیں پہنایا، کیونکہ علما کی اکثریت نے اُنھیں اس سے منع کر دیا تھا۔ ہمیں ہر حال میں اپنے قوانین پر عمل کرنا ہے۔"

"یہ شیشے کا ڈبّہ ایک بے کار چیز ہے۔" ایک رُکن بولا۔ "موم بتّی انسانی ترقّی کی معراج ہے، کیونکہ اسے بنی نوعِ انسان نے مل جُل کر بنایا تھا۔"

ہمیں اپنے منصوبوں پر قوانین کے مطابق عمل کرنا

ہے۔ ہم اس میں کوئی رخنہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے منصوبوں میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی تو سورج کیسے طلوع ہوگا؟ پچاس برس کے طویل عرصے میں تمام کونسلوں کی منظوری کے بعد موم بتی کے استعمال کی اجازت دی گئی تھی۔ ہم اپنے منصوبے غارت نہیں کر سکتے۔"

"اگر یہ ایجاد انسانی محنت کو آسان اور سہل بنا سکتی ہے تو پھر یہ سراسر شر ہے۔ اگر انسانی محنت آسان ہو گئی تو ہم انسانی عظمت کے گُن کیسے گا سکیں گے۔"

وہ سب ہماری دریافت، ہماری ایجاد کے خلاف بول رہے تھے۔ بڈھے رُکن نے انگلی اُوپر اُٹھاتے ہوئے فیصلہ دیا:

"اس چیز کو تباہ کرنا لازمی ہے۔"

اور سب ایک ساتھ چیخنے لگے:

"اسے تباہ کر دیا جائے۔ اسے تباہ کر دیا جائے۔"

تب ہم میز کی طرف لپکے۔ ہم نے اپنا شیشے کا ڈبّہ اُٹھا لیا اور کھڑکی کی طرف بھاگے۔ بھاگتے ہوئے ہم نے اُنہیں مُڑ کر دیکھا۔ اُن نام نہاد سائنسدانوں نے ہمیں بے حد مایوس کیا تھا۔ شدید غصّے کی حالت میں ہماری آواز پھٹنے لگی۔

"بے وقوفو، احمقو، ! تم غلط کار ہو۔ مُجرم ہو۔ بنی نوعِ انسان کے مُجرم۔" ہم کھڑکی کے اُوپر چڑھے۔ دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ ہم خاصی اُونچائی سے زمین پر گرے، ہمیں چوٹ بھی آئی لیکن ہم نے اپنے شیشے کے ڈبّے کو ٹھیس تک نہ لگنے دی۔ ہم اُٹھے اور بھاگنے لگے۔ بھاگتے چلے گئے۔ کسی پرندے کی طرح ہم اُڑ رہے تھے۔ راستے کے نشیب و فراز کی بھی ہمیں کوئی پروا نہ تھی۔ لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے، کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم بھاگتے رہے۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ بھاگتے چلے جائیں۔

پھر ہمیں محسوس ہُوا کہ ہم تھک گئے ہیں۔ ہم زمین پر گر گئے ـــــ ہم نے اپنے اِرد گرد ایسے درخت دیکھے جو بہت اُونچے تھے اور اتنے بلند درخت ہم نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ قد آور درخت خاموشی سے کھڑے تھے۔ تب ہمیں معلوم ہُوا کہ ہم خود رو جنگل میں ہیں جہاں شہری کونسل کے حکم کے مطابق جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارا یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ ہماری بھاگتی ہُوئی ٹانگیں تھیں جو ہمیں یہاں لے آئی تھیں۔ ہمارا شیشے کا ڈبّہ ہمارے پاس پڑا تھا۔ ہم بہت سکون اور اطمینان سے گھاس پر لیٹے اپنی تھکن اُتارنے لگے۔ جانے کتنی دیر تک ہم لیٹے رہے۔ پھر اُٹھے، اپنا شیشے کا ڈبّہ اُٹھایا اور جنگل میں چلنے لگے۔ اب ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ اس ممنوعہ علاقے میں ہمیں کوئی پکڑنے کے لیے نہیں آئے گا۔ یہاں ہمیں کوئی خوف نہ تھا۔ ہم تو یہی چاہتے تھے کہ اس نظامِ جبر کے سائے تلے سانس لینے والے شہر سے دُور بہت دُور چلے جائیں۔ بغل میں اپنا شیشے کا ڈبّہ دبائے ہم چلتے رہے۔

گہری مایوسی دل کو بھاری کرنے لگی۔ سوچا ہم اکیلے اب اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہمارا وجود کٹنے لگا تھا۔ ہم اپنے بھائیوں ساتھیوں سے ہمیشہ کے لیے دُور چلے آئے تھے۔ واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس خیال نے اُداسی اور مایوسی کو بہت شدید اور خوفناک بنا دیا۔ اب تھکن کا احساس بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس گہری مایوسی کا بھی پُورا شعور حاصل ہو گیا تھا۔ ہم نے شیشے کا یہ ڈبّہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے بنایا تھا۔ یہ ہماری ذاتی فتح تھی۔

اچانک دل میں ایسی ٹیس اُٹھی کہ سارا وجود لرزنے لگا۔ درد نے جسم کو چھید ڈالا۔ ہمیں اپنی زرّیں کا خیال آ گیا تھا جسے اَب ہم دوبارہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے محسوس کیا زرّیں کو کھو کر ہم تباہ ہو گئے ہیں۔ اُس کے بغیر ہماری زندگی ہمیشہ دُکھی رہے گی۔ ہم جتنی بھی کوشش کریں، ہمارے لیے زرّیں کو بھلانا ممکن نہیں۔

جنگل میں ہمارا پہلا دن حیران کُن تھا۔ ہم چلتے چلتے رُکے اور پھر لیٹ گئے۔ ہماری آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی

تو سورج کی ایک ننھی کرن ہماری پیشانی کو سہلا رہی تھی۔ ہم چونک کر اُٹھے۔ پھر خود ہی مُسکرا دیے۔ ہم اب اس دُنیا میں نہیں تھے جہاں گھنٹی کی آواز پر اُٹھنا، ناشتے کے لیے جانا اور پھر کام پر نکل جانا ہوتا تھا۔ ہماری زندگی کی باگ ڈور گھنٹی کی اِن آوازوں کے ہاتھ میں تھی۔ اب ہم جس دُنیا میں تھے، یہاں کوئی گھنٹی بجانے والا نہ تھا۔ ہم آزاد تھے۔ بے نیازی اور سکون سے ہم نے اپنے ہاتھ پاؤں اچھی طرح زمین پر پھیلا دیے۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت اور پیارا لگا۔ درختوں کے پتّوں شاخوں اور ٹہنیوں نے ہماری آنکھیں دلکش رنگوں سے بھر دیں۔ ہم اس آزادی کے تصوّر سے بے حد مسرور تھے کہ ہم جب تک چاہتے کسی رکاوٹ اور مداخلت کے ساتھ لیٹ سکتے تھے۔

ہم پھر جنگل میں چلنے لگے۔ ہر شے ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ہمیں بھوک لگی تو ہم رُک گئے۔ ہم نے ایک پرندے کو نشانہ بنایا اور وہ ہمارے قدموں میں آن گرا۔ ہم نے آگ جلائی اور ایک پرندے کا لذیذ گوشت بھون کر کھایا۔ ایسی بے فکری اور آزادی سے ہمیں کبھی اتنا لذیذ کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ ہم نے ندّی کا ٹھنڈا اشفاف پانی پیا۔ ہم پھر چل نکلے۔ جنگل ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور ہمیں اس کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ شام تک ہم چلتے رہے جب سائے تاریک ہونے لگے تو ہم نے درختوں کی جڑوں کے پاس اپنے لیے سونے کی جگہ بنائی۔ اس کے بعد ہم نے اپنے کاغذات نکالے اور لکھنا شروع کر دیا اور اپنے آپ سے بہت باتیں کیں اور پچھلے سارے دنوں کا احوال بھی رقم کر دیا۔

جنگل میں ہمارا دوسرا دن تھا کہ ناگاہ ہم نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سُنی۔ ہم جلدی سے جھاڑیوں میں یہ دیکھنے کے لیے چھُپ گئے کہ ہمارا تعاقب کون کر رہا ہے۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے ہم نے ایک سفید لبادہ دیکھا۔ ہم تیزی سے باہر لپکے۔ ہمارے سامنے زرّیں کھڑی تھی۔

زرّیں نے ہمیں دیکھا۔ کتنی ہی دیر تک ہم جہاں کھڑے تھے وہیں رُکے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"زرّیں ! آپ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟" بالآخر ہم نے پُوچھا۔ وہ میٹھی سرگوشی میں بولیں:

"ہم نے آپ کو پا لیا۔"

ہم نے اپنا سوال پھر دُہرایا تو زرّیں نے اپنا سر اُٹھایا۔ اُن کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

"ہم آپ کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہم نے سُن لیا تھا کہ آپ شہر سے بھاگ نکلے ہیں۔ شہر میں یہ بھی کہا جانے لگا کہ آپ ممنوعہ جنگل میں چلے گئے ہیں۔ ہم نے بھی فیصلہ کر لیا اور رات ہُوئی تو ہم دہقانوں کے گھر سے نکل بھاگے۔ ہمیں آپ کے قدموں کے نشان اُس علاقے میں دکھائی دیے جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ اُن قدموں کے پیچھے چلتے ہم جنگل میں آ گئے اب ہم نے آپ کو پا لیا ہے۔"

زرّیں کا سفید لبادہ جگہ جگہ سے خاردار جھاڑیوں میں اُلجھنے کی وجہ سے پھٹ چکا تھا لیکن اُس کے چہرے یا لہجے سے کسی طرح کی تھکن کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"ہم اَب مل گئے ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا ہے۔ اب ہم ساتھ جییں گے ساتھ مریں گے۔"

اِنشا پردازی

صحرا میں پُورے چاند کی آدھی رات پھیلی تھی اور ایک دُخترِ صحرا اپنے خیمے کے سامنے سیاہ ریشم کا پیرہن پہنے اِس شانے سے اُس شانے تک بال کھولے کسی کا انتظار کرتے کرتے تصویر ہو چکی تھی۔

(خالدؓ بن ولید ـــــ از ڈاکٹر عبدالستار)

زرّیں آہستہ آہستہ کہنے لگیں:

"آپ کی آنکھوں میں مشعلیں جل رہی ہیں جبکہ شہر کے مردوں کے دلوں میں حوصلہ ہے نہ اُمّید۔ ہر لمحہ خوف اُن کے چہرے پر اپنا سایہ ڈالے رہتا ہے۔ آپ سے مختلف ہیں۔ اسی لیے تو ہم شہر اور سب ساتھیوں کو چھوڑ کر آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہُوئے تھے۔"

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے جن میں محبّت، وفاکیشی اور دائمی رفاقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم نے آہستہ سے کہنا شروع کیا:

"زرّیں! اَب خوف کا سایہ ہم پر کبھی مسلّط نہ ہو گا۔ ہم اب تنہا بھی نہیں، ہمیں اب شہر کے ساتھیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئیے آج سے ہم اُنہیں بُھول جائیں اور اس نظامِ جبر کو فراموش کر دیں۔ اب ہمیں مل کر ایک نئی دُنیا تعمیر کرنی ہے۔ اپنی دُنیا . . . ایک انجانی اور انوکھی دُنیا۔"

ہم چل پڑے۔ زرّیں ہمارے ساتھ شانہ بشانہ چل رہی تھیں۔ اس رفاقت میں جو سرور تھا، جو آزادی تھی، جو رشتہ تھا، وہ ہمارے اس فرار کی تخلیق تھا جو ہم نے اس نظامِ جبر کی دُنیا سے نکل کر کیا تھا۔ ہم سب زنجیریں توڑ چکے تھے اور محبّتوں اور رفاقتوں نے ہمیں خُوبصُورت پھُولوں کے ہار پہنا دیے تھے۔ ایسی مسرّت سے ہم کبھی لُطف اندوز نہیں ہُوئے تھے۔ جس سے ہم پیار کرتے تھے، وہ زرّیں ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ تھی۔ ہم دونوں کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ہم دونوں ایک ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ نئے گھر کی تخلیق کا خواب، نئی دُنیا کی تعمیر کا خواب۔

کئی دن ہم یُونہی جنگل میں چلتے رہے۔ پرندوں کا لذیذ گوشت بھُون کر پیٹ بھرتے اور ندّی کے ٹھنڈے شفّاف میٹھے پانی سے اپنی پیاس بُجھاتے۔ جنگل میں جنگلی جانور بھی موجود تھے لیکن اُنھوں نے ہمیں کچھ نہ کہا۔ ہم بھی اُنھیں یہاں کوئی تکلیف دینے کے لیے نہ آئے تھے۔ رات کو ہم سوتے، تو اپنے ارد گرد الاؤ جلا لیتے۔ جنگلی جانوروں کی آنکھیں ہمیں دکھائی دیتی تھیں مگر وہ ہمارے قریب نہ آتے۔ ہم جنگلی ندّی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک دن بلندی پر پہنچ گئے۔ تب ہم نے دُور چٹانوں اور درختوں میں گھرا ہُوا ایک گھر دیکھا۔ ہم چٹانوں جھاڑیوں اور درختوں میں راستہ بناتے اُس مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اُس میں کئی کھڑکیاں تھیں۔ اُس کی چھت فرش کی طرح ہموار تھی اور ایسی چھت ہمارے مشاہدے میں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ دیواریں مضبوط لیکن ملائم اور ہموار۔ زرّیں اور ہم نے ایک ہی لمحے میں اندازہ لگا لیا کہ یہ گھر اُس زمانے کی نشانی اور یادگار ہے جس کا ذکر ہمارے پُرانے شہر میں جُرم تھا۔ اس گھر کو درختوں اور چٹانوں نے موسموں کی سختیوں سے محفوظ رکھا تھا۔

ہم نے آگے بڑھ کر اُس کا دروازہ کھولا۔ اُس کے اندر ہم اور زرّیں ایک ساتھ داخل ہُوئے۔

وہاں ہم نے جو چیزیں دیکھیں، اُنہیں جاننے اور سمجھنے کے لیے ہمیں برسوں کی ضرورت ہے۔ اُس روز تو ہم نے اُن چیزوں کو دیکھنے ہی پر اکتفا کیا اور اندازہ لگایا کہ اس گھر میں ہمارے حساب کے مطابق دس بارہ آدمی رہے ہوں گے۔ ہمیں حیرت ہُوئی کہ انسانی تاریخ میں ایسا دَور بھی گزرا ہے جب انسان آزادی سے گھر کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور اُنہیں ہماری طرح باڑوں میں جمع نہیں کیا جاتا تھا۔ جس نظام اور شہر کو چھوڑ کر ہم یہاں پہنچے تھے، اُس شہر اور نظام میں تو ایک ہال میں سو آدمیوں سے کم سونے کی اجازت ہی نہیں تھی۔

اتنے روشن اور منوّر کمرے بھی ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ دُھوپ کی کرنوں نے کمروں کو جگمگا رکھّا تھا۔ ہر کمرے کی دیواروں کا رنگ مختلف تھا۔ کمروں میں گلوب رکھّے تھے۔ سونے کے کمرے میں دو بستر تھے۔ ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے تو اپنی زندگی میں سونے کا کوئی ایسا کمرہ دیکھا ہی نہ تھا جس میں سو بستر نہ ہوں۔ الماریوں میں کپڑے رکھّے تھے۔ زرّیں تو ان کپڑوں کو دیکھ کر اتنی خوش ہُوئی کہ ہم نے کبھی کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ طرح طرح کے رنگوں والے خُوبصُورت ملبوسات کو زرّیں بار بار چھُو کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ عالمِ خواب میں نہیں۔ ہم دوسرے کمرے میں پہنچے جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ لکڑی کے دروازے تھے اور جن میں اَن گِنت کتابیں رکھّی تھیں۔ ہم کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ہم نے اُنہیں کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ ہماری ہی زبان میں لکھی ہُوئی تھیں لیکن یہ قلمی نسخے نہ تھے۔ ہم حیران ہُوئے ایسی خُوبصُورت یکسانیت کے ساتھ پُرانے دَور کے لوگ کس طرح اتنی کتابیں لکھ لیتے تھے۔ ان کتابوں کے مطالعے کے لیے بھی برسوں کی ضرورت تھی۔ ہم نے جب سب کمروں کا معاینہ کر لیا تو ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں زرّیں ابھی تک ملبوسات کو چھُو چھُو کر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ہم اس گھر سے کبھی نہ جائیں گے۔ یہی بات ہمارے دل میں تھی۔ ہم نے کہا:

"زرّیں! ہمارا سفر ختم ہُوا۔ یہ مکان ہمارا گھر ہے۔ یہ ہم دونوں کا گھر ہے۔ اس گھر میں ہم کسی کی شراکت منظور نہیں کریں گے۔ ہم اپنی محبّت اور اپنی مسرّت میں کسی کو حصّہ دار نہ بنائیں گے۔"

"ہاں ہم ایسا ہی کریں گے۔" زرّیں نے کہا۔

ہم جنگل سے لکڑیاں لے کر آئے۔ گھر کا بڑا چُولہا اُن سے روشن کیا۔ ایک پہاڑی بکرے کا شکار کر کے اُس کا گوشت لے کر گھر پہنچے۔ وہاں گھر میں طرح طرح کے برتن تھے۔ ان میں سے ایک برتن میں ہم نے گوشت پکایا۔ یہ سارے کام اکیلے ہی کیے۔ وہاں ہم نے پہلی بار آئینہ بھی دیکھا تھا جس میں انسان اپنے پُورے وجود کا عکس دیکھ سکتا تھا۔ زرّیں اس آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ چمکدار رنگین لباس پہنے۔ وہ بار بار آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی، مُسکراتی اور شرما جاتی تھی۔

وہ رات ہم ایسے بستر پر سوئے جیسا بستر کبھی ہمارے تصوّر میں بھی نہ آیا تھا۔ نرم ملائم آرام دہ بستر، جس پر لیٹتے ہی ہم میٹھی نیند سو گئے۔

چند روز گزر گئے۔ ہم پر نئی حقیقتوں کا انکشاف ہُوا۔ ایسے اسرار سے پردہ اُٹھ گیا جن پر اس نظامِ جبر نے پردے ڈال رکھّے تھے۔ ہم نے چند روز میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔

ہم — ہم نہیں ہیں۔ بلکہ مَیں ہُوں۔ مَیں ہُوں . . .

یہ ہاتھ ہمارے نہیں، میرے ہاتھ ہیں۔ یہ رُوح میری ہے۔ یہ آسمان میرا ہے۔ یہ جنگل میرا ہے۔ یہ زمین میری ہے۔ ہم — ہم نہیں — مَیں ہُوں۔ مَیں اپنے وجود کو سمجھ چُکا ہُوں۔ ہر انسان مَیں ہوتا ہے۔ تُم ہوتا ہے۔ تُو ہوتا ہے۔ ہم نہیں ہوتا۔ مَیں، تُو اور تم کو تو نظامِ جبر کچل دیتا ہے۔ وہ مَیں کو ہم بنا دیتے ہیں۔ بڑا ظلم کرتے ہیں وہ انسان کی ذات پر۔ اس سے اُس کی شخصیّت اور صداقت چھین لیتے ہیں۔ اب مَیں اس ظلم کی حقیقت جان چکا ہُوں مَیں آزادی کا پرچم ہُوں۔ مَیں اس انکشاف کو قبول کر چکا ہُوں۔ اب مَیں — میری ذات، میری رُوح مجھے راستہ دکھاتی رہے گی۔ مَیں جان چُکا ہُوں کہ انسان کے لیے دُنیا میں آزادی کے ساتھ جبر کے بغیر مسرور رہنا ممکن ہے اور انسانی مسرّت کی کوئی حد نہیں۔ مَیں — زندہ رہنے والا، آزاد تشخّص ہے۔ اب مَیں 'ہم' نہیں بنوں گا۔ اَب مَیں آزاد رہوں گا۔ کسی نظامِ جبر کی غلامی قبول نہیں کروں گا۔

مَیں وحشی درندے 'ہم' سے آزاد ہو چُکا ہُوں۔ اَب مَیں اپنے حقیقی خدا کو پہچان سکتا ہُوں۔ اُس کے آگے سر جُھکا سکتا ہُوں جس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت گناہ ہے۔

مَیں . . . مَیں . . . مَیں . . .!!

مَیں زرّیں سے اظہارِ محبّت کرتا ہُوں۔ مَیں اُسے کہتا ہُوں۔ مَیں تم سے محبّت کرتا ہُوں زرّیں۔ تم صرف میری

ہو۔ ہم شادی کے مقدس بندھن میں منسلک ہوکر ایک ہوجائیں گے۔ تم مشترکہ ملکیت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ اپنی شخصیت رکھتی ہو۔ تم میری ہو، میں تمہارا ہوں۔ ہمارے خدا نے ہمیں ایک رشتے میں باندھ دیا ہے۔ تم میری غیرت ہو۔ تم میری عزّت اور میرے گھر کی مالکہ ہو۔"

زرّیں کا چہرہ گلنار ہوجاتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے: "کتنا گندہ، کتنا گھناؤنا تھا وہ نظامِ جبر جہاں کسی کی غیرت تھی نہ حیا... میں آپ کی بیوی ہوں آپ کی غیرت ہوں۔ آپ ہی کی رہوں گی۔ یہی میری نسائیت ہے، میری عصمت اور وفا کا تقاضا ہے۔"

میں زرّیں کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں مسرور ہوں، وہ خوش ہے، کیونکہ نظامِ جبر کی دلدل مجھے اور میرے وجود کو اپنا لقمہ نہیں بنا سکی۔

میں میں ہوں۔ میرا ایک نام ہے۔ زرّیں کا رکھا ہوا نام فاتح۔ زرّیں کا ایک نام ہے۔ مساوی ۲۵۲۱-۷ مر چکا ہے۔ لبرٹی ــــ ۰۰۰-۳-۵ محض نمبر تھے۔ میں فاتح ہوں۔ وہ زرّیں ہے۔ میرا ایک نام ہے۔ وجود ہے۔ شناخت ہے۔ زرّیں کا اپنا وجود، اپنی شناخت اور اپنا نام ہے۔ میں اور زرّیں آزاد ہیں۔ ایک سچّے رشتے میں بندھے ہونے کے باوجود آزاد ہیں۔

میرا اور زرّیں کا مستقبل سنہرا ہے۔ مجھے اور اُسے معلوم ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ میں کام کروں گا۔ گھر چلاؤں گا۔ تجربہ کروں گا۔ اس اپنے گھر میں موجود ساری کتابیں پڑھوں گا۔ زرّیں گھر سنبھالے گی۔ گھر بنائے سنوارے گی۔ جب وہ ماں بنے گی تو اُس کا بچّہ اُس سے چھینا نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ خود اُس کی پرورش کرے گی۔ وہ بچّہ ہمیشہ اُس کی اور میری آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ وہ انسان ہوگا، غلام نہیں۔

کسی دن کسی طرح سے میں چوری چھپے اس نظامِ جبر کے سائے تلے بسنے والے شہر میں داخل ہوں گا۔ اپنے دوستوں کو وہاں سے نکال کر یہاں لے آؤں گا۔ یہاں نئی دنیا آباد ہوگی۔

انسان کی تاریخ میرے ساتھ چل رہی ہے۔ آزاد انسان کی تاریخ جس نے گھر بسائے، شہر آباد کیے۔ لیکن ہم جو شہر بسائیں گے وہاں کوئی "نمبر" ہوگا نہ غلام۔ یہاں کسی نظام کی عبادت نہ ہوگی صرف خدا کی عبادت کی جائے گی جو قادرِ مطلق اور سارے جہانوں کا ربّ ہے۔

رُوحوں کا تعلق

اُنہوں نے تو منزل پالی تھی۔ جس دیش کی تمنا تھی، وہ اُنہیں مل گیا تھا، پھر بھی اُداسی طاری تھی اُن پر۔ یہ بہار اور پنجاب میں مسلمانوں کا خُون پانی کی طرح جو بہنے لگا تھا، اس نے تو اُنہیں اس نئے دیش کی خوشی منانے کی مہلت بھی نہ دی تھی۔

"دادو! میں نے آپ سے کیا پُوچھا ہے؟" اُنہیں یُوں دکھی دیکھ کر اُس لڑکے کا دل کٹنے لگا تھا۔

"بچّے! یہ مسلمانوں کا قتلِ عام جو ہو رہا ہے۔"

اُسے اُن کے تفکّر کا تھوڑا اندازہ ہُوا اور بولا: "پر آپ کیوں پریشان ہیں؟ وہ تو آپ سے اتنی دُور ہیں۔"

"یہ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے، جوان ہو جاؤ گے تو معلوم ہوگا کہ یہ روحوں کا تعلق ہے جس میں فاصلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔"

(سلمیٰ اعوان کے ناول 'تنہا' سے)

قائدِ اعظم یُونیورسٹی

نوٹس داخلہ

یونیورسٹی کی ایم بی اے / ایم پی اے کی کلاسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

ا۔ داخلے کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت:

کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے کم از کم سیکنڈ ڈویژن میں بی اے / بی ایس سی۔

اے) اینتھروپولوجی

بی اے / بی ایس سی۔

بی) بائیولوجی

اُمیدوار زوالوجی، بوٹنی، کیمسٹری، بایو کیمسٹری، مائیکرو بایولوجی اور فزیالوجی میں سے کسی بھی مجموعۂ مضامین میں بی ایس سی کی ڈگری رکھتا ہو۔

سی) بزنس ایڈمنسٹریشن / پبلک ایڈمنسٹریشن

اُمیدوار ریاضی یا اکنامکس یا پولیٹیکل سائنس یا سوشیالوجی یا نفسیات یا جغرافیہ یا فلسفے کے ساتھ بی اے، بی کام ہوں اور یا ریاضی یا فزکس، یا کیمسٹری یا بوٹنی یا زوالوجی میں سے کسی مضمون کے ساتھ بی ایس سی کی ڈگری رکھنے والے ایم بی اے / ایم پی اے میں داخلے کے اہل ہوں گے۔ اُمیدواروں نے میٹرک، انٹر، بی اے / بی ایس سی / بی کام میں سے کم از کم ایک فرسٹ ڈویژن لی ہو۔

ڈی) کیمسٹری

اُمیدوار نے بی ایس سی میں لازماً کیمسٹری پڑھی ہو۔ ایف ایس سی یا بی ایس سی میں ریاضی پڑھنے والے اُمیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

ای) کمپیوٹر

ریاضی کے ساتھ بی اے / بی ایس سی اُمیدوار داخلے کے اہل ہیں۔ اُمیدواروں نے ایف اے / ایف ایس سی، بی اے / بی ایس سی میں سے کم از کم ایک میں فرسٹ ڈویژن لی ہو۔

ایف) ڈیفنس اینڈ سٹریٹیجک سٹڈیز:

بی اے / بی ایس سی۔ بی اے کی سطح پر سوشل سائنسز پڑھنے والے اُمیدوار

(باقی اگلے صفحے پر)

کو ترجیح دی جائے گی۔

جی) عُلومِ ارضیات:

الیف ایس سی کی سطح پر ریاضی اور فزکس اور بی ایس سی کی سطح پر فزکس اور ریاضی پڑھنے والے اُمیدوار ایم ایس سی علومِ ارضیات میں داخلے کے اہل ہیں۔

ایچ) اکنامکس:

بی اے / بی ایس سی میں اکنامکس / ریاضی / شماریات پڑھنے والے اُمیدوار درخواست دینے کے اہل ہوں گے۔

آئی) الیکٹرونکس:

اُمیدواروں نے بی ایس سی میں فزکس اور ریاضی لازماً پڑھی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اُمیدواروں کی تھرڈ ڈویژن نہ ہو۔

جے) تاریخ:

بی اے / بی ایس سی۔ بی اے کی سطح پر تاریخ پڑھنے والے اُمیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

کے) بین الاقوامی تعلقات:

اُمیدواروں نے بی اے / بی ایس سی میں بین الاقوامی تعلقات، علمِ سیاسیات، تاریخ، اقتصادیات، سوشیالوجی، نفسیات، فلسفے، صحافت یا جغرافیے میں سے کوئی مضمون اختیاری طور پر لازماً پڑھا ہو۔ بی اے / بی ایس سی کی سطح پر بین الاقوامی تعلقات یا علمِ سیاسیات پڑھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ایل) ریاضی

بی اے / بی ایس سی میں اُمیدواروں نے ریاضی۔ اے کورس اور ریاضی۔ بی کورس یا جنرل ریاضی کے ساتھ فزکس پڑھی ہو یا اس کے مساوی کورسز کیے ہوں۔

ایم) مطالعۂ پاکستان

بی اے / بی / ایس سی

این) فزکس:

اُمیدواروں نے بی ایس سی میں ریاضی اور فزکس لازمی طور پر پڑھی ہو۔

۲۔ محفوظ نشستیں

(۱) ملک کے تمام علاقوں کے لیے نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔

(باقی اگلے صفحے پر)

(۲) یونیورسٹی بلا اظہارِ وجوہ کسی کو بھی داخلہ دینے سے انکار کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

۳۔ درخواستیں داخل کرنا

(۱) درخواستیں جن کی تقویت کے لیے تعلیمی اسناد، کریکٹر، ڈومیسائل، مائیگریشن (اہل نوادبجیکشن سرٹیفکیٹ (برسرِ ملازمت اُمیدواروں کے لیے) کی مُصدقہ فوٹوسٹیٹ نقول کے علاوہ تین پاسپورٹ تصاویر بھی ہمراہ ہوں، متعلقہ شعبے کے چیئرمین کو ۸/۱۲/۸۶ تک پہنچ جائیں۔

(۲) ایسے امیدوار جو بی اے / بی ایس سی کا نتیجہ درخواست کے ساتھ شامل نہ کر سکے ہوں، اگر وہ ۱۹۸۶ / ۱۲ / ۱۰ تک یہ نتیجہ ساتھ نہیں لائیں گے تو اُنہیں داخلے کے ٹیسٹ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(۳) ۲۶ سال سے زائد عمر کے کسی فرد کو داخلہ نہیں دیا جائے گا جب تک متعلقہ چیئرمین کی تجویز پر وائس چانسلر عمر کی حد میں رعایت نہ دیں۔

(۴) داخلے کے مجوّزہ فارمز یونیورسٹی کے شعبۂ داخلہ سے یا خزانچی، قائدِ اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کے حق میں -/۳۰ روپے کے کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ساتھ اپنا پتہ لکھا اور ٹکٹ لگا ہوا لفافہ بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(۵) بعد از وقت / نامکمل درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ ٹیسٹ کا شیڈول

(I) بدھ۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۔ بزنس ایڈمنسٹریشن / پبلک ایڈمنسٹریشن۔	۰۰۔۱۰ بجے قبل از دوپہر تا ۰۰۔۱۱ بجے قبل از دوپہر
۲۔ الیکٹرونکس۔	۳۰۔۲ بجے بعد از دوپہر تا ۳۰۔۳ بجے بعد از دوپہر

(II) جمعرات۔ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۸۶ء

۳۔ ریاضی۔	۳۰۔۹ بجے قبل از دوپہر تا ۰۰۔۱۱ بجے قبل از دوپہر
۴۔ کمپیوٹر سائنسز۔	۳۰۔۱۱ بجے 〃 〃 تا ۰۰۔۱ بجے بعد از دوپہر
۵۔ کیمسٹری۔	۳۰۔۱ بجے بعد از دوپہر تا ۰۰۔۳ بجے 〃 〃
۶۔ ڈیفنس اینڈ سٹریٹیجک سٹڈیز۔	۰۰۔۱۰ بجے قبل از دوپہر تا ۰۰۔۱۱ بجے قبل از دوپہر

(باقی اگلے صفحے پر)

۷ - اینتھروپولوجی — ۳۰ - ۱۱ بجے قبل از دوپہر تا ۳۰-۱۲ بجے بعد از دوپہر
۸ - تاریخ — ۳۰ - ۲ بجے بعد از دوپہر تا ۳۰-۳ 〃 〃 〃 〃

(III) ہفتہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۶ء

۹ - بایولوجی — ۳۰-۹ بجے قبل از دوپہر تا ۰۰-۱۱ بجے قبل از دوپہر
۱۰ - فزکس — ۳۰-۱۱ 〃 〃 〃 〃 تا ۰۰-۱ بجے بعد از دوپہر
۱۱ - علومِ ارضیات — ۳۰-۲ بجے بعد از دوپہر تا ۳۰-۳ 〃 〃 〃 〃
۱۲ - بین الاقوامی تعلقات — ۰۰-۱۰ بجے قبل از دوپہر تا ۰۰-۱۱ بجے قبل از دوپہر
۱۳ - اکنامکس — ۳۰-۱۱ 〃 〃 〃 〃 تا ۳۰-۱۲ بجے بعد از دوپہر
۱۴ - مطالعہ پاکستان — ۳۰-۲ بجے بعد از دوپہر تا ۳۰-۳ 〃 〃 〃 〃

۵ - انٹرویو کے شیڈول سے متعلقہ شعبے ٹیسٹ کی تاریخ کو آگاہ کر دیں گے ۔ منتخب امیدواروں کی فہرست ۱۹۸۶ - ۱۲ - ۲۲ کو متعلقہ شعبوں کے نوٹس بورڈز پر لگا دی جائے گی ۔ منتخب اُمیدواروں کو داخلے کے خطوط جاری نہیں کیے جائیں گے ۔ جو اُمیدوار سلیکشن نوٹس میں دی گئی تاریخ تک اپنے واجبات جمع نہیں کرائیں گے ، وہ اپنے داخلے کے حق سے محروم ہو جائیں گے ۔

۶ - خالی جگہوں کی ثانوی فہرست ۱۹۸۷ - ۱ - ۴ کو لگا دی جائے گی ۔

۷ - مستحق اُمیدواروں کے لیے میرٹ سکالرشپس کی ایک محدود تعداد موجود ہے ۔

۸ - یونیورسٹی ہوسٹل میں ایک محدود تعداد میں جگہ موجود ہے جو راولپنڈی / اسلام آباد میں مقیم اُمیدواروں کو چھوڑ کر میرٹ کی بنیاد پر الاٹ کی جائے گی ۔

دستخط

(اسلم فاروق بٹ)

رجسٹرار

قائدِ اعظم یونیورسٹی ، اسلام آباد

پی آئی ڈی (اسلام آباد) ۲۲۱۲/۱۳

تعارف و تبصرہ کتب

تیس پروانے شمعِ رسالت کے

تیسرا ایڈیشن

مصنف : طالب ہاشمی
ضخامت : ۵۱۰ صفحات ، قیمت : ۶۰ روپے
ملنے کا پتہ : البدر پبلی کیشنز ، اردو بازار ، لاہور

یہ گرانقدر کتاب جن تیس عظیم المرتبت اور پاکباز ہستیوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے ، اُن کی عظمت و رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود خدائے عز و جل قرآن مجید میں ان کے سیرت و کردار کے متعلق ان الفاظ میں شہادت دیتا ہے :

" محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب دیکھو گے اُنہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے ۔ سجود کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ، اللہ نے اُن سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے ۔ " (الفتح)

کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مقدمہ اُردو کے بے مثل ادیب ، نقاد اور شاعر ماہر القادری نے اپنی وفات سے چوبیس دن پہلے تحریر کیا تھا ۔ طالب ہاشمی کے طرزِ بیان ، اسلوبِ تحریر اور نفاست و سلاستِ نگارش کے متعلق ماہر صاحب کی ماہرانہ ، عالمانہ اور نقادانہ رائے کے بعد کچھ اور عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدس حالات اور جناب طالب ہاشمی کا خامہ عنبر شمامہ اور قلمِ حقیقت رقم ، ہر صفحہ ایمان و یقین کی پھلواری بن گیا جس کے مطالعہ سے قاری کا مشامِ جاں معطر ہو جائے ۔ محسوس یہ ہُوا کہ گلستاں میں آ گئے ۔ "

'تیس پروانے شمع رسالت کے' اُردو ادب میں نہایت بلند پایہ اور قابلِ قدر کتاب ہے جو شروع سے آخر تک افادیت سے پُر ہے ۔ جس میں عبادات و معاملات بھی ہیں حکمت و اخلاق بھی ہے اور جہاد و سرفروشی کا رُوح پرور اور ایمان افروز پیغام بھی ۔ طالب ہاشمی صاحب نے تمام تاریخی واقعات بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد درج کیے ہیں ۔ حاشیے میں ہر واقعے کا حوالہ بھی درج کیا جاتا تو اس علمی کتاب کی حیثیت و افادیت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ۔ کتابت و طباعت معیاری ہے ۔ (حافظ افروغ حسن)

● کتاب : رنگ ، خوشبو ، کانٹے
مصنف : افشاں عباسی
ملنے کا پتہ : ماڈرن بک ڈپو ، آبپارہ ، اسلام آباد
صفحات : ۱۴۴ قیمت : ۳۰ روپے

یہ افشاں صاحبہ کے بیس مختصر افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے ۔ اُنہوں نے اپنے دل کی بات قاری تک پہنچانے کی خاطر مختصر افسانے کی صنف منتخب کی ہے ، کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ آج کا مصروف انسان لمبی لمبی کہانیاں پڑھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا ۔ وہ ایسے روزمرہ واقعات و حالات کا چُناؤ کرتی ہیں جنہیں ہم اپنے ماحول میں

روز دیکھتے اور سُنتے ہیں۔ کرداروں کی زبان بھی وہی ہے جو ہم بولتے، سُنتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ افسانویت کا ایسا سحر آفریں سماں پیدا کر دیتی ہیں کہ پڑھنے والا اُس میں گُم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جب کہانی ڈرامائی انداز سے اپنے انجام کو پہنچتی ہے تو وہ ایک دم چونک پڑتا ہے۔ گویا اُسے ابھی اس کے انجام پذیر ہونے کی توقع نہ تھی لیکن فوراً اُس کا ذہن اور اُس کا دل پکار اُٹھتا ہے کہ اس واقعے کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔

ماحول کی حقیقی عکاسی اور طرزِ بیان کی سادگی، روانی اور شوخی نے ان کہانیوں میں چاشنی اور مٹھاس پیدا کر دی ہے جس سے پڑھنے والا اُکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ افسانے تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ اعلیٰ و ارفع مقصد کے ابلاغ کا مؤثر وسیلہ بھی ہیں۔ اور یہ مقصد ہے ''اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار کا دلوں میں احترام''۔

(حافظ افروغ حسن)

● 'پیامی' ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸۶ء (تین شمارے)

قیمت فی شمارہ : دس روپے

پتہ : ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد سنٹر ناظم آباد، کراچی نمبر ۱۸۔

یونیسکو کے جریدہ 'کوریئر' کا اُردو ایڈیشن 'پیامی'، ہمدرد فاؤنڈیشن کے بانی حکیم محمد سعید کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ پرچہ کاشفِ حالاتِ جہاں ہے۔ 'پیامی' باتصویر رسالہ ہے اور عمدہ کاغذ پر اس کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔

ستمبر ۱۹۸۶ء کا 'پیامی' زمین کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اس پرچے میں زمین کی پیدائش، اہم اعداد و شمار، اندرونِ زمین، نظامِ شمسی میں ہمارا مقام، برِاعظم سرکتے رہتے ہیں، چٹانیں عہد بہ عہد، طبقات الارض اور وقت کا تصور، زمین کی صورت گری، چٹانوں کی اقسام، برما اور نامعلوم گہرائی تک، بے چین زمین، زلزلے کی یقینی پیش گوئی کا غیر یقینی فن، آتش فشاں، زندگی کا ارتقا، زندگی خلا سے آتی ہے، کیا کرۂ ارض پر زندگی کا آغاز دُم دار تاروں سے ہُوا، زیستِ انسان، ۱۹۸۶ء سالِ امن، رواں دواں ہے زندگی، میکسیکو: امدادی کام، جیسے عنوانات کے تحت بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دانوں کے معلومات افزا مضامین ہیں۔

'تیار چے' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''سورج وہ نیوکلیئر بھٹی ہے جس میں ہائیڈروجن کے ہیلیم میں تبدیل ہونے سے زبردست توانائی نکلتی ہے۔ یہ نظامِ شمسی کا مرکزی ستارہ ہے جو اس کی مجموعی کمیت کے ۹۹ فیصد پر مشتمل ہے۔ سورج کا اوسط سطحی درجۂ حرارت ۵۵۰۰ درجے سنٹی گریڈ اور قلب کا درجۂ حرارت ۱۷ ملین درجے سنٹی گریڈ ہے۔ اس کا قطر ۱٫۳۹ ملین کیلومیٹر اور زمین سے فاصلہ ۱۵۰ ملین کیلومیٹر ہے۔''

اکتوبر ۱۹۸۶ء کا پرچہ 'بین الاقوامی سالِ امن' سے متعلق ہے۔ اس میں امن، ترکِ اسلحہ، ایٹمی خطرہ، انصاف، عالمی فوجی اخراجات، دُنیا میں تشدد اور عوامی جمہوریہ چین جیسے موضوعات پر اہلِ علم نے خامہ فرسائی کی ہے۔

ایک اقتباس: ''ترقی پذیر دُنیا میں ۸۰۰ ملین انسان عُسرت اور محرومی کی حالت میں رہ رہے ہیں اور ۵۰۰ ملین نقصِ تغذیہ کا شکار ہیں۔ لاکھوں کو صاف پینے کا پانی میسر نہیں اور غذا کی خریداری کے لیے ضروری آمدنی سے محروم ہیں۔ ماحول خرابیوں اور قدرتی آفات سے محفوظ نہیں جیسے خاص طور پر افریقہ میں۔ ان کے نتیجے میں ایسا قحط اور مصائب کا سیلاب اُمڈ آیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔''

نومبر ۸۶ء کے 'پیامی' میں بارہویں صدی کے دو عظیم عقلا ابنِ رُشد اور موسیٰ ابنِ میمون پر محمد علال سناسر اور احمد مختار امبو کے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔

اندلس کا دارالحکومت قرطبہ بقول اداریہ نگار تاریخِ ثقافت کا ایک شاندار باب تھا۔ اس نے اسلامی اسپین کی تہذیب کا عروج دیکھا تھا۔ تیرہویں صدی کے آغاز تک یہ شہر یورپ میں سب سے زیادہ گنجان آباد، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ مہذب شہر تھا۔ اس کی شان و شوکت کا ثبوت جامعہ قرطبہ ہے جو ہم تک صحیح سالم پہنچی ہے لیکن قرطبہ اور اندلس کی وجہِ افتخار اس کی فکری تخلیق تھی۔ جنوبی یورپ کے اس خطے میں ایسے ایسے عظیم ذہن اُبھرے جن سے جدید فکر اور جدید ادب متاثر ہوا۔ اُن میں ابنِ عربی، ابنِ زہر، ابنِ باجہ، ابوالقاسم زہراوی، ابنِ حزم اور سب سے بڑھ کر ابنِ رُشد اور موسیٰ ابنِ میمون نمایاں ہیں۔

(اخلاق احمد دہلوی)

● کتاب : تحریکِ پاکستان بلوچستان میں۔

مصنّف : ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔

ناشر : مکتبہ عالیہ، اُردو بازار، لاہور۔

صفحات : ۱۹۲، قیمت ۳۵ روپے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر صاحب نے بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی مستند اور قابلِ اعتماد تاریخ مرتب کر کے قوم کے نوجوانوں کے لیے ایک تازہ ولولے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ یہ اُس خطے کی داستان ہے جسے برطانوی سامراج نے اپنی دفاعی مصلحتوں کی خاطر ہر قسم کی اصلاحات اور بُنیادی حقوق سے محروم رکھا ہوا تھا۔ یہاں کے عوام رائے دہی کے حق سے آشنا تھے نہ تحریر و تقریر، اجتماع اور جماعت سازی کی آزادی سے واقف۔ اٹھانوے فی صد مسلم اکثریت کا یہ صوبہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے نہایت ہی پسماندہ تھا۔ یہاں کسی جماعت کا منظم ہونا اور صوبے کے عوام سے رابطہ قائم کر کے انہیں کسی ملی تحریک کے لیے آمادۂ عمل کرنا بے حد کٹھن کام تھا۔

۱۹۳۹ء میں بلوچستان مسلم لیگ قائم ہوئی۔ یہ جماعت تھوڑے ہی عرصے میں نوابزادہ یوسف علی خاں عزیز، اخوندزادہ عبدالعلی خاں، میر جعفر خاں جمالی اور محمد خاں جوگیزئی جیسے بااثر اور مخلص رہنماؤں کے تعاون سے پُورے صوبے کے مسلمانوں کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا مرکز بن گئی۔ انگریز کے استبداد اور ہندو کی عیارانہ سازشوں کے باوجود مسلمان اپنے نصب العین، پاکستان کے حصول کی خاطر اسلامی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر میدان میں نکل آئے۔ قبائلی عصبیتوں کی جگہ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی نسیمِ سحری چلنے لگی۔ اور یہ مسلمانانِ برِصغیر کے ایمان و یقین اور اتحاد و تنظیم ہی کی طاقت تھی جس کی بدولت نقشۂ عالم پر سب سے بڑی اسلامی مملکت نمودار ہوئی۔

ڈاکٹر کوثر صاحب نے حوصلوں میں زندگی اور حرارت پیدا کرنے والی یہ تحریکی داستان بڑی ہی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی ہے۔ برسوں کے اخبارات اور رسائل و جرائد کی فائلیں چھان ڈالی ہیں۔ اس طرح انہوں نے برِصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور روشن باب محفوظ کر دیا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے لیے مسلمانوں میں یہ انقلاب آفریں اور تاریخ ساز جوش و خروش کس چیز نے پیدا کیا، اس کا جواب قاضی عیسیٰ صاحب کے درجِ ذیل الفاظ ہیں:

''مسلمان کی حیثیت سے ہمارے دینی اور دنیوی، مذہبی اور سیاسی نصب العین اور پروگرام کا ماخذ قرآنِ مجید اور اس کی جامع تعلیمات ہیں۔''

طباعت و کتابت عمدہ اور معیاری ہے۔ جلد کا ٹائیٹل تین رنگوں میں نہایت ہی خوبصورت تیار کیا گیا ہے۔

(حافظ افروغ حسن)

● کتاب : حجابِ نسواں۔

مصنّف : الاستاذ مظہر علی ادیب۔

پتہ : مکتبہ التسفیر، قذافی مارکیٹ۔ اُردو بازار لاہور۔

صفحات : ۱۱۲۔ قیمت : آٹھ روپے۔

مظہر علی ادیب صاحب کی یہ تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے موصوف کی دو کتابیں 'خاتونِ خانہ' اور 'چادر اور چار دیواری' شائع ہو چکی ہیں۔ مصنّف اپنے موضوع پر پُوری طرح حاوی ہیں۔ اس کتاب میں خواتین کی شرعی حیثیت اور اسلام میں خواتین کا مقام کے موضوع پر موصوف نے بہت مُدلّل اور مفصل بحث کی ہے اور اپنے مطالعے کی روشنی میں عورتوں کے پردے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اگر فعّال اصحاب اسے جدید اور مغرب زدہ خواتین تک پہنچانے کا اہتمام کریں تو اُمید ہے وہ بھی شرعی پردے کی قائل ہو جائیں گی۔ کتابت و طباعت جس معیار کی ہونی چاہیے تھی وہ تو نہیں پھر بھی قارئین کے لیے اس کا مطالعہ از اوّل تا آخر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(اخلاق احمد دہلوی) ■■

پاکستان ریلویز

ٹنڈر نوٹس

۲×۲۰ً اور ۳×۳۰ً کے ذریعے پانڈو کی آؤٹ فال ڈرین کی سپل پاک پتن قصور سیکشن پر ۶-۵/۳۳۳ کلومیٹر پر گنڈر برج نمبر ۱۸۱ کی تہہ کو مضبوط بنانا اور ٹریننگ ورکس کے لیے ٹنڈر مطلوب ہیں۔ کام پر لاگت کا تخمینہ دس لاکھ روپے، زرِ بیعانہ بیس ہزار روپے اور تکمیل کی مُدت تین ماہ ہے۔ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ پاکستان ریلویز نے یہ ٹنڈر اُن اے کلاس ٹھیکیداروں سے طلب کیے ہیں جن کا تعلق اِسی ڈویژن سے ہے۔ ٹنڈر دستاویزات ایک ہزار روپے کی قیمت پر ورکس اکاؤنٹس سیکشن آف ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ پاکستان ریلویز آفس لاہور سے کام کے اوقات کے دوران ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۶ء تک دستیاب ہیں۔ ٹنڈر ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو ساڑھے بارہ بجے تک وصول کیے اور اُسی دن اور وقت ٹھیکیداروں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔

دستخط

برائے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ
پاکستان ریلویز لاہور

پی آئی ڈی (لاہور) ۲۳۰۲

ٹنڈر نوٹس

۱ بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ اُن ٹھیکیداروں سے جو سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے اپنی اندراج/تجدید فیس جمع کرا چکے ہوں سٹینڈنگ ریٹس کمیٹی کی ٹنڈر وصول ہونے کی تاریخ تک جاری کردہ ترامیم کے ساتھ کمپوزٹ شیڈول آف ریٹس ۱۹۷۹ء کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کاموں کے لیے فیصد/آئٹم ریٹ ٹنڈرز مطلوب ہیں۔

۲ ٹنڈر فارمز ٹنڈر کھلنے کی تاریخ سے ایک دن پہلے معمول کے مطابق نقد ادائیگی پر ہیڈ کلرک کے ذریعے جاری کیے جائیں گے۔

۳ ٹنڈرز ۱۹۸۶-۱۲-۹ر کو ۱۲.۰۰ بجے دوپہر موجود رہنے کے خواہشمند ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے۔

۴ زرِ ضمانت کے بغیر ٹنڈرز جاری نہیں کیے جائیں گے۔

۵ زیرِ دستخطی بلا اظہارِ وجوہ وصول ہونے والے ٹنڈرز میں سے کسی بھی یا تمام ٹنڈرز کو مسترد کر دینے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

۶ مفصل شرائط و ضوابط کسی بھی یوم کار میں دفتری اوقات میں زیرِ دستخطی کے دفتر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرِ ضمانت	میعاد
۱	میو ہسپتال لاہور میں انٹرنیس ہوسٹل کی تعمیر			
	(۱) گروپ نمبر ۱	۴۲,۳۵,۰۰۰/=	۸۵,۰۰۰/=	ایک سال
	(۲) گروپ نمبر ۲	۴۴,۳۱,۰۰۰/=	۹۰,۰۰۰/=	" "

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

فرسٹ میڈیکل پراونشل بلڈنگز ڈویژن۔ لاہور

آئی پی ایل-۹۸۷۹

نوٹس طلبی ٹنڈر

بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ ان ٹھیکیداروں سے جو مالی سال ۸۷ - ۱۹۸۶ء کے لیے اپنے ناموں کی تجدید کرا چکے ہوں۔ سٹینڈنگ ریٹس کمیٹی کی ٹنڈر وصول کرنے کی تاریخ تک جاری کردہ ترامیم کے ساتھ کمپوزٹ شیڈول آف ریٹس ۱۹۷۹ء کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کاموں کے لیے سربمہر فیصد / آئٹم ریٹ ٹنڈرز مطلوب ہیں۔ ٹنڈرز زیرِ دستخطی کے ہاتھوں ۸۶ - ۱۲ - ۴ کو ۰۰ - ۱۱ بجے قبل دوپہر وصول اور موجود رہنے کے خواہشمند ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے۔

۲ بذریعہ تار ٹنڈرز، مشروط ٹنڈرز اور زرِ ضمانت کے بغیر آنے والے ٹنڈرز پر غور نہیں کیا جائے گا۔ زرِ ضمانت ڈیپازٹ ایٹ کال کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔

۳ شرائط و ضوابط اور دیگر معلومات زیرِ دستخطی کے دفتر میں تمام ایامِ کار میں دفتری اوقات کے دوران دیکھی اور حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۴ سادہ ٹنڈر فارم اور اضافی شرائط نوٹس کی اشاعت کے بعد سے لے کر ٹنڈرز کھلنے کی تاریخ سے ایک دن پہلے تک تمام ایامِ کار میں دفتری اوقات کے دوران جاری کیے جائیں گے۔

۵ فرم یا کمپنی کی صورت میں موزوں جوڈیشل پیپرز پر مختار نامہ ٹنڈر کے ہمراہ ہو۔

۶ زیرِ دستخطی کو کسی بھی یا تمام ٹنڈرز کو وجہ بتائے بغیر مسترد کرنے کا حق حاصل ہے۔

نمبر شمار	کام کا نام	اندازاً مالیت	زرِ ضمانت	میعاد
۱	پنجاب کے ہائی سکولوں میں چھٹی اور ساتویں کلاسوں کا اجراء۔ ایضاً۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سوہاوہ ضلع جہلم	۱۶٫۳۱ لاکھ روپے	۳۲٫۶۲۰ روپے	ایک سال
۲	پنجاب میں چار سو بنیادی مراکزِ صحت کے درجے میں اضافہ۔ (نئی سکیم) بنیادی مرکزِ صحت ُسنا تھا۔	۴٫۰۰ لاکھ روپے	۸٫۰۰۰ روپے	چار ماہ

دستخط
ایگزیکٹو انجینئر
پراونشل بلڈنگ ڈویژن جہلم

آئی پی ایل - ۹۸۵۱

نوٹس طلبی ٹنڈر

۱۔ مندرجہ ذیل کاموں کے لیے حکومت کے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جنہوں نے سال ۸۷ - ۱۹۸۶ء کے لیے اپنے ناموں کا اندراج یا تجدید کرالی ہو، بلڈنگ پورشن، واٹر سپلائی اور سیوریج کے لیے ٹنڈر کھلنے کی تاریخ تک ۱۹۷۹ء کے کمپوزٹ شیڈول آف ریٹس کی بنیاد پر سربمہر فیصد / آئٹم ریٹس ٹنڈر مطلوب ہیں۔ ٹنڈر دی ہوئی تاریخ کو ایک بجے بعد دوپہر ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے جو وہاں موجود ہوں گے، کھولے جائیں گے۔

۲۔ ٹنڈر بذریعہ ٹیلیفون یا زرِ ضمانت کے بغیر مشروط ٹنڈر قبول نہیں کیے جائیں گے۔ زرِ ضمانت ڈیپازٹ ایٹ کال کی شکل میں ہونا چاہیے۔

۳۔ شرائط و ضوابط یا دیگر تفصیلات زیرِ دستخطی کے دفتر میں کسی بھی یومِ کار اور دفتری اوقات کے دوران میں دیکھی یا حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۴۔ زیرِ دستخطی کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایک یا تمام ٹنڈر وجہ بتائے بغیر مسترد کر دے۔

نمبر شمار	نام کام	لاگت کا تخمینہ	زرِ ضمانت	متعینہ وقت	ٹنڈر کھلنے کی تاریخ
۱	**راولپنڈی میڈیکل کالج راولپنڈی میں سٹاف کالونی کی تعمیر۔**	روپے	روپے		
(i)	سوئی گیس (انٹرنل) پائپ لائن کی فراہمی۔	۶٫۰۰ لاکھ	۱۲٫۰۰۰/-	۲ ماہ	۳/۱۲/۸۶
(ii)	سوئی گیس (ہائی پریشر) کی فراہمی۔	۶٫۴۰ لاکھ	۱۲٫۸۰۰/-	۲ ماہ	〃
(iii)	ایکسٹرنل سیوریج سسٹم۔	۲۸٫۷۷ لاکھ	۵۷٫۵۴۰	۳½ ماہ	۱۴/۱۲/۸۶
(iv)	ایکسٹرنل واٹر سپلائی۔	۱۴٫۹۵ لاکھ	۲۹٫۹۰۰	۳ ماہ	۱۴/۱۲/۸۶

(باقی اگلے صفحے پر)

(۷)	ایکسٹرنل ڈویلپمنٹ سٹریٹ لائٹ	۱٫۵۴ لاکھ	۳,۰۸۰	۳ ماہ	۷/۱۲/۸۶
۲-	پنجاب میں گرلز مڈل سکولوں کی ہائی سٹینڈرڈ تک اپ گریڈیشن				
(i)	میانہ موہرا راولپنڈی۔	۴٫۴۱ لاکھ	۸,۸۲۰	۴ ماہ	۸/۱۲/۸۶
(ii)	پنجاڑ تحصیل کہوٹہ۔	۴٫۵۰ لاکھ	۹,۰۰۰	〃	〃
۳-	پنجاب میں بوائز مڈل سکولوں کی ہائی سٹینڈرڈ تک اپ گریڈیشن				
(i)	بوُر کہوٹہ۔	۴٫۵۰ لاکھ	۹,۰۰۰	۴ ماہ	۸/۱۲/۸۶
(ii)	باغ کمیرے (کہوٹہ)	۴٫۵۰ لاکھ	۹,۰۰۰	〃	〃
(iii)	بروٹی کہوٹہ۔	۴٫۵۰ لاکھ	۹,۰۰۰	〃	〃
(iv)	سالبمار کہوٹہ۔	۴٫۵۰ لاکھ	۹,۰۰۰	〃	〃
۴-	راولپنڈی میں لاہور ہائیکورٹ بنچ بلڈنگ کی تعمیر۔ (ریذیڈنشل زنان ریذیڈنشل بلڈنگ آئی سی سروسز (بقیہ کام جو سابق ٹھیکیدار کے ذمے تھا) کی تعمیر)	۲۷٫۰۰ لاکھ	۵۴,۰۰۰	۴ ماہ	۸/۱۲/۸۶
۵	۸۷-۸۶ء کے دوران میں پنجاب کے ۵۰ دیہی صحت مراکز کی اپ گریڈیشن کے سلسلے میں دولتالہ ضلع راولپنڈی میں دیہی صحت مرکز کی اپ گریڈیشن۔	۱۹٫۵۰ لاکھ	۳۹,۰۰۰	۹ ماہ	۱۲/۱۲/۸۶

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

سیکنڈ پروونشل بلڈنگ ڈویژن ، راولپنڈی

آئی پی ایل: ۴۷۹۰

ٹنڈر نوٹس

۱۔ صوبہ سرحد کی پولیس ۸۸ سے ۱۷۴ میگا ہرٹز کے اونچے بینڈ پر کام کرنے والے ۵ عدد وی ایچ ایف وائرلیس ریپٹرز خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے، یہ ریپیٹرز صوبے میں پہلے سے موجود ۸۱ میگا ہرٹز کے درمیانی بینڈ پر کام کرنے والے ۲۳۶ عدد وی ایچ ایف سٹیٹک، موبائل اور دستی سمپلیکس آپریشن سیٹس کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

۲۔ موجودہ ۲۳۶ عدد سیٹس کے لیے کرسٹلز اور بینڈز کی فراہمی کے علاوہ ان اضافی بینڈز اور کرسٹلز کی تنصیب بھی درکار ہے تاکہ یہ نئے ریپیٹرز کے ساتھ مل کر کام کر سکیں۔

۳۔ متعلقہ فرمز سے گزارش ہے کہ زیر دستخطی کے نام پر ان کی پیشکش زیادہ سے زیادہ ۸۶-۱۲-۱۳ تک پہنچ جائیں۔ پیشکشوں کے ساتھ مطلوبہ ریپیٹرز کی قیمت کے ساتھ مجوزہ بینڈز اور کرسٹلز کی قیمت اور ان کی تنصیب کے اخراجات درج ہوں اور یہ علیحدہ علیحدہ سی اینڈ ایف پشاور اور ایف او آر پشاور کی بنیاد پر ہوں۔

۴۔ مطلوبہ بینڈز اور کرسٹلز کے ساتھ سیٹس کی فراہمی کی میعاد اور ان کی تنصیب کی میعاد بھی درج کی جائے۔ پیشکشوں کے ہمراہ مجوزہ ریپیٹرز کے متعلق لٹریچر/ پمفلٹس اور بروشرز بھی ہوں۔

دستخط

(سید ارشاد حسین)

اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل آف پولیس

ٹیلی کمیونیکیشنز ، صوبہ سرحد پشاور

آئی این ایف (پی) ۳۱۱۷

ٹنڈر نوٹس

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے منظور شدہ موزوں کیٹیگری کے ٹھیکیداروں سے مندرجہ ذیل کاموں کے لیے بی۔ ا فارمز پر فیصد سربمہر ٹنڈرز مطلوب ہیں۔

ا۔ٹنڈر فارمز ۸۶-۱۲-۱۶ کو ۲۰۰۰ بجے بعد دوپہر تک زیر دستخطی کے دفتر سے نیچے دی گئی رقم ادا کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں ٹنڈرز ۸۶-۱۲-۱۷ کو ۱۰۰ بجے بعد دوپہر تک وصول کیے اور اسی دن ۳۰۔ ا بجے بعد دوپہر لیکن زیر دستخطی کے ہیڈ کوارٹرز سے باہر ہونے کی صورت میں دوسرے دن موجود رہنے کے خواہشمند ٹھیکیداروں کے سامنے کھولے جائیں گے۔

۲۔نیچے درج کی گئی زرِ ضمانت کی رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی جائے اور وصولی کا چالان خزانہ ٹنڈر کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ زرِ ضمانت کے بغیر کوئی ٹنڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔ چیک یا کیش کی شکل میں زرِ ضمانت کسی ٹنڈر کے ہمراہ ہو گی تو اُسے مسترد کر دیا جائے گا۔ پاکستان کے کسی بھی شیڈولڈ بنک کا کال ڈیپازٹ قبول کیا جائے گا۔ مشروط ٹنڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ ٹنڈر فارم صرف اُن ٹھیکیداروں کو جاری کیے جائیں گے جو زرِ ضمانت پہلے ہی جمع کرا چکے ہوں گے۔ کسی بھی ٹھیکیدار کو اپنا ٹنڈر واپس لینے کی اجازت نہ ہوگی ورنہ اُس کا زرِ ضمانت ضبط کر لیا جائے گا۔

۴۔ ٹنڈر منظور کرنے کی مجاز اتھارٹی بلا اظہارِ وجوہ کسی بھی یا تمام ٹنڈرز کو مسترد کر دینے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

۵۔ ٹنڈرز صرف اُن ٹھیکیداروں کو جاری کیے جائیں گے جو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اپنا رجسٹریشن سرٹیفکیٹ پیش کریں گے۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرِ ضمانت	ٹنڈر فیس	کام مکمل کرنے کی میعاد	ٹنڈر کی کیٹیگری
ا	عمرکوٹ ڈرینج سکیم (اربن) کے لیے ڈسپوزل ورک سے فیلڈز تک ۱۰" قطر کے اے سی پریشر پائپ / بی رائزنگ مین کی فراہمی، اسے جوڑنا اور ٹیسٹنگ۔	۳،۷۴،۵۵۰/-	۷،۴۹۱/-	۲۵۰/-	۶ ماہ	بی۔ I

ایگزیکٹو انجینئر

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈویژن میرپور خاص

آئی این ایف کے اردو/۵۱۰۶

نوٹس طلبی ٹنڈر

محکمہ تعمیرات کے سرکاری منظور شدہ ٹھیکیداروں سے مندرجہ ذیل کاموں کے لیے بی ون اور بی ٹو فارموں پر سربمہر ٹنڈر مطلوب ہیں۔

خالی ٹنڈر فارم مطلوبہ زرِ ضمانت کا کال ڈیپازٹ پیش کرنے پر ۸۶-۱۲-۲۲ کے اڑھائی بجے سہ پہر تک جاری کیے جائیں گے۔ ہر کام کے زرِ ضمانت کا کال ڈیپازٹ ایگزیکٹو انجینئر پراونشل بلڈنگ ڈویژن نمبر ۴ کراچی یا حیدر آباد کے نام ہونا چاہیے۔ ٹنڈر ۸۶-۱۲-۲۳ کے ایک بجے سہ پہر تک وصول کیے جائیں گے اور اُسی تاریخ کو ۲ بجے سہ پہر کھولے جائیں گے جو ٹھیکیدار اپنا ٹنڈر واپس لے گا یا اُس میں ترمیم کرے گا یا مقررہ تاریخ اور وقت تک ٹنڈر بکس میں ٹنڈر نہیں ڈالے گا، اُس کا زرِ ضمانت حکومت کے حق میں ضبط کر لیا جائے گا۔

مشروط ٹنڈر قبول نہیں کیے جائیں گے۔

افسر مجاز کو حق حاصل ہو گا کہ کوئی ایک یا تمام ٹنڈر وجہ بتائے بغیر مسترد کر دے

نمبر شمار	کام کی نوعیت	لاگت کا تخمینہ	زرِ ضمانت	تکمیل کی مدت	ٹنڈر فیس
ا	پیونگ سٹریٹ نیو وحدت کالونی حیدر آباد کی بحالی و مرمت	۲۵،۰۰۰/- روپے	۵۰۰/- روپے	۲ ماہ	۱۰۰ روپے
۲	ایچ ٹائپ کوارٹرز ۱۵ نمبر نیو وحدت کالونی حیدر آباد کی بحالی و مرمت	// ۲۰،۰۰۰/-	// ۴۰۰/-	//	//
۳	ایچ ایس آر کوارٹرز نیو وحدت کالونی حیدر آباد کی بحالی و مرمت	// ۲۰،۰۰۰/-	// ۴۰۰/-	//	//
۴	پیونگ سٹریٹ پرانی وحدت کالونی حیدر آباد ویسٹ ونگ کی بحالی و مرمت	// ۴۰،۰۰۰/-	// ۸۰۰/-	۴ ماہ	//
۵	پرانی وحدت کالونی حیدر آباد ویسٹ ونگ کی واٹر سپلائی اور ڈرینج لائن کی بحالی و مرمت۔	// ۳۰،۰۰۰/-	// ۶۰۰/-	۳ ماہ	//
۶	پُرانی وحدت کالونی ایسٹ ونگ میں پیونگ سٹریٹ کی بحالی و مرمت	// ۴۰،۰۰۰/-	// ۸۰۰/-	۴ ماہ	//
۷	پُرانی وحدت کالونی حیدر آباد ایسٹ ونگ میں بیرونی واٹر سپلائی اور ڈرینج لائن کی بحالی و مرمت۔	// ۴۰،۰۰۰/-	// ۸۰۰/-	//	//
۸	دفتر ڈپٹی ڈائریکٹر فشریز ڈیپارٹمنٹ حیدر آباد کی بحالی و مرمت۔	// ۲۰،۰۰۰/-	// ۴۰۰/-	۲ ماہ	//
۹	مچھلیوں کے تالاب، جعفری کی بحالی و مرمت	// ۲۰،۰۰۰/-	// ۴۰۰/-	//	//
۱۰	مسجد کی مرمت، وحدت کالونی حیدر آباد	// ۲۰،۰۰۰/-	// ۴۰۰/-	//	//

(باقی ٹنڈر اگلے صفحے پر)

۱۱	بحالی ومرمت، روڈ ریسرچ لیبارٹری حیدرآباد (ایکسین ای این آفس ونگ)	۵۰,۰۰۰/- روپے	۱,۰۰۰/- روپے	۴ ماہ	۱۰۰ روپے
۱۲	بحالی ومرمت اے آر ایف کمپلیکس، اوڈیرو لال۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۱۳	بحالی ومرمت دفتر سب رجسٹرار، حیدرآباد۔	″ ۲۵,۰۰۰/-	″ ۵۰۰/-	۲ ماہ	″
۱۴	بحالی ومرمت دفتر ڈی سی، حیدرآباد۔	″ ۴۰,۰۰۰/-	″ ۸۰۰/-	۴ ماہ	″
۱۵	بحالی ومرمت سول جج فلیٹ (۱۰ نمبر) حیدرآباد۔	″ ۴۰,۰۰۰/-	″ ۸۰۰/-	″	″
۱۶	بحالی ومرمت آر۔ ایچ۔ بی، حیدرآباد۔	″ ۲۰,۰۰۰/-	″ ۴۰۰/-	۲ ماہ	″
۱۷	بحالی ومرمت دفتر ڈپٹی ڈائریکٹر، ہیلتھ سروسز، حیدرآباد۔	″ ۲۵,۰۰۰/-	″ ۵۰۰/-	″	″
۱۸	بحالی ومرمت دفتر ڈی ایچ او، حیدرآباد۔	″ ۲۵,۰۰۰/-	″ ۵۰۰/-	″	″
۱۹	بحالی ومرمت ڈسپنسری امتیاری۔	″ ۲۰,۰۰۰/-	″ ۴۰۰/-	″	″
۲۰	مرمت، بیرک نمبر ۳، ڈویژن۔۱۔ سرکل II، سنٹرل جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	۴ ماہ	″
۲۱	مرمت، بیرک نمبر ۸، ڈویژن۔۲، سرکل II، سنٹرل جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۲	مرمت، بیرک نمبر ۴، ڈویژن۔۵، سرکل I، سنٹرل جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۳	مرمت، بیرک نمبر ۳، ڈویژن۔۴، سرکل I سنٹرل جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۴	مرمت، بیرک نمبر ۷، ڈویژن۔۵، سرکل I سنٹرل جیل حیدرآباد	″ ۵۰,۰۰۰/-	۱,۰۰۰/-	″	″
۲۵	مرمت چاردیواری، سنٹرل جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۶	بحالی ومرمت ہاسپٹل بلاک، نارا جیل، حیدرآباد۔	″ ۴۰,۰۰۰/-	″ ۸۰۰/-	″	″
۲۷	بحالی ومرمت، آفس بلاک، نارا جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۸	مرمت کوارٹرز (دوسری قطار) نارا جیل، حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۲۹	بحالی ومرمت، آئی جی/ ایس پی کے بنگلہ جات، سنٹرل جیل حیدرآباد۔	″ ۵۰,۰۰۰/-	″ ۱,۰۰۰/-	″	″
۳۰	بحالی ومرمت، ایف اے ہاؤسز، تعلقہ ہالہ۔	″ ۴۰,۰۰۰/-	″ ۸۰۰/-	″	″
۳۱	ہائی کورٹ سرکٹ بنچ حیدرآباد کے لیے عمارت کی تعمیر۔	″ ۹,۸۰,۰۰۰/-	۱۹,۶۰۰/-	۱۲ ماہ	۵۰/- روپے
۳۲	ڈائریکٹوریٹ بلڈنگ برائے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن حیدرآباد کی تعمیر۔	″ ۱۸,۵۰,۰۰۰/-	″ ۳۷,۰۰۰/-	۱۵ ماہ	″ ۵۰/-

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

پراونشل بلڈنگز، ڈویژن نمبر ۱۷

کراچی در حیدرآباد۔

(آئی این ایف/ کے آر وائی/ ۵۱۲۶)

نوٹس طلبئ ٹنڈر

۱۔ منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جنہوں نے موجودہ مالی سال کے لیے اپنے ناموں کی تجدید کرالی ہو اور تجدیدی فیس محکمے میں جمع کرادی ہو، درج ذیل کاموں کے لیے سربمہر آئٹم ریٹ ٹنڈر مطلوب ہیں۔ ٹنڈر نیچے دی ہوئی تاریخ کو دن کے گیارہ بجے تک وصول کیے جائیں گے۔ اور اُسی تاریخ اور اُسی وقت پر ٹھیکیداروں یا اُن کے مجاز نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے جو موقع پر موجود ہوں گے۔

۲۔ تار یا ڈاک کے ذریعے بھیجے جانے والے ٹنڈر قبول نہیں کیے جائیں گے۔

۳۔ مشروط ٹنڈر یا کسی شیڈولڈ بنک کے ڈیپازٹ ایٹ کال یا چالان خزانہ کی شکل میں زرِ ضمانت کے بغیر آنے والے ٹنڈر قبول نہیں کیے جائیں گے۔

۴۔ کام کے تفصیلی کوائف زیرِ دستخطی کے دفتر میں کسی بھی یوم کار اور دفتری اوقات کے دوران میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

۵۔ زیرِ دستخطی کو حق حاصل ہو گا کہ وہ کوئی ایک یا تمام ٹنڈر وجہ بتائے بغیر مسترد کر دے۔

۶۔ ٹنڈر داخل کرنے کے خواہش مند ٹنڈر کاغذات، دفتری اوقات کے دوران میں ٹنڈر فیس ادا کر کے حاصل کر سکتے ہیں جو ناقابلِ واپسی ہو گی۔

۷۔ کسی فرم یا کمپنی کی طرف سے داخل کیے جانے والے ٹنڈر کے ساتھ مناسب عدالتی کاغذ پر مختار نامہ منسلک ہونا چاہیے۔

۸۔ ٹنڈروں کی وصولی کی تاریخ کو کوئی ٹنڈر جاری نہیں کیا جائے گا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

نمبر شمار	کام کی نوعیت	لاگت کا تخمینہ	زرِ ضمانت	کام کی حد	تاریخ وصولی ٹنڈر
۱	تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی میں جیٹھا سے نکرالی تک ۷۸،۶ میل لمبی سڑک کی تعمیر۔	روپے ۳۱,۰۰,۰۰۰/-	روپے ۶۲,۰۰۰/-	۱ سال	۳/۱۲/۱۹۸۶
۲	تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی میں جھانگل سے ڈر کالی تک ۱۳،۲ میل لمبی سڑک کی تعمیر۔	۱۲,۵۰,۰۰۰/-	۲۵,۰۰۰/-	۶ ماہ	〃
۳	کہوٹہ پنجار آزاد پتن روڈ پر پلی نمبر ۶۳/۵ کے قریب حفاظتی دیوار کے سیلابی شگافوں کی مرمّت۔	۱,۱۵,۰۰۰/-	۲,۳۰۰/-	۲۰ دن	〃
۴	کہوٹہ پنجار آزاد پتن روڈ پر پلی نمبر ۶۵/۶ کے قریب حفاظتی دیوار کے سیلابی شگافوں کی مرمّت۔	۱,۰۲,۰۰۰/-	۲,۰۴۰/-	۲۰ دن	〃
۵	کہوٹہ پنجار آزاد پتن روڈ پر پلی نمبر ۶۷/۶ کے قریب حفاظتی دیوارِ کے سیلابی شگافوں کی مرمّت۔	۵۵,۰۰۰/-	۱,۱۰۰/-	۱۵ دن	〃

دستخط

ایگزیکٹو انجینئر

ہائی وے ڈویژن راولپنڈی

آئی پی ایل ۹۱-۹۷

ٹنڈر نوٹس

درج ذیل کاموں کے لیے محکمہ آبپاشی و توانائی کے منظور شدہ ٹھیکیداران جنہوں نے رواں مالی سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے رجسٹریشن فیس/تجدید کی فیس جمع کروادی ہو سے معاہدہ کی اساس پر سربمہر ٹنڈرز مطلوب ہیں۔

۱۔ ٹنڈرز ۱۵ اردسمبر ۱۹۸۶ء کو بارہ بجے دوپہر تک میرے دفتر میں وصول کیے جائیں گے اور اسی تاریخ اور وقت کو موجود رہنے کے خواہش مند ٹھیکیداروں یا اُن کے نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ ٹنڈر فارمز ۲۴ ادسمبر ۸۶ء تک ڈیپازٹ ایٹ کال کی فراہمی پر مجوزہ فیس (ناقابلِ واپسی) کی ادائیگی پر زیر دستخطی کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ کام کے انچارج سب ڈویژنل آفیسر کی ہدایات کے تحت محکمانہ تصریحات کے عین مطابق کام مکمل کرنا ہوگا۔

۳۔ ٹنڈر کی حتمی منظوری مجاز حاکم کے تابع ہوگی جو سب سے کم نرخ کے ٹنڈر کو منظور کرنے یا اس کے متعلق کوئی وجہ بتانے کی پابند نہیں ہوگی۔

۴۔ نرخ کمپوزٹ شیڈول آف ریٹس (یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے نافذ العمل) سے زیادہ/کم پر پیش کیے جائیں۔ ٹھیکیداران اپنے نرخ پیش کریں جو شیڈول آف ریٹس میں شامل ہوں۔

۵۔ زرِ امانت تخمینہ لاگت کے ۲ فیصد کی شرح سے بشکل ڈیپازٹ ایٹ کال ٹنڈر کے ہمراہ منسلک کی جائے۔

۶۔ ٹنڈر بذریعہ ڈاک یا تار وصول نہیں کیے جائیں گے۔

۷۔ کاموں/ڈرائنگز کی تفصیل کسی بھی یومِ کار کو دفتری اوقات کے دوران زیر دستخطی کے دفتر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

(باقی اگلے صفحے پر)

۸ ۔ کام مجوزہ محکمانہ تصریحات کے عین مطابق مکمل کرنا ہوگا۔

۹ ۔ کمپنی یا لمیٹڈ فرم کی صورت میں مختار نامہ فراہم کرنا ہوگا۔

۱۰ ۔ ایٹم نمبر ۱ اور ۲ کے لیے ادائیگی نیس پاک اور یو ایس ایڈ کی طرف سے معائنہ اور کلیرنس کے بعد کی جائے گی۔

۱۱ ۔ زیرِ دستخطی بلا اظہارِ وجوہ کسی ٹنڈر کو مسترد کرنے کے مجاز ہیں۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرِ امانت	مُدت
۱	کھادر (KHADIR) برانچ آر ڈی ۱۱۴ ۔ ۲۰۲ کی بحالی۔	۱۹٫۵۰ لاکھ	۳۹۰۰۰/-	۴ ماہ
۲	پاک پتن ڈسٹی آر ڈی ۱۹۱۰۰ ۔ ٹیل کی بحالی۔	۱۹ ۔ ۸۷ لاکھ	۳۹۷۴۰/-	۴ ماہ
۳	سلیمانکی ہیڈ ورکس کے حفاظتی پشتے ایل ۔ ایم بی برجی آر ڈی ۵۰۰۰ تا ۱۵۰۰۰ کو مضبوط بنانا۔	۵ ۔ ۱۰ لاکھ	۱۰۲۰۰/-	۳ ماہ
۴	حفاظتی پشتے ایل ۔ ایم ۔ بی برجی آر ڈی ۱۱۵۰۰ تا ۱۶۵۰۰ کو مضبوط بنانا۔	۷ ۔ ۷۰ لاکھ	۱۵۴۰۰/-	۳ ماہ
۵	سلیمانکی ہیڈ ورکس کے حفاظتی پشتے ایل ۔ ایم ۔ بی برجی آر ڈی ۱۶۵۰۰ تا ۲۱۰۰۰ کو مضبوط بنانا۔	۵ ۔ ۲۰ لاکھ	۱۰۴۰۰/-	۳ ماہ
۶	سالانہ بندش ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران سلیمانکی (KHANKI) ہیڈ ورکس کے دروازوں کی خانگی مکسچر کے ساتھ پینٹنگ۔	۱ ۔ ۳۵ لاکھ	۲۷۰۰/-	بندش کے عرصے کے دوران۔

ایگزیکٹو انجینئر

سلیمانکی ڈویژن سلیمانکی

آئی پی ایل : ۹۷۲۹